

از کلام سید

مقالات  
سید

حصہ چہارم  
شش برقرانی قصص

مترجمہ

مولانا محمد اسماعیل پانی پتی

○

مجلس ترقی ادب ○ لاہور

# فہرس

حصہ چہارم

مستمل قرآنی قصص

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۔	قصہ آدم علیہ السلام	۱
۲۔	ذکر نوحؑ کے طوفان کا	۱۳
۳۔	حضرت ابراہیم علیہ السلام	۳۰
۴۔	حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کے فرشتے	۳۸
۵۔	حضرت ابراہیمؑ اور کعبہ کی تعمیر	۷۷
۶۔	حضرت ابراہیمؑ اور مشرکوں کے لیے دعائے مغفرت	۸۲
۷۔	حضرت یوسفؑ کا قصہ حقیقت کی روشنی میں	۸۵
۸۔	قوم عاد اور قوم ثمود کے حالات	۱۱۳
۹۔	قصہ طالوت و جالوت	۱۳۴
۱۰۔	موسیٰؑ، فرعون اور بنی اسرائیل	۱۵۳
۱۱۔	قصہ موسیٰ علیہ السلام کا	۲۲۶

- ۱۲- ہاروت و ماروت کی اصلیت - - - - - ۲۸۷
- ۱۳- حضرت نحمیاؑ کا قصہ - - - - - ۲۹۰
- ۱۴- حضرت عزیرؑ - - - - - ۲۹۸
- ۱۵- حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور وفات کا مسئلہ - - - ۳۱۰
- ۱۶- حضرت عیسیٰؑ کے معجزات - - - - - ۳۳۸
- ۱۷- غزوہ بدر کا واقعہ قرآن مجید میں - - - - - ۳۷۳
- ۱۸- غزوہ بدر اور نزول ملائکہ - - - - - ۴۰۷

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول ، فروری ، ۱۹۶۵ء

تعداد : ۲۰۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارہ امتیاز

ناظم مجلس ترقی ادب ، لاہور

مطبع : زرین آرٹ پریس ، لاہور

سہتمم : محمد ذوالفقار خاں

قیمت : چالیس روپے





## قصہ آدم علیہ السلام

قرآن مجید میں آدم کا قصہ آٹھ جگہ آیا ہے۔ سورہ بقرہ، سورہ آل عمران، سورہ اعراف، سورہ حجر، سورہ بنی اسرائیل، سورہ کہف، سورہ طہ، سورہ ص میں کسی جگہ کوئی مضمون بیان ہوا ہے، کسی جگہ کوئی۔ کسی جگہ اجمال ہے کسی جگہ تفصیل۔ کسی جگہ ایک مضمون کو کسی لفظ سے ظاہر کیا ہے، دوسری جگہ کسی لفظ سے۔ مگر سب کا نتیجہ یا مقصد متحد ہے۔ ہم حاشیہ پر ان آٹھوں جگہ کی آیتوں کو اس طرح جمع کرتے ہیں جس میں تمام مضمون اور الفاظ ایک جگہ سلسلہ وار جمع ہو جاویں اور اس کے مقابل میں ان کا ترجمہ بھی اسی سلسلے سے لکھتے ہیں تاکہ کل قصہ انہی الفاظ میں جو قرآن میں آتے ہیں ایک جگہ ہو جاوے اور پھر اپنی سمجھ کے موافق جو ہم نے قرآن کا مطلب سمجھا ہے اسی قصہ کو بیان کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے بخوبی دونوں بیانون کا مقابلہ کر سکیں۔

واذ قال ربك لا ملئكة	”اور جب تیرے پروردگار
انی جاءك في الارض خلیفہ	نے فرشتوں سے کہا کہ میں آن
قالوا اتجعل فیہا من	میں ایک خلیفہ پیدا کرنے والا
یفسد فیہا ویسفک الدماء	ہوں۔ بولے کیا تو اس میں
ونحن نسبح بحمدک ونقدس	ایسے کو خلیفہ کرے گا جو
لک قال انی اعلم ما لا تعلمون	اس میں فساد کرے اور خون
(سورہ بقرہ) انی خالق بشری	بھاوے اور ہم تو تیری تعریف
من طین (ص) من تراب	جیتے ہیں اور تجھ پاک کو یاد

کرتے ہیں۔ کہا میں جانتا ہوں وہ جو کچھ تم نہیں جانتے، میں پیدا کرنے والا ہوں ایک آدمی گارے، مٹی، ریتلے گارے بدبودار کیچڑ سے، اللہ نے آدم کو سب نام سکھا دیے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ مجھ کو ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ بولے تو ہی برگزیدہ ہے تو نے جو کچھ ہم کو سکھایا ہے اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے بے شک تو ہی جاننے والا حکمت والا ہے۔ کہا اے آدم ان کے نام ان کو بتا دے۔ پھر جب آدم نے ان کے نام ان کو بتا دیے خدا نے کہا کہ میں تم کو نہ کہتا تھا کہ میں آسمانوں کی اور زمین کی چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو اس کو بھی جانتا ہوں بے شک ہم نے تم کو پیدا کیا اور تمہاری صورت بنائی پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو

﴿آل عمران﴾ صلصال من حمأسنون (الحجر) و علم آدم الاسماء ثم عرضهم علی الملائكة فقال انبئونی بیا سماء هؤلاء ان کنتم صدقین۔ قالوا سبحنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک العلیم الحکیم۔ قال یادم انبئهم باسمائهم فلما انبأهم باسمائهم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السموات والارض و اعلم ما تبءون وما کنتم تکتُمون (بقر) ولقد خلقنا کم ثم صورنا کم ثم قلنا للملائكة اسجدوا لادم (سورۃ اعراف) فاذا سویته و نفخت فیہ من روحی فقعوا لہ السجودین (الحجر) فسجد الملائكة کلہم اجمعون (الحجر) الا ابلیس لم یکن من السجودین (الاعراف) کان من الجن ففسق عن امریہ (الکہف) ابی ان یکون من السجودین۔ (الحجر) واستکبروا کان من الکافرین (بقر)

سجدہ کرو جب میں اُس کو  
 ٹھیک کر چکوں اور اس میں  
 اپنی روح بھونک دوں تو تم  
 اس کو سجدہ کرتے ہوئے  
 جھک پڑو۔ پھر سب فرشتوں  
 نے سجدہ کیا مگر شیطان نے  
 نہیں کیا وہ سجدہ کرنے والوں  
 میں نہ تھا وہ جن میں سے تھا پس  
 نافرمانی کی اُس نے اپنے پروردگار  
 کی، سجدہ کرنے والوں کے ساتھ  
 ہونے سے انکار کیا اور تکبر کیا  
 اور وہ کافروں میں سے تھا۔  
 خدا نے کہا اے ابلیس کیوں  
 تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ  
 نہ ہوا۔ کس چیز نے تجھ کو  
 منع کیا کہ نہ سجدہ کرے اس  
 کو جسے میں نے اپنے ہاتھ سے  
 بنایا، تکبر کیا تو نے یا تو  
 بروں میں ہے، کس بات نے  
 تجھ کو روکا کہ میرے حکم  
 کرنے پر بھی تو سجدہ نہ  
 کرے۔ ابلیس نے کہا کہ کیا  
 میں ایسے کو سجدہ کروں جسے  
 تو نے گارے سے پیدا کیا ہے  
 میں ایسا نہیں ہوں کہ اس

قال يا ابليس مالک الا  
 تکون مع الساجدين (الحجر)  
 ما منعک ان تسجد اما  
 خلقت بیدی استکبرت ام  
 کنت من العالین (ص)  
 ما منعک الا تسجد اذ امرتک  
 (اعراف) قال اسجد لمن خلقت  
 طیناً (ابی اسرائیل) لم اکن  
 لاسجد لبشر خلقتہ من  
 صلصال من حمأ مسنون  
 (الحجر) انا خیر منه  
 خلقتنی من نار و خلقتہ  
 من طین (اعراف) قال  
 فاهبط منها فَمَا یَکُونُ  
 لَکَ ان تَتَّکَبِرَ فِیْهَا فَاخْرَجْ  
 مِنْهَا مَذْؤُماً سَدْحُوراً (اعراف)  
 فَاَنکَ رَجِیمٌ وَاِنْ عَلِیکَ  
 اللَّعْنَةُ الَّتِیْ یَوْمَ الْبَدِیْنِ  
 (الحجر) انک من الصّٰغِرِیْنِ  
 قال انظرنی الیّ یوم  
 یبعثون قال انک من  
 المنظرین (اعراف) الّٰہِ  
 یوم الوقت المعلوم۔ قال  
 رب بما اغویتنی لا زینن  
 لہم فی الارض (الحجر)

آدمی کو سجدہ کروں جسے  
تو نے مڑی مٹی سے بنایا ہے  
میں اس سے بہتر ہوں مجھ کو  
تو نے آگ سے پیدا کیا ہے  
اور اس کو تو نے ریتلے گارے  
اور بد بو دار کیچڑ سے پیدا کیا  
ہے۔ خدا نے کہا: دور ہو یہاں  
سے تجھ کو نہیں چاہیے تھا کہ  
یہاں تکبر کرتا۔ یہاں سے  
ذلیل و خوار ہو کر نکل بیشک  
تو مردود ہے اور بے شک  
تو مردود ہے اور بے شک تجھ  
پر قیامت تک لعنت رہے گی  
بے شک تو ذیلیوں میں ہے۔  
ابلیس نے کہا کہ قیامت تک  
مواخذ نہ ہونے کی مجھے مہلت  
دے۔ خدا نے کہا تجھ کو  
مہلت دی گئی وقت معین تک۔  
ابلیس نے کہا کہ اے پروردگار  
مجھ کو تیرے بھکانے ہی کی  
قسم کہ میں دنیا میں بری باتوں  
کو انہیں اچھی کر دکھاؤں گا  
اور قسم ہے تیری عزت کی آن  
سب کو بھکاؤں گا اور ان کے لیے  
تیرے سیدھے رستہ کی راہ ماری

فبعزتک لا غوینہم  
اجمعین (ص) لا قعدن لہم  
صراطک المستقیم ثم لا  
تیمنہم من بین ایدہم و  
من خلفہم وعن ایمانہم و  
عن شمالہم و لا تجد  
اکثرہم شاکرین (اعراف)  
قال اریتک ہذا الذی کرمت  
علی لئن اخرتن الی یوم  
القیامۃ لا حمتک ذریۃ الا  
قلیل (بنی اسرائیل) الا عبادک  
منہم المخلصین قال  
ہذا صراط علی مستقیم  
(الحجر) قال فالحق والحق  
اقول (ص) لمن تبعک  
منہم لا ملئن جہنم  
(اعراف) منک و ممن تبعک  
منہم اجمعین (ص)  
اذہب فممن تبعک منہم  
فان جہنم جزاؤکم جزاء  
موفورا و استفزز من استطعت  
منہم بصوتک واجلب  
علیہم بخیلک ورجلک  
و شارکھم فی الاموال  
والاولاد وعدہم وما یعدہم

کرنے کو گہات میں بیٹھوں گا۔  
 پھر اُن کے آگے سے اور اُن کے  
 پیچھے سے اور اُن کے دائیں سے  
 اور اُن کے بائیں سے اُن پر اُن  
 پڑوں گا اور تو اُن میں سے  
 بہتوں کو شکر کرنے والا نہ  
 پاوے گا۔ ابلیس نے کہا کہ  
 مجھ کو بتا کہ کیوں اس شخص  
 کو مجھ پر بزرگی دی ہے۔ اگر  
 تو نے مجھے قیامت تک کی  
 مہلت دی تو اس شخص کی اولاد  
 کو بجز چند کے جڑ پیڑ سے  
 اکھاڑ دوں گا بجز تیرے خاص  
 بندوں کے جو اُن میں ہوں۔  
 خدا نے کہا کہ خالص بندہ  
 ہونا ہی میرے تک پہنچنے کا  
 سیدھا رستہ ہے خدا نے کہا  
 کہ سچ بات یہ ہے اور سچ کہتا  
 ہوں جو لوگ اُن میں سے تیری  
 پیروی کریں گے بے شک بھر  
 دوں گا جہنم کو تجھ سے اور  
 اُن سب سے جنہوں نے اُن میں  
 سے تیری پیروی کی۔ جا بھر جو  
 کوئی اُن میں سے تیری پیروی  
 کرے گا تو بے شک جہنم

الشیطان الاغرورا (بنی اسرائیل)  
 ان عبادی لیس لک علیہم  
 سلطان الا من البعک من  
 الفاوین (الحجر) و کفی  
 بریک وکیلا (بنی اسرائیل)  
 و قلنا (بقر) یا آدم اسکن  
 انت و زوجک الجنة فکلا  
 (اعراف) منها رغداً (بقر)  
 حیث شئتما ولا تقربا هذه  
 الشجرة فتکونا من الظالمین  
 (اعراف) فقلنا یا آدم ان هذه  
 عدولک و لزوجک فلا  
 یخرجنکما من الجنة  
 فتشقی ان لک لا تجوع  
 فیها ولا تعری و انک  
 لا تظماء فیها لا تضحی  
 (طہ)۔ فوسوس لهما الشیطن  
 لیبدی لهما ماؤوری عنهما  
 من سواتهما (اعراف) قال  
 یا آدم هل ادلک علی شجرة  
 الخلد و ملک لا یبلی  
 (طہ) و قال ما نهما کما  
 ربکما عن هذه الشجرة  
 الا ان تکون ملکین او  
 تکونا من الخالدين و

تمہاری سزا ہوگی پوری سزا۔  
 بہکا اُن میں سے جس کو بہکا سکے  
 اپنی آواز سے اور چڑھ جا اُن پر  
 اپنے سوار و پیدل لے کر اور  
 حصہ بانٹ لے اُن کے مال میں اور  
 اولاد میں اور اُن سے وعدہ کر لے  
 اور کوئی وعدہ اُن سے شیطان  
 نہیں کرنے کا بجز دھوکے کے  
 بے شک میرے بندوں پر تجھ  
 کو غلبہ نہیں ہے بجز اُن گمراہوں  
 کے جنہوں نے تیری پیروی کی،  
 اے پیغمبر تیرا خدا اُن کی  
 کارسازی کے لیے کافی ہے۔ خدا  
 نے کہا اے آدم تو اور تیرا  
 جوڑا جنت میں رہ اور کھاؤ اس  
 میں سے پیٹ بھر کر جہاں سے  
 تم چاہو اور اس درخت کے پاس  
 مت جاؤ۔ اگر جاؤ گے تو  
 ظالموں میں سے ہو گے۔ خدا  
 نے کہا اے آدم یہ ابلیس  
 بے شک تیرا اور تیرے جوڑے کا  
 دشمن ہے یہ تم کو جنت سے نہ  
 نکال دے کہ تم بد بخت ہو جاؤ  
 یہاں تو تم نہ بھوکے دو گے نہ  
 ننگے نہ یہاں پیاسے دو گے اور

قاسمہما انی لکما لمن  
 الناصحين فذلہما بغرور  
 فلما ذاقا الشجرة بدت لہما  
 سواتہما وطفقا یخصفان  
 علیہما من ورق الجنة  
 (اعراف) و ناداہما ربہما  
 الم انہلکما عن تلکما  
 الشجرة و اقل لکما ان  
 الشیطن لکما عدو مبین  
 (اعراف) فازلہما الشیطن  
 عنہا فاخرجہما مما کنا  
 فیہ و قلنا اہبطوا  
 بعضکم لبعض عدوؤکم  
 فی الارض مستقرو متاع الی  
 حین (بقرہ) قال فیہا  
 تحییون وفیہا تموتون و  
 منہا تخرجون (اعراف)  
 و عصی ادم ربہ، فغوی (طہ)  
 فتملقی ادم من ربہ بکلمات  
 فتاب علیہ انہ ہو  
 التواب الرحیم (بقرہ) قال  
 ربنا ظلمنا انفسنا وان لم  
 تغفر رانا و ترحمنا لنکونن  
 من الخسرین (اعراف) ثم  
 اجتباہ ربہ فتاب علیہ و

ہدی (طہ) قلنا اہبطوا      نہ دھوپ میں جلو گے۔ پھر  
 منها جمیعاً فاما یا      وسوسے میں ڈال دیا آن کو  
 تینکم منی ہدی فمن تبع      شیطان نے تاکہ جو پوشیدہ  
 ہدای فلا خوف علیہم      برائیاں ان میں تھیں ان کو ظاہر  
 ولا ہم یحزنون (بقر) فلا      کر دے۔ شیطان نے کہا اے  
 یضل ولا یشتقی۔ (طہ)      آدم کیا بتلاؤں میں تجھ کو  
 ہمیشہ رہنے کا درخت اور پرانی نہ ہونے والی سلطنت اور کہا کہ  
 خدا نے تم کو بجز اس کے اور کس لیے اس درخت سے منع نہیں  
 کیا کہ تم فرشتے ہو جاؤ گے یا ہمیشہ رہو گے اور ان سے قسم  
 کھا کر کہا کہ بے شک تمہارا میں خیر خواہ ہوں پھر ان کو  
 دھوکے میں ڈال دیا پھر جب انہوں نے اس درخت کو چکھا تو  
 ان دونوں کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں اور انہوں نے بہشت کے  
 درخت کے پتوں سے ان کو چھپانا شروع کیا خدا نے ان دونوں کو  
 للکارا کہ میں نے تم کو اس درخت کے کھانے سے منع نہیں کیا تھا  
 اور تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا علانیہ دشمن ہے پس  
 ان کو شیطان نے اس سے ڈگمگایا اور جس میں تھے اس میں سے  
 نکال دیا۔ خدا نے کہا دور ہو تم آپس میں ایک دوسرے کے  
 دشمن ہو اور تمہارے لیے ایک مدت تک زمین پر رہنا اور اس سے  
 منفعت اٹھانی ہے اس میں تم جیو گے، اس میں مرو گے، اس میں سے  
 اٹھو گے۔ نافرمانی کی آدم نے اپنے پروردگار کی اور بہک گیا۔ پھر  
 آدم کے دل میں ڈالیں اس کے پروردگار نے چند باتیں پھر اس کو  
 خدا نے معاف کیا وہ بے شک بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے۔  
 آدم اور اس کی جورو نے کہا کہ اے پروردگار ہمارے ہم نے اپنی  
 جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو نہ بخشے گا اور نہ مہربانی  
 کرے گا تو بے شک ہم نقصان والوں میں ہوں گے۔ پھر اس کے

پروردگار نے اس کو پسند کیا اور اس کو معاف کیا اور سیدھی راہ بتائی۔ خدا نے کہا کہ تم سب یہاں سے دور ہو پھر میرے پاس سے تمہارے پاس ہدایت پہنچے گی۔ پھر جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو اس پر کچھ خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوگا اور نہ وہ بہکے گا اور نہ بد بخت ہوگا۔“

اس قصہ میں چار فریق بیان ہوئے ہیں۔ ایک خدا، دوسرے فرشتے (یعنی قوائے ملکوتی) تیسرے ابلیس یا شیطان۔ (یعنی قوائے بہیمی) چوتھے آدم (یعنی انسان جو مجموعہ ان قوائی کا ہے اور جس میں عورت و مرد دونوں شامل ہیں)۔ مقصود قصہ کا انسانی فطرت کی زبان حال سے انسان کی فطرت کا بیان کرنا ہے۔ خدا جو سب کا پیدا کرنے والا ہے گویا قوائے ملکوتی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ میں ایک مخلوق یعنی انسان کثیف مادہ سے پیدا کرنے کو ہوں مگر وہی میرا نائب ہونے کے لائق ہے۔ جب میں اس کو پیدا کر چکوں تو تم سب اس کو سجدہ کرنا۔ اس مقام پر مخاطبین کو اس بات کا کہ اس مخلوق میں قوائے بہیمہ ہوں گے عالم قرار دیا گیا ہے اور بمقتضائے فطرت ان قوائی کے انہوں نے کہا کہ کیا تو ایسے کو خلیفہ کرے گا جو زمین پر فساد مچاوے اور خون بہاوے اور قوائے ملکوتی نے اپنی فطرت اس طرح بیان کی۔ کہ ہم تو تیری ہی تعریف کرتے ہیں اور تجھ پاک کو یاد کرتے ہیں۔

پچھلا فقرہ قوائے کی فطرت کو بھی بتاتا ہے۔ جو قویٰ جس کام کے لیے ہیں وہی کام کرتے رہتے ہیں، کہ وہی ان کی تسبیح اور تقدیس ہے۔ قوت نامیہ، انما اور قوت ناطقہ، نطق، قوت احراق، حرق، قوت سیالہ، سیلان، قوت جامدہ، انجہاد کے



سوا اور کچھ نہیں کر سکتی - انسان باوجودیکہ قوائے متضاد ، ملکوتیہ و بہیمیہ سے مرکب ہے مگر اس میں ایسی قدرت ہے کہ ایک قوت پر دوسری قوت کو غلبہ دے سکتا ہے اور جس قوت سے چاہے کام لے سکتا ہے - غیر معلوم چیزوں کو جان جاتا ہے ، عالم کے اجزاء میں ترکیب دے کر ایک نئی چیز ایجاد کر لیتا ہے - اور عالم کے تبدیل میں ایک بڑی مداخلت رکھتا ہے اور ٹھیک خدا کا نائب کہلانے کا مستحق ہے -

انسان کی فطرت کا مخاطبین پر فطری تفوق ظاہر کرنے کو ، تمام کمالات نفسانی و روحانی حقائق و معارف کو انسان کی فطرت میں ودیعت کر کے جس کو تعلیم اسماء سے تعبیر کیا ہے انسان کو مخاطبین کے سامنے کیا ، کہ جو حقائق و معارف اس میں ہیں اس کو بتلاؤ قوائے سبیطہ کی فطرت میں اس کا علم نہ تھا - پس گویا وہ بولے کہ ہم تو ان کمالات کو نہیں جانتے - ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے بتایا ہے یعنی جس محدود فطرت پر پیدا کیا ہے اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے - مگر انسان کی زبان حال نے جس کی فطرت میں ادراک ، کلیات و جزئیات تھا مخاطبین کی حقیقت کو بتا دیا اور گویا مخاطبین نے زک پائی - اب خدا اپنی قدرت و کمال کے اظہار کے لیے انسانی محاورہ کے موافق جیسے کہ انسان کسی کو زک دے کر دھراتا ہے فرماتا ہے کہ کیوں میں نہ کہتا تھا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے -

اس کے بعد خدا تعالیٰ نے ان قوائے متضاد کی جن سے انسان مرکب ہے اس طرح پر فطرت بتائی ہے کہ قوائے ملکوتی اطاعت پذیر و فرماں بردار ہونے کی قابلیت رکھتے ہیں الا قوائے بہیمیہ نہایت سرکش اور نافرمان بردار ہیں - انہی کو قابو میں لانا اور فرماں بردار کرنا انسان کا انسان ہونا ہے -

اس کے سرکش ہونے کو کبھی تو ان لفظوں سے بیان کیا ہے کہ ابلیس نے سجدہ نہیں کیا - کہیں یوں فرمایا ہے کہ اس نے اپنے خدا کے حکم کی نافرمانی کی اور سجدہ کرنے سے انکار کیا - کہیں فرمایا ہے کہ اس کافر نے غرور کیا اور کہا کہ کیا میں ایسی مخلوق کو سجدہ کروں جو مٹی سے بنی ہے - میں تو اس سے افضل ہوں وہ تو مٹی کا پتلا ہے اور میں آگ کا پوت ہوں - قوائے بہیمہ کو جن کا مبداء حرارت غریزی و حرارت خارجی ہے - آگ سے مخلوق ہونا بیان کرنا ٹھیک ٹھیک اُن کی فطرت کا بتلانا ہے - پھر جو فطرتی تضاد ان دونوں قسم کے قوئ میں ہے اس کے اظہار کے لیے قواۓ بہیمہ کو بطور ایک سخت دشمن کے قرار دیا ہے اور اس کی زبان حال سے اس کی فطرت بیان کی ہے کہ میں ہمیشہ جب تک انسان زندہ ہے یا قیامت تک یعنی جب تک اس کی اولاد رہے گی اُس کو بھکتا اور راہ راست پر سے بھٹکاتا رہوں گا - یہ الفاظ کہ میں انسان کو دائیں بائیں آگے پیچھے غرض کہ ہر چہار طرف سے گھیروں گا - صاف صاف اُن قوائے بہیمہ کی فطرت کا اظہار کرتے ہیں جو انسان میں ہے اور ہر ذی عقل و ہوش غور کرنے پر خود اپنے میں یہ سب باتیں پاتا ہے اور جان سکتا ہے کہ کس طرح ان قوائے بہیمہ نے چاروں طرف سے ان کو گھیر رکھا ہے

درمیان قمر دریا تختہ بندم کردہ

بازمیگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

پھر خدا تعالیٰ نے نیک آدمیوں کی فطرت کو اور اس دشمن کے فریب میں آنے والوں اور نہ آنے والوں کے فطری نتیجہ کو بتایا ہے اور فرماتا ہے کہ تو جتنی چاہے دشمنی کر اور جس طرح چاہے اپنے لشکر سے اُن پر چڑھائی کر - مگر نیک آدمیوں پر تیرا

کچھ قابو نہ ہوگا۔ وہی بہکیں گے جو تیرے یعنی قوائے بہیمہ کے تابع ہونے والے ہیں اور دونوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ پہلے بہشت میں چین کریں گے اور پچھلے دوزخ میں بھرے جاویں گے۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ نے انسان کی زندگی کے دونوں حصوں کو بتایا ہے۔ پہلے حصہ کو یعنی جب کہ انسان غیر مکلف اور تمام قیود سے مبرا ہوتا ہے۔ بہشت میں رہنے اور چین کرنے اور میوؤں کے کھاتے رہنے سے تعبیر کیا ہے اور جب دوسرا حصہ اس کی زندگی کا شروع ہونے والا ہے تو اس کے قدیم دشمن کو پھر بلایا ہے۔ جس نے اس کو بہکا کر درخت ممنوعہ کو کھلایا ہے۔ یہ وہ حصہ انسان کی زندگی کا ہے جب کہ اس کو رشد ہوتا ہے اور عقل و تمیز کے درخت کا پھل کھا کر مکلف اور اپنے تمام افعال و اقوال و حرکات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ زندگی کے ضروری سامان کے لیے خود محنت کرتا ہے اور نیک و بد کو خوب سمجھتا ہے۔ اپنی بدی سے واقف ہوتا ہے اور اس کو چھپاتا ہے۔ یہ فطرت انسانی خدا تعالیٰ نے باغ کے استعارہ میں بیان کی ہے اس لیے تمام فطرت کو باغ ہی کے استعارہ میں بیان فرمایا ہے سن رشد و تمیز کے پہنچنے کو درخت۔ معرفت خیر و شر کے پھل کھانے سے اور انسان کا اپنی بدیوں کے چھپانے کو درخت کے پتوں سے ڈھانکنے سے تعبیر کیا ہے۔ مگر شجرۃ الاخلا کے پھل تک اس کو نہیں پہنچایا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک فانی وجود ہے اور اس کو دائمی بقا نہیں۔

اخیر کو نہایت عمدگی سے اس کا خاتمہ بیان کیا ہے کہ تم سب نکل جاؤ اور جا کر زمین پر رہو وہی تمہارے ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ اس میں تم مرو گے، اس میں سے اٹھو گے۔ تمہاری بدیوں کا

علاج بھی وہیں ہے۔ جو نیک بندے ہوں ان کی ہدایت پر چلنا اور اپنی بدیوں سے شرمندہ ہو کر ان کے کرنے سے باز آنا اور خدا سے پکا اقرار کرنا کہ پھر نہ کریں گے اور پھر مت کرنا، تم اپنے دشمن پر فتح پاؤ گے۔ پھر تم کو کچھ ڈر اور خوف نہ ہوگا۔ اچھے خاصے مقبول بندے ہو گے۔

یہ ایک نہایت عمدہ اور دل چسپ بیان فطرت انسانی کا ہے مگر عام لوگ اس راز فطرت کے سمجھنے کے قابل نہ تھے اس لیے خدا نے ابتداء سے اس راز کو ایک دل چسپ قصہ کے پیرایہ میں بیان کیا ہے جس کو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اور جو نتیجہ راز فطرت سے انسان کو حاصل ہونا چاہیے وہ ہر شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ خواہ تم یہ سمجھو کہ خدا و فرشتوں میں مباحثہ ہوا اور شیطان نے خدا سے نافرمانی کی اور آدم بھی گیہوں کا درخت کھا کر خدا کا نافرمان بردار ہوا۔ خواہ میں یوں سمجھوں کہ اس بڑے تماشا کرنے والے نے جو بھانمتی کا ایک تماشا بنایا ہے اس کے راز کو اسی بھانمت کی اصطلاحوں میں بتایا ہے۔

—————

## ذکر نوحؑ کے طوفان کا

قبل اس کے کہ طوفان کی نسبت ذکر کیا جاوے یہ امر بتانا ضرور ہے کہ حضرت نوح اور ان کی قوم کہاں رہتی تھی - اس بات کے دریافت کرنے کے لیے مجز توریت کے اور قدیم جغرافیہ کی تحقیقات کے اور کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے آن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم یا یوں کہو کہ حضرت نوح کے اجداد اس قطعہ زمین میں رہتے تھے جہاں چار دریا پیشوں، جیحون مدقل اور فرات بہتے تھے - ان دریاؤں کے ناموں اور مخرجوں پر اس مقام پر بحث کی چنداں ضرورت نہیں ہے - صرف یہ بیان کرنا کافی ہے کہ جو ٹکڑا زمین کا بلیک سی - یعنی بحر اسود اور بحر کاسپین اور پرشین گلف (خلیج فارس) اور میڈی ٹیرینین سی - یعنی بحیرہ روم میں واقع ہے اور آرمینیا کہلاتا ہے یہی قطعہ زمین کا حضرت نوح کے اجداد کا مسکن تھا -

کوئی ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ نوح نے یا اجداد نوح نے اس ملک کو چھوڑ کر دوسری جگہ سکونت اختیار کی ہو اور اس لیے اس بات کے باور کرنے کو کوئی امر مانع نہیں ہے کہ حضرت نوح کا بھی یہ ملک مسکن تھا -

اس قطعہ زمین میں وہ ملک بھی واقع ہے جو ارارات کے نام سے مشہور تھا اور اسی ملک کے پہاڑ ارارات کے پہاڑ مشہور ہیں جن کو کالڈی زبان میں فرود اور عربی میں جودی کہتے ہیں - یہ ملک دریاؤں سے اور دریاؤں کی بہت سی شاخوں سے اور

چھوٹی منڈیوں سے ایسا بُر تھا کہ انسان کو اس بات کا خیال آنا قرین قیاس ہے کہ اُن کے عبور کرنے اور اُن کی طغیانی کی حالت میں بچاؤ کی کوئی تدبیر ہونی چاہیے۔ خدا تعالیٰ نے حضرت نوح کے دل میں وحی ڈالی کہ وہ ان مصیبتوں سے محفوظ رہنے کے لیے کشتی بنائیں۔ کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہ کشتی سب سے پہلی کشتی ہوگی جو دنیا میں بنی۔ اس وقت ایسی چیز جس سے پانی پر چلیں کچھ عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن اول اول جب اس کے بنانے کا خیال حضرت نوح کو ہوا ہوگا اور اس کے ذریعہ سے پانی پر چلنے اور دریاؤں کے وار پار جانے اور چلے آنے کا ارادہ معلوم ہوا ہوگا تو لوگوں نے اس کو اس قدر عجیب اور ناممکن سمجھا ہوگا کہ اُن سے مسخرا بن کرتے ہوں گے ان کو دیوانہ سمجھتے ہوں گے جیسے کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔

حضرت نوح لوگوں کو بت پرستی چھوڑنے اور خدائے واحد کی پرستش کرنے کی ہدایت کرتے تھے اور لوگ نہیں مانتے تھے حضرت نوح اُن پر خدا کا عذاب نازل ہونے کی پیشین گوئی کرتے تھے۔ تمام قوموں پر جو عذاب نازل ہوئے ہیں وہ عذاب اُنہی اسباب سے واقع ہوئے ہیں جن کا واقع ہونا امور طبعی سے متعلق ہے پس ملکی حالات کے خیال سے ضرور حضرت نوح کے دل میں خدا نے ڈالا ہوگا کہ اُن لوگوں کی نافرمانی، بدکاری و گنہ گاری سے ایک دن خدا اُن کو ڈبو دے گا۔

لوگوں نے حضرت نوح سے کہا کہ اے نوح تم ہم سے بہت کچھ جھگڑ چکے ہو پھر اگر تم سچے ہو تو اب اس کو لاؤ جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے ہو یعنی عذاب کا۔ حضرت نوح نے کہا کہ اگر خدا چاہے گا تو عذاب لاوے گا تم اس کو مجبور کرنے والے نہیں ہو۔

کشتی کا بنانا اور خصوصاً پہلے پہل اور بالتخصیص اتنی بڑی کا، جتنی کہ نوح کی کشتی تھی اور ایسی مضبوط کا، جو طوفان کی موجوں کو سہار سکے، کچھ آسان کام نہ تھا اور خدا ہی کی القائے وحی سے وہ بن سکتی تھی مگر لوگوں کی امداد اور سعی کی بھی ضرورت تھی جو لوگ حضرت نوح پر ایمان نہیں لائے تھے بلکہ ان کے اس کام پر تمسخر کرتے تھے یقیناً وہ لوگ آس میں شریک نہ تھے انہی کی نسبت خدا نے فرمایا کہ تو ہماری ہدایت سے کشتی بنائے جا ظالموں کا ہم سے ذکر مت کرو وہ سب ڈوبنے والے ہیں۔

غرض کہ حضرت نوح نے ان لوگوں کی امداد سے جو ان کو مانتے تھے اور ان پر ایمان لائے تھے وہ کشتی تیار کر لی۔ طوفان کا آنا بذریعہ ان اسباب کے جو طوفان آنے سے متعلق ہیں، خدا نے مقدر کیا تھا۔ چنانچہ بے انتہا مینہ کے برسنے اور زمین سے پانی کے چشمے کھل جانے اور دریاؤں و ندیوں کے ابل پڑنے سے آس ملک میں طوفان آیا۔ حضرت نوح اور ان کے ساتھی کشتی پر بیٹھ کر بچ گئے اور تمام ملک کے لوگ جس میں طوفان آیا تھا ڈوب کر مر گئے اس قسم کے طبعی واقعوں کو خدا تعالیٰ ہمیشہ بندوں کے گناہوں اور ان کی نافرمانی سے منسوب کرتا ہے جس کی نسبت ہم پہلے بحث کر چکے ہیں۔ حضرت نوح کے زمانہ کا بہت بڑا طوفان ہوگا مگر اس زمانہ میں بھی جن ملکوں میں طوفان آتا ہے وہاں بھی اسی طرح ڈوب کر مر جاتے ہیں۔ البتہ نوح کے طوفان میں چند امور ایسے ہیں جن پر بالتخصیص بحث کرنی ضرور ہے۔

اول یہ کہ طوفان خاص آس ملک میں آیا تھا جہاں حضرت نوح کی قوم رہتی تھی یا تمام دنیا میں طوفان آیا تھا اور کل کرہ زمین کا پانی کے اندر ڈوب گیا تھا اور تمام دنیا میں کوئی انسان و

چرند و پرند بجز اُن کے جو کشتی میں تھے زندہ باقی نہیں رہے تھے۔ یہودی اور عیسائی اس بات کے قائل ہیں کہ طوفان تمام دنیا میں عام تھا۔ ہمارے علمائے مفسرین کی عادت ہے کہ بغیر اس بات کے کہ قرآن مجید کے الفاظ پر غور کریں ایسے امور میں یہودیوں کی روایتوں کی تقلید کرتے ہیں اور اس لیے وہ بھی اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ طوفان تمام دنیا میں عام تھا۔ مگر طوفان کا عام ہونا محض غلط ہے اور قرآن مجید سے اُس کا تمام دنیا میں عام ہونا ہرگز ثابت نہیں ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ پہاڑوں پر دریائی جانوروں کی ہڈیاں ملنے سے اور سرد ملکوں میں گرم ملکوں کے جانوروں کی ہڈیاں زمین میں دب ہوئی نکلتے سے طوفان کے عام ہونے کا اور تمام دنیا کے پہاڑوں کا طوفان نوح میں ڈوب جانے کا یقین ہوتا تھا مگر علم جیالوجی (طبقات الارض) کی ترقی سے ثابت ہو گیا کہ وہ خیال غلط تھا۔ اس کو مفصل طور پر میں نے اپنی کتاب ”تبیین الکلام فی تفسیر السورۃ علیٰ سلسلۃ الاسلام“ میں بیان کیا ہے اس مقام پر اُس کی بحث کچھ ضروری نہیں ہے اس وقت ہم صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید سے طوفان کا تمام دنیا میں عام ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

گو ہم بالتخصیص یہ نہ بتا سکیں کہ آدم یا انسان کے پیدا ہونے کی کس قدر مدت کے بعد طوفان آیا تھا مگر توریت کے مطابق جو قلیل زمانہ تسلیم کیا گیا ہے ہم اُسی کو تسلیم کر کے کہتے ہیں کہ بموجب حساب توریت عبری کے طوفان آیا۔ (۱۶۵۰) برس بعد پیدا ہونے حضرت آدم کے اور بموجب پٹھورینجٹ توریت کے جس پر ایشیا کے تمام مؤرخ اور یورپ کے اکثر قدیم مؤرخ اعتقاد رکھتے ہیں طوفان آیا۔ (۲۲۶۲) برس بعد پیدا ہونے حضرت آدم



کے اور بلاشبہ اس عرصہ میں انسان کی نسل پھیل گئی ہوگی اور کل پرانی دنیا یا اس کا بہت بڑا حصہ آباد ہو گیا ہوگا۔ یہ بات ناممکن ہے اور قرآن مجید کے بھی برخلاف ہے کہ حضرت نوح تمام دنیا کے لوگوں کو وعظ سنانے اور ہدایت کرنے کو بھیجے گئے ہوں اور اسکان سے باہر ہے کہ تمام دنیا میں جو اس وقت تک آباد ہو چکی تھی حضرت نوح نے وعظ کیا ہو اور تمام دنیا کے لوگوں نے اُن کا وعظ سن کر اُن کے ماننے سے انکار کیا ہو، بلکہ بہت سے وسیع ملک ایسے ہوں گے جہاں کے باشندوں نے حضرت نوح کے نبی ہونے کی اور اُن کے وعظ کرنے کی اور خدا کے راہ کی ہدایت کرنے کی خبر بھی نہ سنی ہوگی۔

قرآن مجید سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے نوح کو تمام دنیا کے لوگوں کے پاس بھیجا ہے، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اُس کی قوم کے پاس بھیجا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس وقت دنیا میں اور قومیں بھی موجود تھیں۔ پس جس قوم کے پاس نوح بھیجے گئے تھے اُسی قوم پر طوفان کا عذاب بھی آیا تھا اور یہی امر قرآن مجید کی ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے جن کو ہم ابھی بیان کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں خدا نے فرمایا ہے۔ **وَلَقَدْ ارسلنا نوحاً الىٰ قومه فقل يا قوم اعبدوا الله ما لکم من الہ غیرہ، افلا تتقون** (سورہ سومیں آیت ۲۳)۔

یعنی۔ ہم نے نوح کو بھیجا اُس کی قوم کی طرف، نوح نے کہا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارے لیے کوئی معبود سوائے خدا کے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح ایک خاص قوم کے پاس بھیجے گئے تھے پس وہ عذاب بھی اُسی قوم کے لیے آیا تھا جس کے لیے حضرت نوح بھیجے گئے تھے، پس

وہ عذاب بھی اسی قوم کے لیے آیا تھا - جس کے لیے حضرت نوح بھیجے گئے تھے -

پھر خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ونوحا اذ نادى من قبل فاستجبنا ر فنجينه واهله من الكرب العظيم ونصرناه من القوم الذين كذبوا بايتنا انهم كانوا قوم سوء فاعرقناهم اجمعين - (سورہ انبیا آیت ۷۶ و ۷۷) یعنی - ہم نے مدد کی نوح کی اس قوم پر جس نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو بیشک وہ قوم تھی بری پس ڈبو دیا ہم نے ان سب کو اکٹھا - اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہی قوم ڈبوئی گئی تھی جس - حضرت نوح کا انکار کیا تھا -

اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح سے فرمایا - ولا تخاطبني في الذين ظلموا انهم مغرقون (سورہ ہود آیت ۳۹ سورہ مومنین آیت ۲۷) -

یعنی - تو مت کہہ مجھ سے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے نافرمانی کی کیوں کہ وہ ڈوبنے والے ہیں پس اس آیت سے بھی صرف انہیں لوگوں کا ڈوبنا معلوم ہوتا ہے جنہوں نے حضرت نوح کی ہدایت کو نہیں مانا -

پھر خدا نے فرمایا کہ - انما ارسلنا نوحا الى قومہ ان اذر قومک من قبل ان ياتيهہم عذاب الیم - (سورہ نوح آیت ۱) یعنی - ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف کہ ڈرا اپنی قوم کو پہلے اس سے کہ آوے ان پر عذاب دکھ دیتا اور جب حضرت نوح کی نصیحت انہوں نے نہ مانی ، تو حضرت نوح نے دعا مانگی کہ ان پر طوفان کا عذاب آوے ، اس سے بھی اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ صرف قوم نوح پر عذاب آیا تھا نہ کہ تمام دنیا پر - جو لوگ کہ قرآن مجید سے طوفان کا تمام دنیا میں آنا بیان

کرتے ہیں وہ صرف دو آیتوں پر استدلال کرتے ہیں۔ اول وہ آیت ہے کہ جب حضرت نوح نے خدا تعالیٰ سے دعا مانگی کہ - وقال نوح رب لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا (سورہ نوح آیت ۲۷) یعنی - اے پروردگار مت چھوڑ زمین پر کافروں کا ایک گھر بھی بسا ہوا۔ حالانکہ اس آیت سے کسی طرح عام ہونا طوفان کا ثابت نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اس آیت میں جو ارض کا لفظ ہے اس پر بھی الف لام ہے۔ پس اس سے صاف ثابت ہے کہ زمین سے وہی زمین مراد ہے جہاں نوح کی قوم رہتی تھی اور کافروں سے وہی کافر مراد ہیں جنہوں نے حضرت نوح کا انکار کیا چنانچہ اسی امر کی تائید ان تمام آیتوں سے پائی جاتی ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔

دوسری آیت وہ ہے جہاں خدا نے فرمایا - وجعلنا ذریۃ ہم الباقین (سورہ صافات آیت ۷۵) وجعلنا ہم خلائف (سورہ یونس آیت ۷۴) یعنی - اور کیا ہم نے نوح ہی کی ذریت کو بجی ہوئی اور ایک جگہ فرمایا ہے کہ کیا ہم نے ان کو جانشین - مگر میں نہیں سمجھتا کہ ان آیتوں سے کس طرح تمام دنیا میں طوفان آنے کا استدلال کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس آیت کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ جن لوگوں پر طوفان آیا تھا ان میں سے بجز نوح کی ذریت کے اور کوئی نہیں بچا۔ پھر اس سے تمام دنیا پر طوفان کا آنا کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے علماء نے صرف یہودیوں کی پیروی کر کے طوفان کا عام ہونا قرآن مجید سے نکالنا چاہا تھا ورنہ ہمارے قرآن مجید سے عام ہونا طوفان کا نہیں پایا جاتا۔ فتدبر۔

قرآن مجید میں یہ بیان نہیں ہے کہ طوفان کا پانی اس قدر اونچا ہو گیا تھا کہ اونچے پہاڑ بھی چھپ گئے تھے۔ بلکہ سورہ قمر میں

صرف یہ آیا ہے کہ۔ ففتحنا ابواب السماء بہا منہمرو  
فجرنا الارض عیونا فالتقی الہاء علی امر قد قدر۔ (سورۃ قمر  
آیت ۱۱ و ۱۲)۔ فاذا جاء امرنا وفار التنور (سورۃ مومنین  
آیت ۲۷)۔

یعنی۔ ہم نے موسلا دھار مینہ پڑنے سے آسمان کے دروازے  
کھول دے اور ہم نے زمین کے چشموں کو پھاڑ دیا پھر ایک پانی  
دوسرے پانی سے مل گیا۔ مقرر کیے ہوئے کام پر۔ سورۃ مومنین  
میں فجرنا الارض کی جگہ، فار التنور۔ کا لفظ آیا ہے اس کے  
معنی روٹی پکانے کے تنور کے لینے صریح غلطی ہے۔ کیوں کہ خود  
قرآن مجید میں دوسری آیت سے اس کی تفسیر ہوتی ہے یعنی جو معنی  
فجرنا الارض کے ہیں وہی معنی فار التنور کے ہیں۔ قاموس  
میں لکھا ہے کہ التنور کل سفجر ماء یعنی جہاں سے زمین  
میں پانی پھوٹ نکلے اور چشمہ جاری ہو جاوے اس کو تنور کہتے  
ہیں اور یہ معنی بالکل قرآن مجید کی پہلی آیت کے مطابق ہیں جس  
سے دوسری آیت کی تفسیر ہوتی ہے۔ پس قرآن مجید سے صرف اس  
قدر ثابت ہوتا ہے کہ مینہ نہایت زور سے برسا، زمین میں سے چشمے  
جاری ہو گئے اور ایک پانی دوسرے سے مل گیا اور تمام ملک  
سطح آب ہو گیا اور اس قدر پانی چڑھا کہ کشتی تیرنے لگی اور جو  
لوگ کشتی میں نہ تھے وہ ڈوب گئے۔

اس پر یہ شبہ وارد ہو سکتا ہے کہ اگر پانی اس قدر نہیں  
چڑھا تھا کہ پھاڑ بھی ڈوب گئے تھے تو لوگوں اور جانوروں نے  
پھاڑوں پر کیوں نہ پناہ لی۔ جیسے کہ حضرت نوح کے بیٹے نے کہا  
تھا کہ میں پھاڑ پر پناہ لے لوں گا۔ مگر غور کرنا چاہیے کہ ایسے  
شدید طوفان میں جس میں اس قدر زور سے مینہ برستا ہو دریا آبل  
گئے ہوں زمین سے پانی پھوٹ نکلا ہو کسی جاندار کو کسی مامن

تک پہنچنے کی فرصت نہیں مل سکتی اور یہ بات ہم ادنیٰ سے ادنیٰ طغیانی پانی میں دیکھتے ہیں کہ ہزاروں آدمی ڈوب کر مر جاتے ہیں اور کسی طرح جان بچا نہیں سکتے - پھر ابسے بڑے طوفان میں جیسا کہ حضرت نوح کا تھا - اور بہت دنوں تک برابر پانی برستا رہا لوگوں کا اور جانوروں کا آس سے بچنا اور جان بچانا ناممکن تھا -

علاوہ اس کے میری رائے میں توریت مقدس سے بھی طوفان کا عام ہونا اور پانی کا اس قدر چڑھ جانا، جس نے آونچے آونچے دنیا کے پہاڑوں کو بھی چھپا لیا ہو ہرگز ثابت نہیں ہوتا - چنانچہ میں نے اپنی کتاب تبیین الکلام میں اس پر پوری بحث کی ہے مگر چون کہ اس تفسیر میں توریت کی آیتوں پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے اس لیے اُن پر بحث نہیں کی جاتی ہے البتہ اُن واقعات کی نسبت جو قرآن مجید میں مذکور ہیں اور توریت میں اُن کا ذکر نہیں ہے کچھ لکھنا مناسب ہے -

سورہ ہود میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ :

و نادىٰ نوح ابنه وكان في معزل يبنىٰ اركب معنا ولا تكن مع الكافرين قال ساوى الى جبل يعصمنى من الماء قال لا عاصم اليوم من امر الله الا من رحم و حال بينهما الموج فكان من المغرقين - (سورہ ہود آیت ۴۴ و ۴۵) -

یعنی - اور ہکارا نوح نے اپنے بیٹے کو اور وہ ہو رہا تھا کنارے، اے بیٹے سوار ہو ساتھ ہمارے اور مت ہو ساتھ کافروں کے، کہا اُس نے میں چڑھ جاؤں گا پہاڑ پر بچاؤں گا مجھ کو پانی سے - نوح نے کہا کہ کوئی بچانے والا نہیں ہے آج کے دن اللہ کے حکم سے، مگر وہ جس پر وہ رحم کرے اور آگئی اُن دونوں میں موج پھر ہو گیا ڈوبنے والوں میں -

اور اسی سورہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ - و نادى نوح  
ربه فقال رب ان ابنى من اهلى و ان وعدك الحق و انت  
احكم الحاكمين قال ينعوح انه ليس من اهلك ان  
عمل غير صالح فلا تستئذن ما ليس لك به علم انى  
اعطيتك ان تكون من الجاهلين قال رب انى اعوذ بك  
ان استئلك ما ليس لى به علم و الا تغفرلى و ترحمنى  
اكن من الخسرين (سورہ ہود آیت (۴۶ - ۴۸) -

یعنی - اور پکارا نوح نے اپنے رب کو پھر کہا اے رب میرا بیٹا  
ہے گھر والوں میں سے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو حاکموں کا حاکم  
ہے فرمایا اے نوح وہ نہیں تیرے گھر والوں میں سے - اس کے کام  
ہیں ناکارہ تو مت پوچھ مجھ سے ، تجھ کو معلوم نہیں - میں بچاتا ہوں  
تجھ کو جاہلوں میں ہونے سے - کہا اے رب میرے میں پناہ  
مانگتا ہوں تجھ سے یہ کہ چاہوں میں تجھ سے جو معلوم نہیں مجھ کو  
اور اگر تو نہ بخشیگا مجھ کو اور نہ رحم کرے گا تو ہونگا میں  
ٹوٹے والوں میں سے -

ان آیتوں سے بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ سوائے ان  
تین بیٹوں کے جن کا ذکر توریت مقدس میں ہے حضرت نوح کے  
ایک اور بیٹا تھا جو کافروں کے ساتھ ڈوب گیا -

مگر یہ خیال غلط ہے کہ حضرت نوح کا کوئی اور بیٹا  
سوائے ان تین بیٹوں کے نہ تھا اور یہ بیٹا جس کا یہاں ذکر ہے  
حضرت نوح کا بیٹا نہ تھا بلکہ حضرت نوح کی بیوی کا بیٹا پہلے  
خاوند سے تھا اور قائن کی نسل سے تھا اور غالباً یہ بیٹا نعمہ کا تھا  
جس کا نام کتاب پیدائش باب ۴ ورس ۲۲ میں آیا ہے -

یہ جو میں نے بیان کیا یہ میری رائے نہیں ہے بلکہ ہمارے  
یہاں کے مفسر بھی یہی لکھتے ہیں - تفسیر کبیر میں ہے - انہ کان

ابن امرتہ وهو قول مجد الباقر علیہ السلام وقول الحسن البصری ویروی ان علیا رضی اللہ عنہ قراء نادى نوح ابنہ ابنہا والضمیر لامرته وقرأ مجد بن علی الباقر وعروة ابن زبیر ابنہ بفتح الہما یرید انہ ابنہا الا انہما اکتفیا بالفتح من الالف وقال قتادہ سالت الحسن من ابنہ فقال واللہ ما کان ابنالہ فقال قلت لہ ان اللہ حکى عنہ انہ قال ان ابنی من اہلی و انت تقول ما کان ابنالہ فقال انہ لم یقل انہ ابنی ولكنہ قال من اہلی وهذا يدل علی قولی - (تفسیر کبیر) -

یعنی - وہ جس کو حضرت نوح نے بیٹا کہا حضرت نوح کا بیٹا نہ تھا بلکہ حضرت نوح کی بیوی کا بیٹا تھا اور یہ قول ہے جناب مجد باقر علیہ السلام کا اور حسن بصری کا اور یہ روایت ہے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت مجد بن علی الباقر اور عروہ ابن زبیر نے اس آیت میں جو مذکر کی ضمیر ہے اور حضرت نوح کی طرف پھرتی ہے مؤنث کی ضمیر پڑھی تھی تاکہ حضرت نوح کی بیوی کی طرف پھرے اور قتادہ نے کہا کہ میں نے حسن بصری سے حضرت نوح کے بیٹے کا حال پوچھا - انہوں نے کہا قسم بخدا کہ حضرت نوح کا کوئی بیٹا جو طوفان میں ڈوبا نہ تھا - قتادہ نے کہا کہ خدا نے تو قول نوح کا یوں بیان کیا ہے کہ نوح نے اپنے بیٹے کو جو ڈوب گیا کہا کہ میرا بیٹا میرے خاندان میں سے ہے اور تم کہتے ہو کہ اُس کے کوئی بیٹا جو طوفان میں ڈوبا نہ تھا - حسن بصری نے کہا کہ حضرت نوح نے یہ نہیں کہا کہ میرا سگا بیٹا بلکہ یہ کہا کہ میرے خاندان کا بیٹا اور یہ اُن کا کہنا اُس بات پر دلالت کرتا ہے جو میں کہتا ہوں -

پس ان روایتوں میں سے ثابت ہوا کہ یہ شخص حضرت نوح

کا بیٹا نہ تھا اور اسی سبب سے توریت مقدس میں حضرت نوح کے بیٹوں کے ساتھ اس کا ذکر نہیں ہے ۔

جس آیت سے حضرت نوح کی بیوی کا طوفان میں ڈوبنا خیال کیا جاتا ہے وہ یہ ہے ۔

ضرب الله مثلاً الذین کفروا امرۃ نوح وامرۃ لوط کانتا تحت عبدين من عبادنا صالحین فخانتاهما فمما فلم یغنیا عنهما من الله شیئاً وقیل ادخلا النار مع الداخلین (سورہ تحریم آیت ۱۰) ۔

یعنی اللہ نے بتائی ایک کھاوت منکروں کے واسطے عورت نوح کی اور عورت لوط کی ، گھر میں تھیں دونوں دو نیک بندوں کے ہمارے بندوں میں سے پھر نافرمانی کی انہوں نے اُن کی پھر نہ دفع کیا انہوں نے اُن سے تھوڑا سا بھی عذاب اللہ کا اور حکم ہوا کہ جاؤ دوزخ میں ساتھ جانے والوں کے ۔ اس آیت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی بھی کافروں میں تھی اور وہ بھی غرق ہوئی اور توریت مقدس سے پایا جاتا ہے کہ حضرت نوح کی بیوی کشتی میں حضرت نوح کے ساتھ تھی اور انہوں نے ڈوبنے سے نجات پائی ۔

مگر سمجھنا چاہیے کہ باوجودیکہ اُس آیت میں حضرت نوح کی بیوی کا ڈوبنا صاف بیان نہیں ہوا لیکن اگر اس پر بھی اُن کا ڈوبنا ہی سمجھیں تو اُس کے ساتھ ہی ہم کو یہ بات بھی کہنی چاہیے کہ ہمارے ہاں کتابوں سے پایا جاتا ہے کہ حضرت نوح کی دو بیویاں تھیں اُن میں سے ایک بیوی ڈوبی اور ایک حضرت نوح کے ساتھ کشتی میں گئی چنانچہ تفسیر کبیر میں ابن عباس سے سے روایت لکھی ہے کہ کشتی میں نوح اور ان کی بیوی تھی سوائے اس بیوی کے جو ڈوب گئی ۔ بعض علمائے یہود کہتے ہیں کہ حضرت



نوح کی ایک بیوی نعمہ نسل قاین سے تھی اور ایک بیوی اولاد حضرت ادریس سے ، پس کچھ عجب نہیں کہ نعمہ کافر ہو اور وہ ڈوب گئی ہو اور اسی سبب سے توریت مقدس میں اس کا ذکر نہ کیا ہو ، مگر جب یہ ثابت ہے کہ حضرت نوح کی ایک بیوی بلاشبہ کشتی میں تھی تو اگر اس آیت سے ایک بیوی کا غرق ہونا ہی مراد لیا جاوے تو بھی کچھ اختلاف نہیں رہتا ۔

سورہ مومنین میں خدا نے یہ فرمایا ہے ۔ فاذا جاء امرنا وفار السطور فاسلك فيهما من كل زوجين اثنين (سورہ مومنین آیت ۲۷ و ۲۸) یعنی ۔ کہ جب ہمارا حکم آوے اور زمین کے چشمے پھوٹ نکلیں تو بٹھا لے اس میں یعنی کشتی میں ہر جوڑے سے دو ، توریت میں اس مضمون کو بہت زیادہ وسیع کر دیا ہے جس سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تمام دنیا کے جانوروں کے جوڑے کشتی میں بٹھائے گئے تھے اور پھر اس کے غیر ممکن ہونے پر بہت سی دلیلیں لائی گئیں ہیں ۔ مگر قرآن مجید ان تمام مشکلات سے مبرا ہے کیوں کہ قرآن مجید سے صرف یہ بات کہ جو جانور حضرت نوح کی دست رس میں موجود تھے ان کے جوڑے کشتی میں بٹھائے گئے تھے کچھ تو اس خیال سے کہ کھانے کے کام آویں گے اور کچھ اس خیال سے کہ طوفان کے بعد ان سے نسل چلے گی کیوں کہ ملک کی بردبادی کے بعد سردست ان جانوروں کا کاہم پہنچنا اور دوسرے ملکوں سے لانا علی الخصوص اس زمانہ میں کہ اس کام کے لیے وسائل ناپید تھے نہایت دقت طلب امر تھا ۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ۔ اما قوله فاسلك فيهما ای دخل فيهما يقال سلك فيه ای دخل فيه و سلك غیره و اسلكه من كل زوجين اثنين ای كل زوجين من الحيوان الذي يحضره في الوقت اثنين الذكر والانثی لکی لا ينقطع نسل ذالك الحيوان (تفسیر کبیر) ۔ یعنی خدا کے اس قول

کے کہ فاسلک فیہا یہ معنی ہیں کہ داخل کر یعنی بٹھا لے اس میں یعنی کشتی میں عرب کے محاورہ میں کہا جاتا ہے ۔ سلک فیہ یعنی داخل ہوا اس میں اور اسلکھ من کل زوجین اثنین کا یہ مطلب ہے کہ جو جانور اس وقت پر موجود ہوں ان کے جوڑے نر و مادہ کشتی میں بٹھا لے تاکہ ان جانوروں کی نسل منقطع نہ ہو جاوے ۔

باقی قصہ جو قرآن مجید میں مذکور ہے بہت صاف ہے اخیر قصہ پر خدا نے فرمایا ہے کہ یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے کہ ہم نے اس کی تجھ پر وحی کی ہے نہ تو اسے جانتا تھا اور نہ نہ تیری قوم اس سے پہلے ، صبر کر (اے محمد ! کافروں کے ایذا دینے اور جھٹلانے پر) بے شک آخر کو (کامیابی) پرہیزگاروں کے لیے ہے (ہود آیت ۵۱) ۔

اس آیت پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا اس سے پہلے طوفان نوح کا قصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور عرب کے لوگوں کو جن میں کثرت سے یہودی آباد ہو گئے تھے اور کچھ عیسائی بھی آباد تھے ۔ معلوم نہ تھا ۔ مگر یہ بات نہیں ہے زیادہ پر قرین قیاس یہ ہے کہ یہ قصہ عام طور پر مشہور تھا مگر اس کے ساتھ بہت سی غلط باتیں بھی مشہور تھیں ۔ صحیح صحیح قصہ لوگوں کو معلوم نہ تھا جس کو خدا نے بذریعہ وحی کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بتایا پس عدم علم کا جو ذکر اس آیت میں ہے وہ صحیح قصہ کے جاننے سے متعلق ہے نہ کہ عام طور پر اس قصہ سے ۔ قرآن مجید میں جس قدر اگلے قصے بیان ہوئے ہیں اگرچہ دراصل ان سے عبرت دلانی مقصود ہوتی ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بھی عورتا ہے کہ قصہ کو صحیح صحیح بیان کیا جاتا ہے تاکہ جو غلطیاں مشہور ہو رہی ہیں ان کی صحت ہو جاوے ۔ قریباً تمام دنیا

کی قوموں میں طوفان کا قصہ بطور ایک مذہبی قصہ کے مشہور تھا اور اُس کے بیانات اور واقعات اس قدر مختلف اور عجیب طور پر مشہور ہو رہے تھے کہ ایک میں بھی پوری پوری سچائی نہ تھی۔ چند یورپ کے لوگوں مثل مسٹر ٹرینٹ اور ریورنڈ ایل۔ ڈی ہار کورٹ وغیرہ نے کتابیں لکھی ہیں جن میں اُن قصوں کو جمع کیا ہے جو طوفان کی بابت بطور مذہبی قصہ کے تمام دنیا میں مشہور ہیں۔ پس وحی نے جو کچھ بتایا اور جو لوگوں کو معلوم نہ تھا وہ یہی ہے کہ صحیح قصہ طوفان کا کیا ہے۔

یہودی اور عیسائیوں نے جو مذہبی طور پر سب سے بڑی غلطی اس قصہ میں ڈال رکھی تھی وہ یہ تھی کہ تمام دنیا میں طوفان آیا تھا اور کل کرۂ زمین پانی میں ڈوب گیا تھا اور طوفان کا پانی دنیا کے بڑے سے بڑے پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی اونچا ہو گیا تھا اور حضرت نوح نے تمام دنیا کے ہر قسم کے جانداروں کا جوڑہ جوڑہ کشتی میں بٹھا لیا تھا اور تمام دنیا کے جانور تمام انسان اور چرند و پرند و حشرات الارض سب کے سب مر گئے تھے اور بجز اُن کے جو کشتی میں تھے کوئی جان دار تمام دنیا میں زندہ نہیں رہا تھا۔ یہ ایک بڑی غلطی تھی جس کو قرآن مجید نے صحیح کیا ہے مگر افسوس اور نہایت افسوس کہ ہمارے مفسروں نے قرآن مجید کی اس برکت کو حاصل نہیں کیا اور وہ خود یہودیوں اور عیسائیوں کی تقلید سے اسی غلطی میں پڑ گئے جس غلطی سے قرآن مجید نے اُن کو نکالنا چاہا تھا۔

ایک اور امر غور طلب ہے متعلق حضرت نوح کے یعنی تعداد اُن کی عمر کی، خدا تعالیٰ نے سورۃ عنکبوت میں فرمایا ہے کہ - وَلَقَدْ ارسلنا نوحا الی قومہ فلیث فیہم الف سنۃ الا خمسین عاما (سورۃ عنکبوت آیت ۲۹) -

یعنی - ہم نے بھیجا نوح کو اس کی قوم کی طرف پھر وہ  
رہا ان میں پچاس برس کم ایک ہزار برس -

توریت میں لکھا ہے کہ نوح چھ سو برس کے تھے جب طوفان  
آیا (کتاب پیدائش باب ۷ ورس ۶) اور پھر لکھا ہے کہ بعد  
طوفان کے نوح تین سو پچاس برس زندہ رہا اور اس کی عمر نو سو  
پچاس برس کی تھی (کتاب پیدائش باب ۹ ورس ۲۸ و ۲۹) لیکن  
جب کہ انسان کی نسل بڑھنی شروع ہوئی تھی اور ابھی طوفان  
نہیں آیا تھا اس وقت خدا نے کہا تھا کہ ”بسبب بودن ایشان  
بشرضالہ“ نہایت مدت ایام ایشان یکصد و بست سال خواهد شد“  
(توریت کتاب پیدائش باب ۶ ورس ۳) -

مگر یہ ایک بہت طولانی بحث ہے دن اور برس جو توریت میں  
مندرج ہیں وہ نہایت بحث طلب ہیں دنیا کے ظہور اور انسان کے  
وجود کی جو مدت توریت میں لکھی ہے وہ بھی بڑی بحث کے  
قابل ہے -

اس میں بھی کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ برس کی مدت ہر  
ایک زمانہ میں مختلف رہی ہے اور جس واقعہ یا انسان کی عمر کی  
تعداد اس زمانہ کے حساب سے کی گئی ہے وہی تعداد بیان ہوتی رہی  
ہے جیسے کہ قرآن مجید اور توریت میں حضرت نوح کی عمر ساڑھے  
نو سو برس بیان ہوئی ہے -

علاوہ اس کے قدیم زمانہ کا یہ رواج بھی معلوم ہوتا ہے کہ  
جس خاندان کا کوئی پیٹر یا ٹک ہوا ہے جب تک کہ اس خاندان  
میں دوسرا پیٹر یا ٹک نام آور نہ ہوا ہو - پہلے پیٹر یا ٹک ہی کا نام  
چلا جاتا ہے پس جب تک کہ ان سب باتوں پر بحث نہ ہو اس  
وقت تک ”فلیٹ فیہم الف سنۃ الا خمسین عاما“ کی حقیقت  
بیان نہیں کی جا سکتی - اس مضمون میں ان تمام امور پر بحث کرنے

کی گنجائش نہیں ہے ۔ اگر خدا کی مرضی ہے تو ایک مستقل کتاب میں اس پر بالاستیعاب بحث کی جاوے گی اور تمام سلسلہ مدت پیدائش دنیا کا اور لوگوں کی عمروں کا جو تہوریت میں مذکور ہے آٹ پلٹ ہو جاوے گا ۔

---

## حضرت ابراہیم علیہ السلام

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

و اذ قال ابراهيم لابنيه آزر اتخذوا صنماً آلهة انتي اراك وقومك في ضلال مبين و كذلك نرى ابراهيم ملكوت السموات والارض وليكون من الموقنين - فلما جن عليه الليل راى كوكباً قال هذا ربى فلما افل قال لا احب الافلين - يعنى - اور جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ (یعنی چچا) آزر سے کہ کیا تو نے ٹھہرایا ہے بتوں کو خدا بے شک میں تجھ کو اور تیری قوم کو علانیہ گمراہی میں دیکھتا ہوں اور اسی طرح ہم ابراہیم کو دکھاتے تھے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی تاکہ وہ ہووے یقین کرنے والوں میں سے - پھر جب اُس پر رات چھا گئی اس نے ایک تارے کو دیکھا کہا یہ ہے میرا رب پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہا میں دوست نہیں رکھتا ڈوب جانے والوں کو -

ان آیتوں میں حضرت ابراہیم کی نسبت جو حالات مذکور ہیں اُن میں چند امور غور طلب ہیں -

(۱) اول یہ کہ آزر حضرت ابراہیم کے کون تھے - قرآن مجید میں آزر کو حضرت ابراہیم کے اب کے لفظ سے تعبیر کیا ہے مگر قرآن مجید میں باپ کا اطلاق باپ اور چچا دونوں پر آیا ہے - قرآن میں ہے کہ حضرت یعقوب کی اولاد نے کہا کہ ”نعبد الٰہک والہ آبائک ابراہیم و اسماعیل و اسحاق“ حالانکہ

اسماعیل حضرت یعقوب کے چچا تھے اُن پر بھی یعقوب کے باپ کا اطلاق ہوا ہے۔ تفسیر کبیر میں بھی بعض اقوال لکھے ہیں کہ اس آیت میں اب کا اطلاق عم پر ہوا ہے۔ ظن غالب ہے کہ حضرت ابراہیم کے باپ کا نام ترح تھا۔ توریت سے پایا جاتا ہے کہ ترح کے بھائی بھی تھے مگر توریت میں ان کے نام نہیں بیان کیے چنانچہ کتاب پیدائش باب ۱۱ ورس ۲۴، ۲۵ میں لکھا ہے کہ ”وناہور بست و نہ سال زندگی نمودہ ترح را تولید نمود۔ وناہور بعد از تولید نمودنش ترح یک صد نوزده سال زندگانی نمودہ پسران و دختران را تولید نمود“ ان آیتوں سے ترح کے بھائیوں یعنی حضرت ابراہیم کے چچاؤں کا ہونا پایا جاتا ہے۔

علاوہ اس کے توریت کے اُسی باب میں لکھا ہے کہ بعد اُن تمام واقعات کے جو حضرت ابراہیم پر اُن کے وطن ”اور کسدیم“ میں گزرے اُنہوں نے اپنے وطن کو چھوڑ دیا اور کنعان کی طرف روانہ ہوئے تو اُن ساؤ کے اُن کے باپ ترح بھی تھے اور اُنہوں نے بھی اس ملک کو چھوڑ دیا تھا چنانچہ ورس ۳۱ میں لکھا ہے کہ ”ترح پسر خود ابرام و پسر پسر خود لوط پسرہاران و عربوس خود ساری زن پسرش ابرام را برداشت و باہم دیگر از اور کلدانیاں بقصد رفتن بزمین کنعن بیرون آمدند“ پس یہ ایک دلیل اس بات کی ہے کہ جس مباحثہ کا قرآن مجید میں ذکر ہے وہ حضرت ابراہیم کے باپ سے نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اب کا لفظ عم پر بطور اظہار محبت اور بزرگی چچا کے جن سے مباحثہ پیش آ گیا تھا بولا گیا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ جب حضرت ابراہیم نے یہ مباحثہ کیا تو اُن کی عمر کیا تھی۔ اس امر کا تحقیق کرنا ناممکن ہے کیوں کہ ان امور کی تحقیقات صرف توریت پر منحصر ہے۔ نسخے توریت کے اس باب میں نہایت مختلف ہیں۔ عبری توریت سے معلوم ہوتا ہے

کہ سنہ دنیوی کے ۱۹۵۸ برس بعد حضرت ابراہیم پیدا ہوئے تھے اور یونانی نسخہ توریت سے جس کو سپٹوائجنٹ کہتے ہیں اُن کی پیدائش ۲۷۲۸ برس بعد سنہ دنیوی کے اور سامری نسخہ توریت سے ۲۵۹۸ برس بعد معلوم ہوتی ہے۔ عیسائی مؤرخوں نے ولادت حضرت ابراہیم کی ۲۰۰۸ بعد سنہ دنیوی کے اور ان کا اور کلدانیان سے نکلنا ۲۰۸۳ سنہ دنیوی میں قرار دیا ہے اور اس حساب سے اُس وقت اُن کی عمر پچھتر برس کی تھی مگر اس حساب پر اعتقاد کرنے کی کوئی کافی وجہ نہیں ہے۔

قرآن مجید سے جہاں خدا نے فرمایا ہے ”قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ اِبْرَاهِيمُ“ معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں حضرت ابراہیم جوان تھے اور دوسری جگہ خدا نے فرمایا ہے ”وَلَقَدْ آتَيْنَا اِبْرَاهِيمَ رَشٰدًا مِّنْ قَبْلِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ“ (سورہ انبیا آیت ۵۲) اور اسی آیت کے اس مباحثہ کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبل وقت مباحثہ کے حضرت ابراہیم جوان اور رشید ہو چکے تھے اور ان کا دل الہامات ربانی سے معمور تھا۔ حسن کے لیے عموماً چالیس برس کی عمر خیال کی جاتی ہے پس کچھ عجب نہیں ہے کہ یہ واقعہ اسی عمر کے قریب قریب واقع ہوا ہو۔

مگر ہمارے علمائے مفسرین کو ”فَلَمَّا جَنَّ عَلٰیہِ الْاَمَلُ“ نے گھبرا دیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ پہلی دفعہ تھی جو انہوں نے رات دیکھی تھی اور اس لیے بے اصل قصہ اپنی تفسیروں میں لکھا ہے۔ کہ اُس زمانہ کے بادشاہ کے خوف سے جس نے ایک خواب دیکھا تھا اور لڑکوں کے قتل کا ارادہ کیا تھا۔ حضرت ابراہیم کی ماں نے اُن کے حمل کو چھپایا اور جب لڑکا پیدا ہونے کا وقت آیا تو ایک پہاڑ کی کھوہ میں جا کر جنا اور اُس کا منہ پتھروں سے



بند کر دیا اور حضرت جبریل نے حضرت ابراہیم کی پرورش کی ۔ جب وہ اُس پہاڑی کی کھوہ میں بڑے ہو گئے تو اُس کھوہ میں سے پہلی دفعہ رات کو ایک ستارہ دیکھا پھر چاند دیکھا پھر سورج دیکھا ۔

مگر یہ خیال اور یہ قصہ دونوں صحیح نہیں ہیں ۔ حضرت ابراہیم کے ناحور اور ہاران دو اور بڑے بھائی تھے اور حضرت ابراہیم سب سے چھوٹے تھے ۔ انسان کی فطرت میں ہے کہ جب وہ کسی قوم میں پیدا ہوتا ہے تو یا تو اُسی قوم کی باتوں پر یقین کرتا ہے اور اُسی قوم کے عقاید اور اعمال کی پیروی کرنے لگتا ہے یا اُس قوم کے افعال و اقوام کو تعجب و حیرت کی نگاہ سے دیکھتا رہتا ہے ، نہ اُن پر یقین کرتا ہے اور نہ اُن افعال میں شریک ہوتا ہے اور نہ اُس کے ذہن میں آتا ہے کہ اصل بات کیا ہے اور ایک تفکر اور سوچ کی حالت میں ایک زمانہ بسر کرتا ہے اور خدا کی ہدایت جو خدا نے انبیاء اور صلحا کی فطرت میں رکھی ہے اس کی تائید کرتی رہتی ہے ۔ اسی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے جہاں فرمایا ہے ، ”کَذٰلِکَ نَرٰی اِبْرٰہِیْمَ سَلٰکُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ اسی حالت میں ایک رات ستارہ اور چاند اور اس کے بعد سورج کو دیکھ کر حضرت ابراہیم کو وہ خیال آنا جو قرآن مجید میں مذکور ہے پس ضرور نہیں ہے کہ وہ رات پہلی ہی رات ہو جو اُنہوں نے دیکھی تھی ۔

(۳) تیسرے یہ کہ ”سَلٰکُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ سے اور اس کے دکھانے سے کیا مراد ہے ۔ علمائے مفسرین نے اُس کی نسبت بھی بہت سی رطب و یابس باتیں لکھی ہیں مگر خدا کی قدرت اور اس کی عظمت اور وحدانیت پر یقین کرنے کے لیے موجودات عالم اور اس کی خلقت اور فطرت پر غور کرنے سے زیادہ یقین دلانے

والی کوئی چیز نہیں ہے اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد طریقہ پر وجود عالم سے صانع کے وجود پر استدلال کیا ہے پس خدا نے آسمان و زمین کی بادشاہت کی حقیقت حضرت ابراہیم کے دل پر کھولی جس کی ابتداء تارے و چاند و سورج کو رب خیال کرنا اور اُس کی انتہا ”انی وجہت وجہی للذی فطر السموات والارض“ کہنا ہے اور اسی طرف خدا نے اشارہ کیا ہے ، جہاں فرمایا ہے ”کذالک نری ابراہیم ملکوت السموات والارض“۔

(۴) چوتھے یہ کہ علمائے اسلام کو ایک اور مشکل پیش آئی ہے کہ ان کے اصول مقررہ کے موافق انبیا کبھی اور کسی حال میں مرتکب شرک و کفر نہیں ہوئے پس کیوں کر حضرت ابراہیم نے تارہ اور چاند اور سورج کو دیکھ کر کہا ”ہذا ربی“ اس شبہ کے رفع کرنے کو آنہوں نے متعدد طرح سے صعوبتیں اٹھائی ہیں مگر یہ امر نہایت صاف ہے جس میں کچھ مشکل نہیں۔ بلاشبہ انبیاء علیہم السلام کبھی مرتکب شرک و کفر نہیں

ہوتے اُن کی فطرت ہی اس آلودگی سے پاک ہوتی ہے۔ مگر قدیم زمانہ میں جو بت پرستی تھی اور جس کفر و شرک میں اُس زمانہ کے لوگ گرفتار تھے اُس کی حقیقت پر اول غور کرنی لازم ہے۔ تمام مشرکین ذات باری کا کسی کو شریک نہیں قرار دیتے تھے بلکہ خدا کے سوا موجودات غیر مرئی اور اجرام سماوی کو مدبرات عالم اور مالک نفع و نقصان سمجھتے تھے اور انہی کے نام سے ہیاکل اور اجنام بنا کر اُن کی پرستش کرتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ اُن کی رضا مندی و خوش نودی فائدہ بخش اور ان کی ناراضی مخرّب رساں ہے مگر کسی وجود غیر مرئی کو یا کسی کو اجرام سماوی میں سے صرف مدبر عالم خیال کرنا خواہ وہ خیال صحیح ہو یا غلط کفر و شرک نہیں ہو سکتا بلکہ کفر و شرک

آس وقت ہوتا ہے جب کہ آس میں قدرت نفع و نقصان پہنچانے کی مانی جاوے یعنی یہ سمجھا جاوے کہ آس میں قدرت ہے کہ جب چاہے نفع پہنچاوے جب چاہے نقصان اور اسی خیال سے اس کی پرستش کی جاوے مثلاً مسلمانوں کا یہ خیال کہ مینہ کے برسانے والے فرشتے بادلوں پر متعین ہیں اور مینہ برساتے پھرتے ہیں یا یہ خیال کہ آفتاب فصول اربع کا باعث اور روئیدگی اور پھولوں اور پھلوں کا مدبر ہے نہ کفر ہے نہ شرک ہے۔ لیکن جب آفتاب یا میگھ راج کی نسبت بہ اعتقاد کیا جاوے کہ ان کو مینہ برسانے یا نہ برسانے اور میوہ پکانے یا نہ پکانے کا اختیار ہے اور ان کی رضا مندی آس کے لئے مفید اور ناراضی مضرت رساں ہے اور اس خیال پر ان کی پرستش کی جاوے، تو وہ بلاشبہ شرک و کفر ہے۔ طرح کے خاندان میں زیادہ تر اجرام علوی کے اصنام کی پرستش ہوتی تھی اسی وجہ سے حضرت ابراہیم کا خیال ستارے اور چاند اور سورج پر رب یعنی مدبرات میں سے ہونے کا گیا نہ الہ ہونے کا اور آس کو بھی خدا کی ہدایت سے جو فطرت انبیاء میں ہے قرار نہ ہوا پس صرف یہ خیال شرک و کفر نہ تھا اور حضرت ابراہیم نے ان میں سے کسی کی پرستش نہیں کی نہ ان میں جب چاہیں نفع اور جب چاہیں مضرت پہنچانے کی قدرت یقین کی اس لیے کسی طرح ان کا اس معصیت میں مبتلا ہونا لازم نہیں آتا۔

اس بیان کی تشریح بعد کی آیتوں سے بخوبی ہوتی ہے جہاں حضرت ابراہیم - فرمایا ہے کہ ”میں نہیں ڈرتا آس سے جس کو تم خدا کے ساتھ شریک کرتے ہو“ پھر فرمایا کہ ”کیوں کر میں ڈروں آس سے جس کو تم شریک کرتے ہو“ یہ اقوال صاف اس بات پر دال ہیں کہ جن کی نسبت حضرت ابراہیم نے ربی کہا تھا ان کو مالک اور قادر نفع و نقصان پہنچانے پر نہیں مانا تھا۔

(۵) پانچویں یہ کہ اس آیت میں جو الفاظ ”لیکون من الموقنین“ ہیں زیادہ تر غور کے لائق ہیں خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے ابراہیم کو ملکوت السموات والارض اس لیے دکھائیں تاکہ یقین کرنے والوں میں ہو۔ ہم ان لوگوں کو جو بہ تقلید آبائی یا باطاعت کسی کے قول کے خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ مومن پاک جانتے ہیں۔ مگر جو لوگ کہ بعد غور و فکر کے اور خدا کی قدرتوں اور صنعتوں پر غور و فکر کر کے خدا پر یقین لاتے ہیں وہ نہایت اعلیٰ درجہ پر ہوتے ہیں جن کا یقین پورا کامل یقین ہوتا ہے اور کسی طرح زائل نہیں ہو سکتا۔ اسی سبب سے خدا نے حضرت ابراہیم کو ملکوت السموات والارض دکھانے کا مقصد یہ بتلایا ہے کہ ”لیکون من الموقنین“۔

ہمارا یہ یقین و تجربہ ہے کہ انسان کو جس قدر علم فطرت، قوانین قدرت، علم السماء والافلاک بڑھتا جاتا ہے اور نیچرل سائنس، علوم طبیعیات حقہ میں جس قدر آس کی واقفیت اور مہارت زیادہ ہوتی جاتی ہے اسی قدر آس کو خدا کے وجود کا یقین اور آس کی قدرت و عظمت اور شان الوہیت اور استحقاق معبودیت کا دل میں زیادہ نقش ہوتا جاتا ہے۔ واللہ درمن قال۔

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار

ہر ورقے دفترست معرفت کردگار

پس یہی قوانین قدرت لا آف نیچر تھے جو زبان شرع میں ملکوت السموات والارض سے تعبیر کیے گئے ہیں اور جن کو خدا نے حضرت ابراہیم کو دکھایا تھا یا یوں کہو کہ سمجھایا تھا اور جس کی بدولت انھوں نے ”لیکون من الموقنین“ کا خطاب پایا۔

(۶) چھٹے یہ کہ یہ مباحثہ حضرت ابراہیم کا جو قرآن میں  
مذکور ہے توریت میں نہیں ہے۔ توریت میں کسی واقعہ کا نہ ہونا  
اس کے عدم وقوع کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

---

# حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کے فرشتے

عہد قدیم کا ایک متنازعہ فیہ مسئلہ

توریت اور قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی خوش خبری دینے کے لیے اور حضرت لوط کو ان کی قوم کے عذاب کی پیشین گوئی کرنے کے لیے خدا نے فرشتوں کو بھیجا۔ سرسید اس سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ فرشتے نہیں تھے بلکہ انسان تھے۔ ذیل کے مضمون میں سرسید نے

اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ (محمد اسماعیل)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ”و لقد جاءت رسلنا ابراہیم۔۔۔ بالبشری قالوا سلماً قال سلماً فما لبث ان جاءہ“ بعجل حنید (سورہ ہود آیت ۶۹) اور بے شک آئے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر انہوں نے کہا سلام۔ ابراہیم نے کہا سلام۔ پھر ابراہیم نے دیر نہ کی کہ لایا بھنا ہوا بچہڑا۔“

سورہ عنکبوت میں یہ لفظ بھی لیا جاتا ہے رسلنا ابراہیم۔ یعنی جب کہ آئے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس سورۃ حجر میں بجائے رسلنا کے ضیف کا لفظ ہے خدا نے فرمایا۔ و نبہم

عن ضیف ابراہیم - یعنی آن کو خبر دے ابراہیم کے  
مہانوں کی -

اور سورہ ذرایات میں ہے - هل اتاك حديث ضيف ابراہیم  
المکرمین - کیا تیرے پاس ابراہیم کے مکرم مہانوں کی خبر  
پہنچی ہے -

پس امر بحث طلب یہ ہے کہ یہ بھیجے ہوئے یا ضیف ابراہیم  
کون تھے؟ توریت باب ۱۸ ورس ۲ میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم  
نے دیکھا کہ تین آدمی اس کے برابر کھڑے ہیں عبری میں لفظ  
شلاشہ انشیئم ہے یعنی ثلاثہ انسانین اور پھر ورس ۱۶ ، ۲۲  
میں اور باب ۱۹ ورس ۵ ، ۱۰ ، ۱۶ میں بھی آن کو انسان کہا  
ہے مگر باب ۱۹ کے پہلے ورس میں آن کو ملاخیم یعنی ملائکین  
کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اس لیے یہودی آن تینوں کو فرشتے اعتقاد  
کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ جبریل و میکائیل و اسرافیل تھے -

عیسائی بھی آن کو فرشتے مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ  
پہلی ہی دفعہ تھی کہ فرشتے انسان کی صورت بن کر دنیا میں آئے  
تھے - تفسیر ڈائلی اینڈ مائٹ میں لکھا ہے کہ آن میں کا تیسرا  
بہ نسبت باقی دو کے اعلیٰ درجہ کا تھا اور اس لیے ابراہیم نے  
اس کو بطور ایک سردار کے خطاب کیا یعنی ”ادناي“ کہہ کر  
جس کو موسیٰ ”جہوہ“ کہتا ہے اور یہودی اور عیسائی اس کو  
خدا کا نام سمجھتے ہیں اور اس لیے بہت سے عیسائی تصور کرتے  
ہیں کہ وہ خدا کا بیٹا تھا جو اس صورت میں آیا تھا - متوسط  
زمانہ کے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی شان میں ایک فرشتہ تھا  
جس نے گفتگو کی تھی اور بلحاظ اس کی مقتدرانہ گفتگو کے یہ  
غالب رائے ہے کہ وہ خود حضرت مسیح تھے جو انصاف کرنے  
کو آئے تھے -

قرآن مجید میں صرف لفظ ”رسلنا“ یعنی ہمارے بھیجے ہوئے کا ہے۔ مسلمان مفسروں نے صرف یہودیوں کی روایتوں سے جن کی وہ ہمیشہ ایسے مقاموں میں پیروی کرتے ہیں ان کو فرشتے تسلیم کیا ہے مگر قرآن مجید سے ان کا فرشتہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ یہ تو ظاہر ہے قرآن مجید میں ان کے فرشتے ہونے پر تو کوئی نص صریح نہیں ہے باقی رہا طرز کلام و الفاظ واردہ پر استدلال قطع نظر اس کے کہ وہ مفید یقین نہیں ہو سکتا ان سے بھی وہ استدلال پورا نہیں ہوتا۔ علمائے مفسرین نے قبل اس کے کہ الفاظ قرآن مجید پر غور کریں یہودیوں کی روایتوں کے موافق ان کا فرشتہ ہونا تسلیم کر لیا ہے حالاں کہ وہ خاصے بھلے چنگے انسان تھے۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ابراہیم کے مہمانوں نے جو کھانا نہ کھایا اس کا سبب یہ تھا کہ وہ فرشتے تھے اور فرشتے نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ وہ مہمانوں کی صورت بن کر اس لیے آئے تھے کہ حضرت ابراہیم مہمانوں کے آنے کو دوست رکھتے تھے اور وہ مہمانوں کی ضیافت میں مشغول رہتے تھے۔

مگر کھانے سے انکار کرنا ان کے فرشتے ہونے کی، جو علانیہ انسان تھے اور انسانوں کی طرح آئے تھے، دلیل نہیں ہو سکتا۔

تفسیر کبیر میں سدی کا یہ قول لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے ان سے پوچھا کہ کھانا کھاؤ گے۔ انہوں نے کہا کہ ہم بغیر قیمت دئے کھانا نہیں کھاتے۔ ابراہیم نے کہا کہ اس کی قیمت یہ

---

۱۔ واعلم ان الاضياف اما امتنعوا من الطعام لانهم ملائكة والملائكة لا ياكلون ولا يشربون و اما اتوه في صورت الاضياف ليكونوا على صفة يحبها وهو كان مشغولا بالضيافة۔ (تفسیر کبیر)



ہے کہ کھانے سے پہلے خدا کا نام لو اور کھانے کے بعد کا خدا شکر کرو۔ اس پر جبریل نے میکائیل سے کہا کہ ایسے آدمی کا حق ہے کہ اس کا پروردگار اس کو اپنا خلیل یعنی دوست قبول کرے<sup>۱</sup>۔

مگر کلام سے بھی یہ بات غیر معلوم رہی کہ بعد اس کے انہوں نے کھانا کھایا یا نہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو نہ جانا کہ یہ کون ہیں (یعنی دوست مہمان ہیں یا دشمن) اور ابراہیم کے جی میں ان سے خوف ہوا<sup>۲</sup>۔

یہ آس زمانہ کا طریقہ تھا کہ دشمن اس کے ہاں جس سے دشمنی ہو کھانا نہیں کھاتے تھے۔ مگر اس آیت سے یہ بھی نہیں پایا جاتا کہ اس کے بعد بھی انہوں نے کھانا نہیں کھایا۔

توریت میں لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم کے پاس بھی کھانا کھایا اور جب وہ حضرت لوط کے پاس گئے تو وہاں بھی کھانا کھایا۔ توریت فارسی کے ترجمہ کی یہ عبارت ہے۔

و خداوند ویرا (یعنی ابراہیم را) در بلوطستان ممری ظاہر شد در حالتیکہ بر در چادر بگرمی روز می نشست و چشمان خود را کشادہ نگریست کہ اینک سہ شخص در مقابلش ایستادہ اند و ہنگامی کہ ایشان را دید از برائے استقبال ایشان از در چادر دویدو

۱۔ قال السدی قال ابراہیم علیہ السلام لہم اتاکلون قالوا لا ناکل طعاما الا بالثمن فقال ثمنہ ان تذکروا اسم اللہ تعالیٰ علیٰ اولہ و نحمدوہ علیٰ آخرہ فقال جبریل لمیکائیل علیہ السلام حق لمثل هذا الرجل ان یتخذہ ربہ خلیلا۔ (تفسیر کبیر)

۲۔ فلما رأی ایدیہم لا تصل الیہ نکرہم و اوجس منہم خیفہ۔ (سورہ ہود)

بسوے زمین خم شد و گفت اے آقام حال اگر در نظرت التفات یافتہ تمنا اینکه از نزد بندہ خود نکذری و حال اندک آہے آوردہ شود تا آن کہ پائہائے خود را شست و شودادہ در زیر این درخت استراحت فرمائید و لقمہ نانے خواہم آورد تاکہ دل خود را تقویت نمایند بعد ازاں بگذرید زیرا کہ ازیں سبب نبزد بندہ خود عبور نمودید پس گفتند بخوے کہ گفتی عمل نما پس ابراہیم بہ چادر نزد سارا شتافت و گفت تعجیل نمودہ سہ پیانہ آورد رقیق خمیر کردہ گردہا بر اجاج بیز پس ابراہیم بگلہ گاؤ شتافت و گوسالہ تر و تازہ خوے گرفتہ بخوانے داد کہ آن را بسرعت حاضر ساخت و کرہ و شیر با گوسالیکہ حاضر کردہ بود گرفت و در حضور ایشان گذاشت و نزد ایشان بزیر آن درخت ایستادہ تا خوردند۔ (کتاب پیدائش باب ۱۸ ورس ۸-۱)

پس آن دو ملک بوقت شام بسدوم در آمدند و لوط بدروازہ سدوم مے نشست و ہنگامے کہ لوط ملاحظہ کرد از برائے استقبال ایشان برخاست و بر زمین خم شد و گفت اینک حال اے آقایانم تمنا اینکه بخانہ بندہ خود تان بیائید و بیتوتہ نمودہ پائہائے خود را شست و شو نمائید و سحر خیزی نمودہ براہ خود روانہ شوید پس ایشان گفتند کہ نے بلکہ در چہار سو بیتوتہ مینایم پس چون کہ ایشان را بسیار ابرام نمود با او آمدہ بخانہ اش داخل شدند و او ضیافتے بجمہت ایشان بر پا نمودہ گردہائے فطیری پخت کہ خوردند۔ (کتاب پیدائش باب ۱۹ ورس ۱-۳)

تفسیر کبیر میں ایک یہ بحث پیش کی ہے کہ حضرت ابراہیم نے آن تینوں کو انسان جانا یا فرشتہ۔ جو لوگ کہتے کہ حضرت ابراہیم نے آن کو انسان جانا تھا آن کی یہ دلیلیں ہیں کہ اگر وہ ان کو فرشتہ جانتے تو کھانے کی تیاری نہ کرتے اور جب

انہوں نے کھانے پر ہاتھ نہ ڈالا تھا تو اس سے خوف نہ کرے ۔  
 علاوہ اس کے جب کہ حضرت ابراہیم نے ان کو انسان کی صورت  
 میں دیکھا تھا تو ان کو فرشتہ کیوں کر سمجھ سکتے تھے ۔

اور جو لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم نے ان کو فرشتہ  
 جانا تھا ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کے کہنے سے حضرت ابراہیم  
 نے ان کو فرشتہ جانا تھا ۔ مگر کوئی لفظ قرآن میں ایسا نہیں ہے کہ  
 ان تینوں شخصوں میں سے کسی نے کہا ہو کہ ہم انسان نہیں  
 ہیں بلکہ فرشتے ہیں اور انسان کی صورت بن کر آئے ہیں ۔

تفسیر کبیر میں ایک اور عجیب غریب روایت لکھی ہے کہ  
 جب ان فرشتوں نے حضرت ابراہیم کو بتلا دیا کہ وہ فرشتوں  
 میں سے ہیں اور انسان نہیں ہیں اور وہ صرف قوم لوط کے ہلاک  
 کرنے کو آئے ہیں تو حضرت ابراہیم نے ان سے معجزہ طلب کیا  
 کہ ان کے فرشتہ ہونے پر دلالت کرے ۔ پھر انہوں نے اپنے  
 پروردگار سے اس بھنے ہوئے بچھڑے کے زندہ ہو جانے کی دعا  
 مانگی ۔ پھڑا جہاں رکھا ہوا تھا وہاں سے کودا اور اپنے چراگاہ میں  
 چلا گیا ۔

ہم کو افسوس ہے کہ ہمارے علماء نے ایسی بے سروپا اور  
 بے سند مہمل روایتیں اپنی تفسیروں میں لکھی ہیں خدا ان پر  
 رحم کرے ۔

اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ وہ جو حضرت ابراہیم کے  
 پاس آئے انسان تھے اور قوم لوط کے پاس بھیجے گئے تھے جیسا کہ

---

۱۔ ان الملائكة لما اخبروا ابراهيم عليه السلام انهم الملائكة  
 لامن البشر وانهم جاوا لاهلاك قوم لوط طلب ابراهيم  
 عليه السلام منهم معجزة دالة على انهم من الملائكة  
 فدعوا ربهم باحياء العجل المشوى فطفر ذالك العجل  
 المشوى من الوضع الذى وضع فيه الى مرعاه ۔ (تفسیر کبیر)

خود انہوں نے حضرت ابراہیم سے کہا - لاتخف انا ارسلنا الی قوم لوط (سورہ ہود) اور دوسری جگہ کہا - انا ارسلنا الی قوم مجرمین (سورہ حجر) اور ایک جگہ کہا - انا ارسلنا الی قوم مجرمین لنرسل علیہم حجارة من طین مسومة عند ربک للمسرفین - (سورہ الذاریات)

بالبشری - یعنی ساتھ خوش خبری کے اور وہ خوش خبری حضرت ابراہیم کے حضرت سارا سے بیٹا اور پوتا یعنی اسحاق اور اسحاق سے یعقوب کے پیدا ہونے کی تھی جس کا بیان آگے آوے گا -

یعنی حضرت ابراہیم نے دیکھا کہ ان کا ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھا تو نہ جانا کہ یہ کون ہیں اور ابراہیم کے دل میں ان سے خوف پیدا ہوا<sup>۱</sup> -

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ جب انہوں نے کھانے سے اپنے تئیں روکا تو حضرت ابراہیم کو خوف ہوا کہ وہ کچھ مکر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں - جب کوئی انجان آدمی آوے اور اس کے سامنے کھانا لایا جاوے پھر وہ اگر کھا لیوے تو اس سے اطمینان ہو جاتا ہے اور اگر وہ نہ کھاوے تو اس سے خوف پیدا ہوتا ہے<sup>۲</sup> -

یہی مضمون سورہ الذاریات میں ان لفظوں سے آیا ہے کہ حضرت ابراہیم بھنا ہوا بچھڑا ان کے پاس لائے کہا کہ کیا تم نہیں کھاتے؟ یعنی جب انہوں نے اس پر ہاتھ نہ بڑھایا جیسا کہ

۱- فلما را ایدیہم لا تصل الیہ نکرہم و او جس منهم خیفہ - (سورہ ہود)

۲- فلما امتنعوا من الاکل خاف ان یریدوا بہ مکروہا ان لا یعرف اذا حضرو قدم الیہ طعام فان اکل حصل الا من وان لم یاکل حصل الخوف - (تفسیر کبیر)

سورہ ہود میں مذکور ہے تو حضرت ابراہیم نے کہا کہ کیا تم نہیں کھاتے؟ پھر حضرت ابراہیم کے دل میں آن سے خوف پیدا ہوا۔ ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم کے اس کہنے کے بعد الا تاكلون۔ آن لوگوں نے کھایا ہو اس لیے کھانے کی نفی اس سے نہیں پائی جاتی۔

سورہ الحجر میں اس واقعہ کو زیادہ اختصار سے بیان کیا ہے اور فرمایا ہے کہ جب وہ تینوں شخص ابراہیم کے پاس آئے تو انہوں نے کہا سلام۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ ہم تم سے خوف کرتے ہیں<sup>۱</sup>۔

پورا واقعہ یوں ہے کہ جب وہ تینوں شخص حضرت ابراہیم کے پاس آئے تو انہوں نے کہا سلام۔ حضرت ابراہیم نے بھی کہا سلام۔ پھر حضرت ابراہیم بھنا ہوا بچھڑا ان کے لیے کھانے کو لائے۔ جب انہوں نے کھانے کے لیے ہاتھ نہ بڑھایا تو حضرت ابراہیم کے دل میں خوف پیدا ہوا اس پر حضرت ابراہیم نے کہا کہ کیا تم نہیں کھاتے؟ اور یہ بھی کہا کہ ہم تم سے (نہ کھانے کے سبب) خوف کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم سے خوف نہ کرو ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے ہوئے ہیں اور تم کو بھی بشارت دیتے ہیں۔ پس ان تمام حالات سے نہ تو ان تینوں شخصوں کا فرشتہ ہونا پایا جاتا ہے اور نہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انہوں نے کھانا نہیں کھایا۔ بلکہ اس طرف قرینہ قیاس زیادہ ہے کہ ان اصراروں کے بعد انہوں نے کھانا کھایا ہو اور خدا تعالیٰ نے جو ان کو دو جگہ ضیف ابراہیم کر کے بیان کیا ہے یہ قرینہ قوی

۱۔ اذ دخلوا علیہ قالوا سلاما۔ قال انا منکم وجلون۔  
(سورہ الحجر)

ہے کہ انہوں نے کھانا بھی کھایا اور حضرت ابراہیم کی ضیافت قبول کی ۔

پھر خدا نے فرمایا کہ اس کی بیوی کھڑی تھی پھر ہنس پڑی پھر ہم نے اس کو خوش خبری دی اسحاق کے پیدا ہونے کی اور اس کے پیچھے یعنی اسحاق سے یعقوب کے پیدا ہونے کی ۔  
حضرت ابراہیم کی بیوی کے ہنسنے کی علت بیٹا ہونے کی بشارت تھی مگر جو کہ اُن کا ہنس پڑنا ایک مقدم امر اور زیادہ تر توجہ کے قابل تھا ۔ اس لیے معلول کو علت پر مقدم کر دیا ہے ۔

تفسیر کبیر میں بھی لکھا ہے کہ یہاں تقدیم و تاخیر ہے ۔ تقدیم کلام الہی کی یہ ہے کہ اس کی بیوی کھڑی تھی پھر ہم نے اس کو بشارت دی اسحاق کے پیدا ہونے کی اُس کی بیوی خوشی سے ہنسی ۔ بسبب اس خوش خبری کے ۔ پس ہنسنے کو مقدم کر دیا ہے اور معنًا وہ مؤخر ہے ۲ ۔

ایک امر غور طلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے پہلے فرمایا کہ لقد جاءت رسلنا ابراہیم بالبشریٰ ۔ یعنی وہ رسل بشارت لے کر آئے تھے اور پھر فرمایا فبشرنا ہا باسحاق یعنی ہم نے بشارت دی ۔ ابراہیم کی بیوی کو اسحاق کے پیدا ہونے کی ۔ اس جگہ بشارت کو خاص اپنی طرف منسوب کیا ہے اور سورة الحجر میں ضیف ابراہیم کا قول بیان کیا ہے کہ ”انا نبشرک بغلام

۱۔ و امراتہ قائمة فضحکت فبشرنا ہا باسحاق ومن وراء اسحاق یعقوب ۔ (سورہ ہود)

۲۔ ان هذا على التقديم والتاخير والتقدير وامرته قائمة فبشرنا ہا باسحاق فضحکت سرورا بسبب تلک البشارة فقدم الضحک ومعناه التاخير ۔ (تفسیر کبیر)

حَلِیم“ یعنی ابراہیم نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ ہم تجھ کو بشارت دیتے ہیں دانا لڑکے کے پیدا ہونے کی اور سورۃ الذاریات میں ہے ”و بشر وہ بغلام حلیم“ یعنی ضیف ابراہیم نے حضرت ابراہیم کو دانا لڑکے کے پیدا ہونے کی بشارت دی ؟

اور اسی طرح سورہ ہود میں ہے ۔ قالت یا اویلتیٰ الدوانا عجوز و هذا بعلى شیخا“ یعنی ابراہیم کی بیوی نے کہا کہ ”افسوس مجھ کو کیا میں جنوں کی اور میں بڑھیا ہوں اور میرا خصم بڑھا ہے ۔

اور سورۃ الذاریات میں ہے کہ حضرت ابراہیم کی بیوی حیرت میں ہو کر آگے بڑھی اور منہ پیٹ لیا اور کہا کہ بانجھ بڑھیا (یعنی کیا بانجھ بڑھیا بیٹا جنے گی) ۔

اور سورۃ الحجر میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے کہا کہ ”کیا تم مجھ کو بشارت دیتے ہو بنو جودیکہ مجھ پر بڑھاپا آ گیا ہے پھر کس طرح تم مجھ کو بشارت دیتے ہو“

مگر وہ تینوں شخص خدا کے بھیجے ہوئے تھے انھوں نے بذریعہ الہام یا وحی کے جو ان پر خدا نے بھیجی تھی یہ بشارت دی تھی ۔ قرآن مجید کا طرز کلام بہت جگہ اس طرح پر ہے کہ خدا تعالیٰ علما العلیل ہونے کی وجہ سے بندوں کے کاموں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اس لیے سورۃ ہود میں اس بشارت کو اپنی طرف نسبت کیا ہے کہ ہم نے بشارت دی اور مقاموں پر اپنے رسل

۱۔ فا قبلت امرته فی صرة فصکت وجھا وقالت عجوز عقیم ۔

(سورۃ الذاریات)

۲۔ قال البشر تمونى على ان منى الكير فيما تبشرون ۔

(سورۃ الحجر)

کی طرف منسوب کیا ہے۔ جن کے ذریعہ سے وہ بشارت دی گئی تھی مگر درحقیقت بشارت دینے والا خدا ہے۔

یہ بشارت جو حضرت ابراہیم کے حضرت سارا سے بیٹا پیدا ہونے کی تھی دونوں کو معاً بشارت تھی یعنی ایک بشارت دونوں کے لیے تھی اور دونوں نے اس کو سنا تھا اور اس لیے کبھی اس بشارت کو حضرت ابراہیم سے اور کبھی ان کی بیوی سے منسوب کیا ہے جو ضمناً اس بات کا ثبوت ہے کہ دونوں کے لیے یکساں بشارت ہے اور اسی سبب سے کہیں حضرت سارا کا قول نقل کیا ہے کہ ”انا عجوز و هذا بعلي شيخا“ اور کہیں حضرت ابراہیم کا قول نقل کیا ہے کہ ”ابشر تموني علي ان مسني الكبر“ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بشارت سن کر دونوں نے یہ بات کہی تھی۔

ان تینوں رسولوں نے جب حضرت سارا کا اس بشارت پر تعجب سنا تو انہوں نے کہا ”اتعجبين من امر الله“ یعنی کیا تو تعجب کرتی ہے حکم کے حکم سے اور حضرت ابراہیم کا تعجب سن کر انہوں نے کہا کہ ”ہم نے تجھ کو خوش خبری دی ہے۔ ٹھیک بس تو ناامیدوں میں سے مت رہو۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ کون شخص خدا کی رحمت سے ناامید ہوتا ہے بہ جز گمراہوں کے“۔

یہ خیال کرنا کہ حضرت ابراہیم و حضرت سارا کی اولاد مافوق الفطرت ہوئی تھی اس پر قرآن مجید سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

---

۱۔ بشر ناک بالحق فلا تکن من القانطین قال ومن یقنط من رحمة ربه الا الضالون۔ (سورۃ الحجر)



قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی نسبت لفظ شیخ آیا ہے اور لفظ شیخ ایسا نہیں ہے کہ اس سے یہ سمجھا جاوے کہ حضرت ابراہیم اس حد سے جس میں موافق قانون قدرت کے اولاد ہو سکتی ہے گذر چکے تھے۔

حضرت سارا کی نسبت لفظ عجوز آیا ہے اور عجوز کا لفظ اور شیخہ کا لفظ دونوں مرادف ہیں بلکہ کبھی جوان عورت پر بھی اطلاق ہوتا ہے۔ قاموس میں لکھا ہے والعجوز۔۔۔۔۔ المرأة شایبة کانت او شیخة اور یہی عجوز کا لفظ سورہ شعراء میں حضرت لوط کی بیوی کی نسبت آیا ہے پس اس لفظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت سارا ایسی حد پر پہنچ گئی تھیں جو موافق قانون قدرت کے ان سے اولاد ہونی ناممکن ہو۔

دوسرا لفظ حضرت مارا کی نسبت عقیم یعنی بانجھ کا آیا ہے۔ جن عورتوں کے ہاں ایک زمانہ تک جو بہ نسبت عام عادت کے زیادہ ہو اولاد نہیں ہوتی ان پر عادتاً عقیم کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ وہ اولاد جننے کے ناقابل ہوتی ہیں کیوں کہ بعض عورتیں اب بھی ایسی موجود ہیں جن کے مدت تک اولاد نہیں ہوئی اور وہ عقیم تصور ہونے لگیں۔ لیکن بڑی عمر میں جب کہ وہ شیخہ ہو گئیں ان کے اولاد ہوئی۔ ایک شوہر دار عورت کو میں جانتا ہوں کہ قریب چالیس برس کی عمر تک اس کے اولاد نہیں ہوئی بعد اس کے وہ حاملہ ہوئی اور بیٹی جنی بلاشبہ لوگوں کو اس کے حاملہ ہونے اور بیٹی جننے پر تعجب ہوا تھا۔

مسلمان مفسر جو بغیر غور کے یہودیوں کی روایتوں کی پیروی کرنے کے عادی ہو گئے اس لیے انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت مارا کی عمر اس قدر بڑی ہو گئی تھی کہ

آن سے اولاد کا ہونا ناممکن تھا اور اس لیے انہوں نے اس واقعہ کو بطور ایک معجزہ کے مافوق الفطرت قرار دیا ہے۔

توریت میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم کی ننانوے برس کی عمر تھی جب آن کا ختنہ ہوا۔ (کتاب پیدائش باب ۱۷ ورس ۲۴) اور ایک برس بعد وہ تین شخص بشارت دینے کو آئے تھے پس اُس وقت آن کی عمر سو برس کی تھی۔

اور سارا کی نسبت لکھا ہے کہ وہ سال خوردہ ہو گئی تھیں اور عورتوں کی عادت بند ہو گئی تھی۔ (کتاب پیدائش باب ۱۸ ورس ۱۱)

غرض کہ عبری توریت کے حساب سے بشارت کے وقت حضرت ابراہیم کی عمر سو برس کی تھی اور حضرت سارا کی نوے برس کی تھی مسلمانوں نے ان روایتوں کی پیروی کی اور حضرت اسحاق کا پیدا ہونا فوق الفطرت بطور معجزہ کے قرار دیا باوجودیکہ توریت ہی سے پایا جاتا ہے کہ اُس عمر میں بھی لوگوں کے بغیر کسی معجزہ تسلیم کیے اولاد ہوئی ہے۔ چنانچہ توریت کے حساب کے موافق جب حضرت اسماعیل پیدا ہوئے تھے تو حضرت ابراہیم کی عمر چھیاسی برس کی تھی اور جب حضرت یعقوب کے حضرت یوسف پیدا ہوئے ہیں تو مطابق حساب توریت عبری کے حضرت یعقوب کی عمر نوے برس کی تھی اور جب بنیامین یوسف کے بھائی پیدا ہوئے ہیں تو حضرت یعقوب کی عمر ایک سو ایک برس کی تھی۔ مسلمان مفسروں نے جو اس باب میں یہودیوں کی روایتوں کی پیروی کی ہے صریح غلطی کی ہے کیوں کہ ان زمانوں کی صحت پر جو توریت سے نکلتے ہیں نہایت شبہ ہے۔

مثلاً عبری توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم ۲۰۰۸ دنیوی میں یعنی سن ۱۹۹۶ قبل مسیح کے پیدا ہوئے تھے

اور یونانی توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۳۳۹۴ دنیوی میں پیدا ہوئے تھے اور سامری کی توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ سن ۲۳۰۹ دنیوی میں ہوئے تھے۔

حضرت سارا موافق توریت عبری کے سن ۲۰۱۸ دنیوی میں پیدا ہوئی تھی یعنی دس برس حضرت ابراہیم سے چھوٹی تھیں اور سن ۲۱۰۷ دنیوی میں بشارت ہوئی تھی جب حضرت ابراہیم ننانوے برس کے تھے اور حضرت سارا نواسی برس کی تھیں۔

مگر جب کہ توریت کے نسخوں میں اس قدر اختلاف ہے تو جو زمانہ ان سے نکلتا ہے بطور تخمینہ و انداز کے تصور ہو سکتا ہے نہ بطور ایسے یقین کے جس پر کوئی اس مافوق الفطرت بطور یقین کے مبنی ہو سکے۔

علاوہ ازیں جو زمانے توریت سے تسلیم کیے گئے ہیں ان میں بھی بدیہی غلطیاں ہیں جس کو مفصل بیان کرنے کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے علاوہ اس کے ایک نہایت بڑی بحث یہ ہے کہ برس جو توریت میں بیان ہوئے ہیں اور جن پر اس زمانے کے لوگوں کی عمر کا حساب بتلایا ہے ان کی مقدار کیا تھی کچھ شبہ نہیں ہے کہ مختلف زمانوں میں برس کی مقدار نہایت ہی مختلف رہی ہے اور اسی مقدار سے جس زمانہ میں جس کی عمر جتنے برس کی گئی جاتی تھی وہی تعداد توریت میں اور نیز بعض جگہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے اور یہ اس نہایت غور اور تحقیقات اور بیان کا محتاج ہے کیا عجب ہے کہ اگر خدا نے مدد کی اور توفیق دی تو تفسیر القرآن کے کسی مناسب مقام میں یا ایک جداگانہ رسالہ میں ہم اس کو بیان کریں گے اس مقام پر صرف اس قدر بیان کرنا کافی ہے کہ ہر گاہ قرآن مجید سے حضرت ابراہیم اور حضرت سارا کی وہ حالت جس میں مطابق قانون قدرت کے اولاد کا ہونا ناممکن ہو ثابت نہیں ہے تو

صرف یہودیوں کی روایتوں یا توریت کی استدلال پر اس کو ایک واقعہ فوق الفطرت یقین کرنا صحیح نہیں ہے ۔

اس کے آگے قرآن شریف میں آتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم کا ڈر جاتا رہا اور ان کو خوش خبری مل گئی اور ان کو حضرت لوط کی قوم پر عذاب نازل ہونے کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اس میں جھگڑنا شروع کیا <sup>۱</sup> ۔

اول یہ بحث ہے کہ حضرت ابراہیم کو قوم لوط پر عذاب نازل ہونا کس طرح معلوم ہوا ۔ (توریت باب ۱۸ ورس ۲۰ ، ۲۱ ، ۲۲ میں لکھا ہے کہ خداوند گفت چون فریاد سدوم و عموارہ زیادہ و گناہان ایشاں بسیار سنگین است پس فرود آمدہ خواہم دید کہ آیا بالکلیہ مثل فریادے کہ بمن رسیدہ است عمل نمودہ اند اگر چنین نہ باشد خواہم دانست و آن اشخاص توجہ نمودہ بسوے سدوم روانہ شدند ۔ جس لفظ کا ترجمہ خداوند کیا گیا ہے وہ لفظ یہوہ یا جہوہ ہے جو خدا کا نام ہے ۔ پس توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیم کو اس سے خبر دی تھی ۔ مگر قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی تین شخصوں نے جو بھیجے گئے تھے خبر دی تھی ۔

سورۃ الحجر میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے کہا پھر کیا ہے تمہارا کام اے بھیجے ہوؤں انہوں نے کہا کہ ہم بھیجے گئے ہیں گہنگار قوم کی طرف <sup>۲</sup> ۔

اور سورۃ الذاریات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے کہا پھر تمہارا کیا کام ہے اے بھیجے ہوؤ ۔ انہوں نے کہا کہ ہم بھیجے گئے ہیں گہنگار قوم کی طرف تاکہ ہم ڈالیں ان پر پتھر

۱۔ فلما ذهب عن ابراهيم الروح و جاءته البشرى يبادلنا في قوم لوط ۔ (سورہ ہود - آیت ۷۷)

۲۔ قال فما خطبكم ايها المرسلون قالوا انا ارسلنا الى قوم مجسين ۔ (سورۃ الحجر)

مٹی سے نشان کیے گئے ہیں۔ تیرے پروردگار کے نزدیک حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے<sup>۱</sup>۔

دوسری اس پر یہ بحث ہے کہ حضرت ابراہیم نے کس سے بحث شروع کی اس آیت میں ”نا“ کی ضمیر خدا کی طرف ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا سے بحث بمبنی التجا شروع کی۔ توریت باب ۱۸ ورس ۲۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بحث خدا ہی سے ہوئی تھی۔ کیوں کہ اس میں لکھا ہے کہ اُن اشخاص کے سدوم کو چلے جانے کے بعد ”در حالیکہ ابراہیم در حضور خداوند مے ایستاده پس ابراہیم تقرب جستہ گفت الخ۔“

مگر ہمارے علمائے مفسرین لکھتے ہیں کہ یجادلنا سے مراد یجادل رسلنا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں جو بحث لکھی ہے وہ نہایت مختصر اور ایک امر کی نسبت ہے اور توریت میں جو لکھی ہے وہ نہایت لمبی ہے ممکن ہے کہ جو بات قرآن مجید میں ہے وہ ان تین شخصوں سے ہوئی ہو اور جس مجادلہ کا ذکر سورہ ہود میں ہے اور یجادلنا کے لفظ سے بیان ہوا ہے وہ التجا خدا ہی سے ہو۔

سورہ ہود میں تو مجادلہ کا کچھ بیان نہیں ہے اور سورۃ الحجر میں صرف اس قدر ہے کہ اُن تین شخصوں نے کہا کہ ہم بھیجے گئے ہیں گنہگار قوم کی طرف بہ جز آل لوط کے یعنی کہ وہ گنہگار قوم میں نہیں ہیں۔ ہم بیشک اُن سب کو بچانے والے ہیں بہ جز اُس کی جو رو کے ہم نے ٹھیرا دیا کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں ہے<sup>۲</sup>

---

۱۔ قال فما خطبکم ایہا المرسلون قالوا انا ارسلنا الی قوم مجرمین لندرسل علیہم حجارة من طین مسومة عند ربک للمسرفین۔ (سورۃ الذاریات)

۲۔ قالو انا ارسلنا الی قوم مجرمین الا آل لوط انا المنجوہم اجمعین الا امراتہ قدرنا انہا لمن الغابریں۔ (سورہ ہود)

اور سورہ عنکبوت میں ہے کہ اُن تین شخصوں نے جو حضرت ابراہیم کے پاس آئے تھے کہا کہ ہم بیشک اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس بستی کے رہنے والے ظالم ہیں۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ اُس میں تو لوط بھی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم جانتے ہیں اُس کو جو اُس میں ہے البتہ بچا دیں گے ہم اس کو اور اس کے لوگوں کو بجز اُس کی جورو کے وہ ہے پیچھے رہنے والوں میں سے<sup>۱</sup>۔

اور سورہ الذاریات میں ہے کہ اُن تین شخصوں نے کہا کہ ہم بھیجے گئے ہیں گنہگار قوم کی طرف تاکہ ہم ڈالیں اُن پر پتھر مٹی سے، نشان کیے گئے تیرے پروردگار کے نزدیک حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے۔ پھر ہم نے اُس کو نکال لیا جو اس میں ایمان والوں میں ہے اور پھر ہم نے اُس میں نہیں پایا سوائے ایک گھر کے مسلمانوں میں سے اور ہم نے اُس میں ایک نشانی چھوڑ دی اُن لوگوں کے لیے جو دکھ دینے والے عذاب سے ڈرتے ہیں<sup>۲</sup>۔

ان آیتوں میں تو حضرت ابراہیم کا صرف حضرت لوط کی نسبت سوال کرنا معلوم ہوتا ہے مگر ان آیتوں میں جو ایک مشکل ہے وہ یہ ہے کہ ان آیتوں میں جو الفاظ انا لمنہم جوہم یعنی

---

۱۔ قالوا انا مهلكوا هذه القرية ان اهلها كانوا ظالمين قال ان فيها لوطا قالوا نحن اعلم لمن فيها الننجينه واهله الا امراته انت من الغابرين - (سورہ عنکبوت)

۲۔ قالو انا ارسلنا الى قوم مجرمين لندرسل عليهم حجارة من طين مسومة عند ربك للمسرفين فاخرجنا فيها من المومنين فما وجدنا فيها غير بيت المسلمين و تركنا فيها آية للذين يخافون العذاب الاليم - (سورہ الذاریات)

بیشک ہم اُن سب کو بچانے والے ہیں انا مہملہ کوا هذه القرية  
یعنی ہم بیشک اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں -  
لنرسل علیہم حجارة یعنی تاکہ ہم ڈالیں ان پر پتھر -  
فاخرجنا پھر ہم نے لوط کو نکال لیا - فما وجدنا فیہا -  
یعنی ہم نے بجز ایک گھر مسلمان کے اور نہ پایا - و ترکنا فیہا  
اور چھوڑی ہم نے اُس میں نشانی اور مثل اُس کے اور چند الفاظ  
ہیں کہ اُس پر مقتدرانہ کہنا نہ رسولوں کے اختیار میں ہے نہ  
فرشتوں کے بلکہ یہ مقتدرانہ کام صرف خدا کی قدرت میں ہیں نہ  
کسی بندے کے خواہ رسول ہوں یا انسان یا فرشتے -

اس کی نسبت تمام مفسرین نے لکھا ہے کہ ان تمام مقتدرانہ  
کاموں کو جو اُن تین شخصوں نے اپنی طرف نسبت کیا ہے جو خدا  
کے کام ہیں - اس لیے کیا ہے کہ خدا سے اُن کو تقرب و خصوصیت  
حاصل تھی<sup>۱</sup> -

مگر میں اس توجیہ کو تسلیم نہیں کرتا - کوئی بندہ ایسے  
مقتدرانہ کام اپنی نسبت منسوب نہیں کر سکتا - اس قصہ کو خدا  
نے حکایۃً بیان کیا ہے جس میں ان تین شخصوں کے اقوال اور خدا  
کے مقتدرانہ افعال دونوں شامل بیان ہوئے ہیں - پس وہ تمام  
ضمیریں اور مقتدرانہ الفاظ خدا کی طرف ہیں نہ اُن تین شخصوں  
کی طرف -

اُس کا ثبوت خود قرآن مجید کی ایک آیت سے ہوتا ہے جس  
میں بلا ذکر اُن تین شخصوں کے اُن مقتدرانہ امور کو خدا نے  
خاص اپنی طرف منسوب کیا ہے - سورۃ قمر میں خدا نے  
فرمایا ہے - یعنی جھٹلایا لوط کی قوم نے ڈرانے والوں کو بیشک

۱ - اسنادہم ایاء الی انفسہم و هو فعل اللہ تعالیٰ لما لہم  
من القرب والا اختصاص بہ - (تفسیر امضادی)

ہم نے پہنچائی اُن پر پتھروں کی بوجھاڑ بجز لوط کے لوگوں کے ہم نے اُن کو بچایا۔ صبح کے وقت اپنے پاس سے انعام کر کے اسی طرح ہم بدلا دیتے ہیں اُس کو جو شکر کرتا ہے اور بیشک اُن کو ڈرایا تھا ہمارے عذاب سے، پھر اُنہوں نے تکرار کی ڈرانے والوں سے اور بیشک اُنہوں نے دند بچائی اُس یعنی لوط کے مہمانوں سے پھر بیکار کر دیں ہم نے اُن کی آنکھیں پھر وہ چکھیں میرا عذاب اور میرے ڈرانے والوں کا اور بے شبہ گھبر لیا اُن کو بہت سویرے جگہ پر قائم رہنے عذاب نے پھر چکھیں میرا عذاب اور میرے ڈرانے والوں کا۔

توریت میں ایک اور مجادلہ کا یعنی التجا کا ذکر لکھا ہے جو ابراہیم نے خدا سے کی تھی اور سورہ ہود میں جو مجادلہ لنا فی قوم لوط آیا ہے اور وہ مجادلہ بیان نہیں کیا۔ کیا عجب ہے کہ اس سے وہی مجادلہ یا التجا مراد ہو جس کا ذکر توریت میں ہے مفسرین بھی اُس لفظ سے یہی مجادلہ بمعنی التجا سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہم فارسی ترجمہ توریت کا اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

و آن اشخاص از آں جا توجہ نموده بسوئے سدوم روانہ شدند در حالتیکہ ابراہیم در حضور خدا وندمے ایستاده پس ابراہیم تقرب جستہ گفت کہ آیا حقیقۃً صالح را با طالح ہلاک خواہی ساخت احتمال دارد کہ در اندرون شہر پنجاہ نفر صالح باشند آیا بشود کہ آن مکان را ہلاک سازی و بسبب آن پنجاہ نفر صالحے کہ در اندرونش

---

۱۔ کذبت قوم لوط بالنذر انا ارسلنا علیہم حاصبا الا آل لوط نجینا ہم بسحر نعمة من عندنا کذالک نجزی من شکر ولقد انذرہم بطشتنا فتہاروا بالنذر ولقد راودوہ عن ضیغہ فطمسنا اعینہم فذوقوا عذابہ ونذر ولقد صبحہم بکرة عذاب مستقر فذوقوا عذابی و نذر۔  
(سورہ قمر)



مے باشند نجات یدھی حاشا از تو کہ مثل ابن کارے کنی و صالحان را با طالحان ہلاک سازی و صالح با طالح مساوی باشد حاشا از تو آیا میشود کہ حاکم تمامی زمین عدالت نکند پس خداوند گفت اگر درمیان شہر سدوم پنجاہ نفر صالح پیدا بکنم تمامی اہل آن مکان را بسبب ایشان نجات خواہم داد و ابراہیم در جواب گفت اینک حال منکہ خاک و خاکستر ستم آغاز تکلم نمودن باقائم مے نمایم بلکہ از پنجاہ نفر صالح پنج نفر کمی نمایند آیا میشود کہ تمامی اہل شہر را بہ سبب آن پنج نفر ہلاک سازی پس گفت اگر در آنجا چہل و پنج نفر یابم ہلاک نخواہم کرد و بار دگر باو متکلم شدہ گفت بلکہ در آن چہل نفر یافتہ شود پس او گفت کہ بہ سبب چہل نفر آن عمل نخواہم نمود و او گفت تمنا اینکہ آقائم غضبناک نشود کہ تکلم نمایم بلکہ در آن سی نفر یافتہ شوند - او گفت اگر در اینجا سی نفر پیدا بکنم آن عمل نخواہم نمود دیگر گفت اینک حال آغاز تکلم با آقائم نمودہ ام بلکہ در آنجا بست نفر یافتہ شود او گفت کہ بہ سبب بست نفر ہلاک آن نخواہم کرد و دیگر گفت تمنا اینکہ آقائم غضب ناک نشود تا آن کہ یک بار دیگر تکلم نمایم بلکہ در آنجا دہ نفر پیدا شود و گفت کہ بسبب دہ نفر ہلاک شان نخواہم گردد و خداوند ہنگامے کہ کلام را با ابراہیم انجام رساندہ بود روانہ شد و ابراہیم بمکانش رجعت نمود - (کتاب پیدائش باب ۱۸ ورس ۲۲ لغایت ۳۳)

ولما جاءت رسلنا لوطا - اب یہاں سے حضرت لوط کا قصہ شروع ہوا مگر یہاں آس قصہ کے اخیر کا بیان ہے - شروع قصہ اور سورتوں میں بیان ہوا ہے - توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط جب مصر سے واپس آئے تو علیحدہ علیحدہ ہو گئے حضرت ابراہیم کنعان میں رہے اور حضرت لوط اردن کے

میدان میں جو نہایت سرسبز و شاداب و زرخیز خطہ تھا اور جہاں سدوم و عمو راہ و اوماد زبوتیم کی بستیاں تھیں چلے گئے۔  
 اُس زمانہ میں اُن تمام ملکوں میں طوائف الملوکی تھی اور آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں ایک لڑائی میں حضرت لوط قید ہو گئے حضرت ابراہیم نے فوج جمع کر کے پانچ بادشاہوں سے مقابلہ کیا اور حضرت لوط کو اور سدوم والوں کو چھڑایا۔ یہ واقعہ عبری توریت کے حساب سے سن ۲۰۹۲ دنیوی میں یا سن ۱۹۱۲ قبل مسیح ہوا تھا۔

غرض کہ حضرت لوط سدوم میں رہتے تھے جہاں کے لوگ نہایت بدکار تھے۔ حضرت لوط نے اُن سے کہا کہ میں خدا کا رسول ہوں میری اطاعت کرو اور جو بد باتیں اُن میں تھیں اُن کے چھوڑنے کی نصیحت کی۔

سورہ شعرا میں خدا فرماتا ہے کہ 'جھٹلایا لوط کی قوم نے رسولوں کو جب کہ اُن سے کہا اُن کے بھائی لوط نے کہ کیا تم نہیں ڈرتے بیشک میں تمہارے لئے رسول ہوں۔ رسالت مجھے سپرد ہے پھر ڈرو اللہ سے اور میری اطاعت کرو اور میں تم سے اُس پر

---

۱۔ کذبت قوم لوط المرسلین اذ قال لهم اخوهم لوط الا تتقون انا لکم رسول امین فاتقوا الله واطيعون وما اسئلكم عليه من اجران انا لعلی رب العالمین۔ اتاتون الذکران من العالمین و تذرون وما خلق لکم ربکم من ازواجکم بل انتم قوم عادون۔ قالوا لئن لم تنته یا لوط لتکونن من المخرجین قال انا لعلمکم من القالین رب بخی و اہلی مما یعملون فنجیناہ و اہلہ اجمعین الا عجزوا فی الغابریں ثم دمرنا الاخرین و اسطرنا علیہم مطر فساء مطر المنذرین۔ (۲۶۔ الشعراء ۶۰، لغایت ۱۷۳)

کچھ بدلا نہیں مانگتا۔ میرا بدلا دینا کسی پر نہیں ہے بجز عالموں کے پروردگار پر، کہا تم مردوں کے پاس آتے ہو جو دنیا میں ہیں اور چھوڑتے ہو اس کو جسے پیدا کیا ہے تمہارے لیے تمہارے پروردگار نے تمہاری جوروؤں میں سے بلکہ تم ایک قوم ہو حد سے بڑھ جانے والی۔ انہوں نے کہا کہ اے لوط اگر تو بس نہ کرے گا تو بیشک نکالے گیوں میں سے ہوگا۔ لوط نے کہا کہ بیشک میں تمہارے کام کے دشمنوں میں سے ہوں۔ اے پروردگار مجھ کو اور میرے لوگوں کو اس کام سے جو وہ کرتے ہیں (یعنی اس کے وبال سے) نجات دے۔ پھر نجات دی ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو بجز ایک ادھیڑ عورت یعنی لوط کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی پھر ہلاک کر دیا ہم نے اوروں کو اور برسایا ہم نے ان پر مینہ ایک قسم کا پھر ڈرائے گیوں پر مینہ برا ہے<sup>۱</sup>۔

اسی طرح سورہ نمل میں خدا نے فرمایا ہے کہ ہم نے لوط کو بھیجا۔ جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم یحیائی کا کام کرتے ہو اور تم دیکھتے ہو کیا تم بری خواہش سے عورتوں کے سوا مردوں کے پاس آتے ہو بلکہ تم جاہل قوم ہو پھر کچھ نہ تھا اس کی قوم کا جواب بجز اس کے کہ انہوں نے کہا کہ لوط کے لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو یہ لوگ پاک بننا چاہتے ہیں پھر بچا دیا

---

۱۔ ولوطا اذ قال لقومه اتاتون الفاحشة و انتم تبصرون  
 ء انکم لتاتون الرجال شهوة من دون النساء بل انتم  
 قوم تجهلون فما کان جواب قومه الا ان قالوا اخرجوا آل  
 لوط من قريتکم انهم اناس یتسطمرون فانجیناه واهله  
 الا امراته قدرنا هامن الغابرين واسطرنا علیهم مطرا  
 فساء مطر المنذرین - (۲۷ - نمل - ۵۵ لغایت ۵۹)

ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو بجز اس کی جورو کے ہم نے اس کے لیے ٹھہرا دیا تھا کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہے اور برسایا ہم نے ان پر ایک قسم کا مینہ پھر ڈرائے گیوں پر مینہ برا ہے<sup>۱</sup>۔

اور سورہ اعراف میں ہے اور بھیجا ہم نے لوط کو جس وقت کہ اس نے کہا کہ اپنی قوم کو کیا تم فحش کام کرتے ہو کہ اس کو تم سے پہلے کسی ایک نے بھی جہان کے لوگوں سے نہیں کیا۔ بیشک تم مردوں کے پاس آتے ہو شہوت رانی کو عورتوں کے سوا۔ ہاں تم ایک قوم ہو حد سے گزری ہوئی اور نہ تھا ان لوگوں کا جواب بہ جز اس کے کہ انہوں نے کہا نکال دو ان کو اپنی بستی سے بیشک وہ آدمی ہیں اپنے تئیں پاک بنانے والے پھر نجات دی ہم نے اس کو اور اس کے لوگوں کو بہ جز اس کی عورت کے کہ وہ تھی پیچھے رہنے والوں میں اور برسایا ہم نے ان پر برسانا پھر دیکھ کیا ہوا انجام گنہگاروں کا۔

اسی طرح سورہ عنکبوت میں خدا نے فرمایا ہے کہ<sup>۲</sup> بھیجا ہم

---

۱۔ وَلَوْطَا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اتَاتُونِى الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِيْنَ - اَنُكُم لَتَاتُونِى الرِّجَالَ شَهْوَةً مِنْ دُونِ النِّسَاءِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّصْرِفُونَ - وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ اِلَّا اَنْ قَالُوا اَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ اَنَّهُمْ اَنَاسٌ يَنْتَظِرُوْنَ فَاَنْجَيْنَاهُ وَاَهْلَهُ اِلَّا امْرَاَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِيْنَ وَاَسْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطْرًا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ - (۷ - الاعراف - ۷۸ - لغایت ۸۲)

۲۔ وَلَوْطَا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اَنُكُم لَتَاتُونِى الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِيْنَ اَنُكُم لَتَاتُونِى الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاتُوْنَ فِىْ نَادِيْكُمْ الْمُنْكَرَ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ اِلَّا اَنْ قَالُوا اَتْتَنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اَنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ قَالَ رَبِّ اَنْصُرْنِىْ عَلٰى الْقَوْمِ الْمَفْسِدِيْنَ - (سورہ عنکبوت)

نے لوط کو جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ البتہ تم بے حیائی کا کام کرتے ہو کہ تم سے پہلے کسی نے دنیا کے لوگوں میں سے نہیں کیا۔ کیا یہ ٹھیک بات ہے کہ تم مردوں کے پاس آتے ہو اور رستہ لوٹتے ہو اور اپنی مجلسوں میں برے کام کرتے ہو۔ پھر اُس کی قوم کا کچھ جواب نہ تھا بجز اس کے کہ آنہوں نے کہا کہ ہمارے لیے خدا کا عذاب لا اگر تو سچا ہے لوط نے کہا اے پروردگار میری مدد کر ظالم قوم پر۔

غرض کہ حضرت لوط اُن کو بری باتوں کے چھوڑنے کی نصیحت کرتے تھے۔ اس عرصہ میں یہ تینوں رسول جو حضرت ابراہیم کے پاس آئے تھے وہاں پہنچے۔ حضرت لوط اُن کے آنے سے کبیدہ خاطر اور ان کے سبب سے دل تنگ ہوئے اور کہا کہ آج کا دن نہایت سخت ہے۔

یہی مضمون سورہ عنکبوت میں ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ جب آئے ہمارے رسول لوط کے پاس تو اُن کے آنے سے کبیدہ خاطر اور اُن کے سبب سے دل تنگ ہوا۔ آنہوں نے کہا کہ مت ڈر اور غمگین مت ہو بے شک ہم تجھ کو اور تیرے لوگوں کو بچاویں گے۔ بہ جز تیری جو رو کے کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے اور ہم اُتارنے والے ہیں اس بستی کے لوگوں پر عذاب آسمان سے اس لیے کہ وہ بدکاری کرتے ہیں اور بے شک ہم نے جھوڑا اُس بستی کا نشان ظاہر واسطے اُن لوگوں کے جو سمجھتے ہیں۔

---

۱۔ ولما ان جاءت رسلنا لوط سئى بهم وضاق بهم ذرعاً قالوا  
الا تخف ولا تحزن انا منجوك واهلك الا امراةك كانت من الغابرين  
انا ننزلون على اهل هذا القرية رجلاً من السماء بما كانوا  
يفسقون ولقد تركنا منها آية بينة لقوم يعقلون۔  
(عنکبوت)

یہی مضمون سورہ حجر میں ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ<sup>۱</sup> جب لوط کے لوگوں کے پاس وہ رسول آئے تو کہا تم انجان لوگ ہو آنہوں نے کہا کہ ہاں ہم تیرے پاس وہ لائے ہیں جس میں وہ شبہ کرتے تھے اور ہم تیرے پاس سچائی سے آئے ہیں اور بیشک ہم سچے ہیں۔ اُن تینوں شخصوں یا رسولوں کے آنے کی خبر پا کر حضرت لوط کی قوم کے لوگ دوڑ پڑے یعنی حصرت لوط کا مکان گھیر لیا۔

یہی مضمون مگر اس سے کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھ سورہ حجر میں آیا ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ شہر کے لوگ خوشی کرتے ہوئے آئے یعنی لوط کے گھر پر اس کا گھر گھیر کر جو لوگ اس کے گھر میں آئے تھے ان کے گرفتار کر لینے کے لیے۔ حضرت لوط نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں پھر اُن کو فضیحت مت کرو اور خدا سے ڈرو اور مجھ کو ذلیل مت کرو۔ اُن لوگوں نے کہا کہ کیا ہم نے تجھ کو منع نہیں کیا تھا دنیا کے لوگوں سے (یعنی دوسرے ملک کے لوگوں سے ملنے اور بلانے اور اپنے ہاں رکھنے سے)۔ لوط نے کہا یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو (یعنی اگر تم میرے مہمانوں کو پکڑنا چاہتے ہو)۔ قسم ہے تیری زندگی کی کہ بے شک وہ اپنی گمراہی میں اندھے ہو رہے تھے۔ پھر جا لیا اُن کو ہولناک آواز نے سورج نکلتے ہوئے۔ پھر ہم نے شہر کی بلندی کو نیچان میں ڈال دیا اور ہم نے اُن پر آگ میں پکے ہوئے مقدر کیے ہوئے پتھر برسائے۔ بیشک اُس

---

۱۔ فلما جاء لوط المرسلين قال انكم قوم منكرون قالوا بل جئناك بما كانوا فيه يمترون واآتيناك بالحق وانا لصادقون۔  
(سورة الحجر)

میں نشانیاں ہیں عبرت پکڑنے والوں کو<sup>۱</sup>۔

اور سورۃ قمر میں فرمایا ہے کہ جھٹلایا لوط کی قوم نے ڈرانے والوں کو بے شک ہم نے بھیجی اُن پر پتھروں کی بوجھاڑ بہ جز لوط کے لوگوں کے ہم نے اُن کو بچایا صبح کے وقت اپنے پاس سے انعام کر کے اسی طرح ہم بدلا دیتے ہیں اُن کو جو شکر کرتا ہے اور بے شک اُن کو ڈرایا تھا ہمارے عذاب سے۔ پھر اُنہوں نے تکرار کی ڈرانے والوں سے اور بے شک اُنہوں نے دند بچائی اُس کے یعنی لوط کے مہمانوں سے پھر بے کار کر دیں ہم۔ اُن کی آنکھیں پھر وہ چکھیں میرے عذاب اور میرے ڈرانے والوں کا اور بے شبہ گھیر لیا اُن کو بہت سویرے جگہ پر قائم رہنے والے عذاب نے پھر چکھیں میرا عذاب اور میرے ڈرانے والوں کا<sup>۲</sup>۔

سورہ ہود کی اور ان سورتوں کی جن کا ہم نے ذکر کیا تمام آیتوں پر غور کرنے کے بعد تین امور بحث طلب معلوم ہوتے ہیں۔  
اول۔ سدوم والوں نے کیوں حضرت لوط کا گھر گھیرا اور مہمانوں کو پکڑنا چاہا۔

۱۔ وجاء اهل المدينة يستبشرون قال ان هولاء ضيفى فلا تفضحوا واتقوا الله ولا تخزون قالوا اولم ننهك عن العالمين قال هولاء بناتى ان كنتم فاعلمين لعمرک انهم لفي سكرتهم يعمهون فاخذتهم الصيحة مشرقين فجعلنا عاليها سافلها وامطرنا عليهم حجارة من سجيل ان في ذالك المتوسمين (سورة - حجر)

۲۔ كذبت قوم لوط بالنذر انا ارسلنا عليهم حاصبا الا آل لوط نجينا هم بسحر نعمة من عندنا كذلك نجزي من شكر ولقد انذرهم بطشتنا فتاروا بالنذر ولقد راودوه عن ضيفه فطمسنا اعينهم فذوقوا عذابى و نذر (۵۴) القمر  
۳۳ لغايته لغایت (۳۹)

دوم - ہولاء بنساقی ان کنستم فاعلین سے کیا مطلب ہے -  
 سوم - جو عذاب نازل ہوا وہ کیا تھا اور کیوں کر تھا اور سورہ قمر میں جو فیتطمسنا اعینہم ہے اُس کا کیا مطلب ہے -

امر اول کی نسبت علمائے مفسرین کا یہ خیال ہے کہ وہ رسول جن کو آنہوں نے فرشتے قرار دیا ہے نہایت خوب صورت مرد بن کر آئے تھے اور جب وہ حضرت لوط کے گھر میں آئے تو اُن کی بیوی نے لوگوں سے جا کر کہہ دیا کہ ہمارے گھر میں ایسے خوب صورت لوگ آئے ہیں کہ اُن سے زیادہ خوب صورت دیکھنے میں نہیں آئے اُن سے زیادہ اچھے کپڑے پہنے کوئی نہیں ہے اور نہ زیادہ خوش بو والا ہے - یہ سن کر لوط کی قوم اُن پر دوڑ پڑی اور خدا کے اس کلام سے کہ وہ بدکاری کیا کرتے تھے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا دوڑ پڑنا بدکاری کے لیے تھا -

مگر میرے نزدیک یہ تفسیر صحیح نہیں ہے اور نہ اس کی تفسیر کی بنیاد کسی معتبر روایت پر ہے بلکہ صرف یہودی روایت پر مبنی ہے - خدا کے اس کلام پر کہ ومن قبل یعملون السیات وہی ایک عمل خاص مراد لینا بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ وہ لوگ بہت سے اور بھی گناہ کرتے تھے لوط مار کرتے تھے اپنی مجلسوں میں خراب کام کرتے تھے جیسا کہ سورہ عنکبوت میں بیان ہوا ہے پس ”ومن قبل یعملون السیات“ کے عام معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ حضرت لوط کا گھر گھیر لینا اور شورہ پستی کرنا اُن کے لیے کوئی عجیب بات نہیں تھی کیوں کہ وہ پہلے ہی شریر و بد ذات و برے کام کرنے والے تھے -

اس باب میں ہم کو قیاسات و ظنیات پر گھر گھیر لینے کا



سبب بیان کرنا ضرور نہیں ہے کیوں کہ خود قرآن مجید میں اس کی تصریح موجود ہے سورۃ الحجۃ میں خدا نے فرمایا ہے کہ جب اس شہر کے لوگ خوشی خوشی دوڑے آئے تو لوط نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں ان کو فضیحت مت کرو تو شہر کے لوگوں نے کہا کہ ہم نے تجھ کو منع نہیں کیا تھا دنیا کے لوگوں سے '۔

جس زمانہ میں حضرت لوط سدوم میں جا کر رہے ہیں اس زمانہ میں طوائف الملوکی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا حاکم یا بادشاہ جدا جدا تھا۔ سدوم کی بھی ایک چھوٹی سی سلطنت جدا تھی۔ صاف صاف قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت لوط وہاں جا کر رہے تو وہاں کے لوگوں نے منع کر دیا تھا کہ تم اور لوگوں سے راہ و رسم و آمیزش نہ رکھنا پس جب کہ یہ اجنبی شخص حضرت لوط کے گھر میں آئے ان لوگوں نے آکر گھیر لیا کہ یہ اجنبی شخص کون ہیں اور ان کو گرفتار کر لینا چاہا۔ حضرت لوط نے کہا کہ یہ میرے مہمان ہیں ان کو مت پکڑو۔ مفسرین کی عادت یہودیوں کی تقلید کرنے کی ہو گئی ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کے الفاظ اولم ننہک عن العالمین پر خیال نہیں کیا اور جو کچھ یہودیوں کی روایتوں میں تھا اسی کو قرآن مجید کی تفسیر میں لکھ دیا۔

دوسرے امر کو بھی مفسرین نے اپنے خیال کے موید سمجھا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت لوط نے کہا کہ جس بد خیال سے تم میرے مہمانوں کو لینا چاہتے ہو ان کے بدلے میں میری بیٹیاں لے لو اور جو کرنا چاہتے ہو ان کے ساتھ کرو۔ پھر مفسرین

---

۱۔ وجاء اهل المدينة يستبشرون قال ان هولاء ضيفي فلا تفضحون و اتقوا الله لا تخزون قالوا اولم ننہک عن العالمین۔  
(سورۃ الحجۃ)

کو اس تفسیر کے قرار دینے کے بعد مشکل پیش آئی ، بعضوں نے کہا کہ بناتی سے مراد حضرت لوط کی اصلی بیٹیاں ہیں۔ اُس پر یہ مشکل پیش ہوئی کہ وہ کیوں کر اُن کو ایسا کام کرنے کے لیے دیتے تھے۔ اُس پر یہ قرار دیا کہ مطلب یہ تھا کہ بعد نکاح کے اُن کے ساتھ جو چاہو کرو۔ بعضوں نے کہا کہ بناتی سے لوط کی اُمّت کی بیٹیاں مراد ہیں کیوں کہ پیغمبر بمنزلہ باپ کے ہے اور اُس کی اُمّت کی عورتیں بمنزلہ اُس کی بیٹیوں کے ہیں۔

مگر یہ تفسیر محض غلط ہے جس کی بنا توریت کی متزلزل روایتوں پر مبنی ہے۔ حالانکہ خود توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں غلطی ہے۔ غالباً یہ بات صحیح ہے کہ حضرت لوط کی دو بیٹیاں تھیں۔ توریت میں بھی مذکور ہے کہ حضرت لوط نے ان لوگوں سے جنہوں نے گھر گھیر لیا تھا یہ کہا کہ۔ حالانکہ مرا دو دختریت کہ مردے را ندانستہ اند تمنا اینکه ایشاں را بہ شا بیرون آورم وبا ایشاں آنچه در نظر شا پسند است بکنید۔ (کتاب پیدائش باب ۱۹ ورس ۸)

حالانکہ توریت ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوط کی بیٹیوں کی شادی ہو چکی تھی اور اُن کے شوہر موجود تھے چنانچہ توریت میں اسی قصہ کے بیان میں لکھا ہے کہ پس لوط بیرون رفته و بہ داماد هائش کہ دخترانش را بنکاح آورده بودند متکلم شدہ گفت (کتاب پیدائش باب ۱۹ ورس ۱۴) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن عورتوں کو حضرت لوط نے بیٹیاں کہا وہ اُن کی صلیبی بیٹیاں نہ تھیں۔

بنث اور بنوٹ کا لفظ عبری زبان میں عام عورتوں پر بولا جاتا ہے جیسا کہ کتاب امثال سلیمان باب ۳۱ ورس ۲۹ میں استعمال ہوا ہے۔ پس توریت میں جو لفظ بنوٹ اور قرآن مجید میں

لفظ بناتی آیا ہے اس سے ایسی عورتیں مراد ہیں جو حضرت لوط کے ہاں کسی تعلق سے موجود تھیں اور کیا عجب ہے کہ لونڈیاں ہوں۔ کیوں کہ حضرت ابراہیم اور حضرت لوط جب مصر سے واپس آئے ہیں تو متمول اور مالک مویشی و صاحب لونڈی و غلام کے تھے۔

اس بات کی تردید کہ حضرت لوط نے ان لوگوں سے جنہوں نے ان کا گھر گھیر لیا تھا یہ کہا تھا کہ جس بد خیال سے تم میرے مہمانوں کو پکڑنا چاہتے ہو اس کے بدلے میری بیٹیاں لے لو اور ان کے ساتھ جو چاہو سو کرو خود قرآن مجید سے ثابت ہوتی ہے۔

اول یہ کہ قرآن سے پایا جاتا ہے کہ قوم لوط عورتوں کے ساتھ بھی اسی قسم کی بد فعلی کرتی تھی جیسے کہ مردوں کے ساتھ کرتی تھی۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ وہ لوگ مردوں کے پاس یعنی لونڈوں کے پاس جاتے تھے اور جو روؤں میں بھی جو طریقہ کہ ان کے لیے خدا نے پیدا کیا ہے اس کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ یعنی خلاف فطرت انسانی اپنی جو روؤں کے ساتھ بھی بد فعلی کرتے تھے۔ پس کیا حضرت لوط ان عورتوں کو خواہ وہ ان کی بیٹیاں ہوں یا اور کوئی اس لیے ان کو حوالے کرتے تھے کہ جس طرح وہ مردوں کے ساتھ بد فعلی کرتے ہیں اس کے بدلے ان کے ساتھ بد فعلی کریں۔ نعوذ باللہ حاشا وکلا۔

دوسرے یہ کہ جب حضرت لوط نے کہا کہ یہ میری اچھی بیٹیاں تمہارے لیے ہیں ان کو ماخوذ کر لو اور میرے مہمانوں کو ذلیل مت کرو۔ تو ان لوگوں نے کہا کہ تو واقف ہے کہ ہم

---

۲۔ اتاتون الذکران من العالمین و تذرون ما خلق لکم ربکم  
من ازواجکم بل انتم قوم عادون۔ (سورہ شعرا)

کو تیری بیٹیوں میں یعنی اُن کے گرفتار کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور تو جانتا ہے جو ہم چاہتے ہیں<sup>۱</sup> یعنی اُن اجنبی آدمیوں کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کہنا کہ ہم کو تیری بیٹیوں میں حق نہیں ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان لوگوں میں حق ہے یعنی ان کے گرفتار کرنے کا حق ہے پس اگر وہ حق اُن کے ساتھ بدکاری کا سمجھا جاوے تو کیسی غلطی ہے بلکہ وہ حق صرف یہ تھا کہ جو اجنبی لوگ اُن کے شہر میں آ کر حضرت لوط کے گھر میں چھپے تھے اُن کو گرفتار کر لیں پس قرآن مجید سے جو امر ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت لوط اُن عورتوں کو بطور اول یا ضلالت کے اُن لوگوں کو حوالہ کرنا چاہتے تھے اور یہ درخواست کرتے تھے کہ ان کے سہانوں کو گرفتار کر کے ذلیل نہ کریں۔

اس بیان پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر صرف بطور اول یعنی بطور ضلالت عورتوں کو سپرد کرنا منظور تھا تو ”ہ۔۔۔ن اطہر لکم“ یعنی وہ پاکیزہ تر ہیں تمہارے لیے کیوں فرمایا۔

مگر یہ فرمانا اُس بد خیال کا جو مفسرین نے قرار دیا ہے مثبت نہیں ہو سکتا اور نہ اُس مدعا کے برخلاف ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

اول سورہ الحجر میں ہن اطہر لکم۔ کے الفاظ نہیں ہیں۔ اُس میں صرف یہ لفظ ہیں کہ۔ ہولاء بناتی ان کنتم فاعلمین۔

دوسرے یہ کہ۔ ہن اطہر لکم۔ کے ہونے سے سورہ

۱۔ لقد علمت ما لسانی بناتک من حق وانک تعلم ما  
نرید۔ (سورہ ہود)

الحجر کی آیت کے مطلب پر کچھ زیادتی اور سورہ الحجر کی آیت میں آن لفظوں کے نہ ہونے سے سورہ ہود کی آیت کے مطلب سے کچھ کمی لازم نہیں آتی۔ ہن اطہر۔ کی دو قرائتیں ہیں۔ مشہور قرأت میں اطہر کی رے کا پیش ہے اور دوسری قرأت میں اطہر کی رے کا زبر ہے یعنی نصب ہے جن لوگوں نے رے کا زبر پڑھا ہے وہ اس کو حال قرار دیتے ہیں اور از روئے قواعد نحوی کے اس کی دو ترکیبیں قرار دیتے ہیں ایک صورت میں لفظ ہن حال اور ذوالحال میں فصل واقع ہوتا ہے اور اس کو نا جائز قرار دیتے ہیں اور دوسری صورت میں ہن فصل واقع نہیں ہوتا اور اس پر کوئی اعتراض نحوی بھی وارد نہیں ہوتا صرف اتنی بات ہے کہ ”اطہر“ کی رے کو منصوب پڑھنا مشہور قرأت کے برخلاف ہے چنانچہ اس کی بحث تفسیر کبیر و تفسیر کشاف میں مندرج ہے۔ ہم دونوں تفسیروں کی عبارت نقل کرتے ہیں۔ جس دوسری ترکیب نحوی کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ تفسیر کشاف میں مذکور ہے۔

تفسیر کبیر کی عبارت حاشیہ پر ثبت ہے اس میں لکھا ہے کہ عبدالملک بن مروان اور حسن اور عیسیٰ بن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ آن لوگوں نے ”ہن اطہر لکم“ فتح کے ساتھ پڑھا ہے حال کی بناء پر جیسا کہ ہم نے خدا کے اس قول میں ذکر کیا ہے۔ ”و هذا العلبي شيخنا“ مگر یہ کہ اکثر نحوویوں نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ یہ غلطی ہے اور کہا ہے کہ اگر ہولاء نباتی ہن اطہر فتحہ کے ساتھ پڑھا جاوے تو خدا کے اس قول کے مشابہ ہوگا ”و هذا العلبي شيخنا“ مگر یہ کہ ہن کا لفظ بیچ میں آ گیا ہے اور یہ امر اس بات کو روکتا ہے کہ اطہر کو فتح سے پڑھا جاوے اس بحث کو لوگوں نے

بہت بڑھایا ہے<sup>۱</sup>۔

تفسیر کشاف کی عبارت حاشیہ پر ثبت ہے<sup>۲</sup> اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن مروان نے ہن اطہر لکم کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ سیبویہ نے اس کو ضعیف لکھا ہے اور کہا ہے کہ ابن مروان اپنی غلطی میں جکڑ گیا اور عمرو بن علاء ہے کہ جس شخص نے ہن اطہر کو فتحہ کے ساتھ پڑھا وہ اپنی غلطی میں چار زانو ہو کر بیٹھا اور یہ اس لیے کہ اس کا فتحہ پڑھنا اس بناء پر ہوگا کہ حال قرار دیا جائے اور اس کا عامل معنی فعلیہ ہو جو ہولاء میں موجود ہے جیسے کہ خدا کے اس قول میں

۱۔ روی عن عبدالملک بن مروان و الحسن و عیسیٰ بن عمر انہم قروا ہن اطہر لکم بالنصب علی الحال کما ذکرنا فی قولہ تعالیٰ و ہذا بعلى شیخا اکثر النحویین اتفقوا انہ خطاء قالوا لوقر ہولاء بناتی ہن اطہر (بالفتح) کان ہذا نظیر قولہ و ہذا بعلى شیخا الا ان کلمۃ ہن قد وقعت فی الیین و ذالک یمنع من جعل اطہر (بالفتح) حالا و طو لوا فیہ - (تفسیر کبیر)

۲۔ قرأ ابن مروان ہن اطہر لکم بالنصب وضعفہ سیبویہ و قال احتجی ابن مروان فی لحنہ و عن ابی عمر و بن العلاء من قراہن اطہر (بالفتح) فقد تربع فی لحنہ و ذالک لان انتصابہ علی ان یجعل حالا قد عمل فیہا ساقی ہولاء من معنی الفعل کقولہ ہذا بعلى شیخا او ینصب ہولاء بفصل مضمرا کأنہ قبل خذوا ہولاء و بناتی بدل و یعمل ہذا المضمرا فی الحال و ہن فصل و ہذا لایجوز لان الفصل مختص بالوقوع بین جزی الجملة ولا یقع بین الحال و ذی الحال و قد خرج لہ وجہ لایکون ہن فیہ فصلا و ذالک ان یکون ہولاء مبتداء و بناتی ہن جملة فی موضع جنر المبتداء کقولک ہذا اخی ہو و یکون اطہر حالا - (تفسیر کشاف)

هذا العلبي شيخا يا یہ کہ ہولاء کو فتحہ دیا جاوے۔ فعل مضمر سے گویا یوں کہا گیا ہے خذوا ہولاء اور نباتی بدل ہو اور یہ مضمر حال میں عمل کرے ہن بیچ میں فصل واقع ہوا ہے لیکن یہ جائز نہیں کیوں کہ فصل صرف جملہ کی دو خبروں میں واقع ہوتا ہے۔ حال ذوالحال میں فصل نہیں واقع ہوتا ہے مگر اس کی ایک اور وجہ نکالی گئی ہے جس میں ہن کو فصل ماننا نہیں پڑتا وہ یہ کہ ہولاء مبتدا ہو اور نباتی ہن پورا جملہ موضع خبر میں ہے جیسے کہ تیرا قول هذا اخی ہو اور اطہر حال قرار دیا جاوے۔ (تفسیر کشاف)

غرض کہ اس میں کچھ کلام نہیں ہے کہ چند علمائے مفسرین و نحویین نے ہن اطہر کو حال قرار دیا ہے۔ میں بھی اس کا حال ہونا تسلیم کرتا ہوں اور ہمیشہ قرأت مشہورہ کا اختیار کرنا پسند کرتا ہوں اس لیے اطہر کو مضموم پڑھتا ہوں اور بایں ہمہ حال ذوالحال قرار دیتا ہوں۔

جملہ حالیہ پر سے واو حالیہ کا حذف کر دینا جائز ہے پس تقدیر کلام کی یہ ہے کہ ہولاء بناتی و ہن اطہر لکم۔ یعنی یہ میری بیٹیاں ہیں (اور) وہ پاکیزہ ہیں تمہارے لیے مبتداء و خبر کے درمیان میں جملہ معترضہ حالیہ واقع ہوا ہے اور یہ جائز ہے پوری ترتیب یوں ہے ”ہولاء بناتی لکم و ہن اطہر“۔  
الفیہ ابن مالک میں لکھا ہے کہ جملہ حالیہ جب کہ فعل مضارع مثبت نہ ہو تو آتا ہے صرف واو کے ساتھ یا صرف ضمیر کے ساتھ یا دونوں کے اور اس کا شعر یہ ہے۔

و جملة الحال سوے ماقدما

بـواو او بـمضمر او بـہـما

اور غایت التحقيق شرح کافیہ میں اس کی یہ مثال دی ہے۔

کلمتہ فوہ الی فی تقدیر کلام کی یہ ہے کلمتہ وفوہ الی فی مگر واؤ کو محذوف کر دیا ہے ۔

پس جب کہ حضرت لوط آن عورتوں کو بطور اول یعنی ضہانت کے ان لوگوں کو سپرد کرنا چاہتے تھے تو آن کی عظمت ظاہر کرنے کو انہوں نے کہا کہ ہن اطہر ۔ نہ اس مقصد سے جس کا خیال مفسروں نے یہودیوں کی روایتوں کی تقلید سے کیا ہے ۔

قرآن مجید میں متعدد ایسے قصے بیان ہوئے ہیں جو توریت میں بھی مذکور ہیں ۔ مگر آن قصوں کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا ہے جس سے وہ غلطیاں جو توریت میں آن قصوں کی نسبت ہیں دور ہو جاتی ہیں ۔ پس آن قصوں کی تفسیر میں ہر جگہ توریت کی اور یہودیوں کی روایتوں کی تقلید کرنا صریح غلطی ہے ۔ بلکہ سب سے مقدم قرآن مجید کے لفظوں پر غور کرنا چاہیے کہ آن سے کیا مطلب حاصل ہوتا ہے اگر وہی مطلب حاصل ہو جو توریت میں ہے تو توریت یا یہودیوں کی روایت کو اس کی تفسیر میں بیان کرنا کچھ مضائقہ نہیں ہے مگر قرآن مجید کے الفاظ کو خواہ مخواہ توریت یا یہودیوں کی روایتوں کے مطابق پھیر پھار کر لانا صریح غلطی ہے ۔

تیسرا امر جو عذاب نازل ہونے سے متعلق ہے قدرتی قانون پر مبنی ہے اور جس طرح خدا تعالیٰ آن تمام واقعات کو جو قانون قدرت کے مطابق ہوتے ہیں انسانوں کے گناہوں کی طرف نسبت کیا کرتا ہے اور جس کی وجہ ہم اپنی تفسیر میں بتا چکے ہیں اسی طرح اس قدرتی واقع کو بھی سدوم کے لوگوں کے گناہوں سے منسوب کیا ہے ۔

مفسرین نے جو لغو و بے ہودہ باتیں اپنی تفسیروں میں



لکھی ہیں کہ حضرت جبرئیل اس قطعہ زمین کو اپنے پروں پر اٹھا کر آسمان تک لے گئے اور پہلے آسمان کے اس قدر قریب پہنچے کہ آسمان کے فرشتوں نے کتوں کے بھونکنے اور مرغوں کے اذان دینے کی آواز سنی۔ یہ محض غلط اور موضوع کہانیاں ہیں جن کی مذہب اسلام میں کچھ بھی اصلیت نہیں ہے۔

سدوم و عموراء و ادما و زبوائیم یہ چار شہر اور بقول استریو کے چار یہ اور نو اور کل تیرہ شہر اُس مقام پر واقع تھے جہاں اب ڈوسی بمعنی سمندر مردہ جس کو عربی جغرافیہ دان بحر لوط کہتے ہیں واقع ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بحر لوط کے گرد جو ملک کی حالت ہے اس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ آتش خیز پہاڑوں کے لاوہ کے نشان اب بھی پائے جاتے ہیں اور اب بھی زلزلے کثرت سے آتے ہیں۔

علاوہ اس کے سدوم کی گھاٹی میں نطفہ کی کان تھی اور جابجا نطفہ کے بہت بڑے بڑے غار تھے اور اسی وجہ سے اس شہر کا نام سدوم رکھا گیا تھا۔ (توریت کتاب پیدائش باب ۱۴ ورس ۱۰) میں لکھا ہے کہ ”سدوم از چاہ ہائے گل چرپ پر بود“ گل چرب جس کو لکھا ہے وہی نطفہ کا مادہ ہے جو پانی پر آ جاتا تھا اور سٹی میں بھی ملا ہوا ہوتا تھا اور یہ آتش گیر مادہ ہے جس میں حرارت سے دھواں اٹھتا ہے اور کبھی کبھی زیادہ حرارت سے بھڑک جاتا ہے۔

جغرافیہ کے محققوں نے لکھا ہے کہ ”اکثر اب بھی دیکھا جاتا ہے کہ ڈوسی یعنی بحر لوط سے دھوئیں کے بادل کے بادل اٹھتے ہیں اور اُس کے کنارہ پر نئے سوراخ پائے جاتے ہیں۔ آج تک بحر لوط میں ایک قسم کا مادہ جس کو انگریزی میں اسفالٹس کہتے ہیں اور نطفہ کی ایک قسم ہے پانی کے اوپر آ جاتا ہے۔

غرض کہ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ جہاں سدوم و عمورہ وغیرہ شہر آباد تھے وہاں آتشیں پہاڑ تھے اور نطفہ یا گندھک کی کانیں کثرت سے تھیں۔ آتشیں پہاڑ کے پھٹنے اور نطفہ یا گندھک کے مادہ میں آگ لگ جانے سے وہ تمام شہر غارت ہوئے اور زمین کی وہ موٹی تہ جو نطفہ کے مادہ سے بنی ہوئی تھی پھٹ گئی اور جل گئی اور تمام قطعہ زمین کا دھنس گیا اور پانی جو اس تہ کے نیچے تھا اوپر آ گیا اور ایک بہت بڑی جھیل پیدا ہو گئی جو اب ڈوسی یا بحر لوط کے نام سے مشہور ہے اور دنیا میں عجائبات سے ہے۔

قرآن مجید سے اس حادثہ کا واقع ہونا اس طرح پر معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اس شام کو جب کہ قوم لوط نے جا کر حضرت لوط کا گھر گھیرا وہ آتش خیز پہاڑ اور نطفہ یا گندھک کی کانیں جلنی شروع ہوئیں اور کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ ان کا دھواں تمام شہر میں گھٹ گیا ہوگا اور قوم لوط جو حضرت لوط کا گھر گھیرے ہوئے تھی شہر میں دھواں گھٹ جانے کے سبب کام یاب نہ ہو سکی۔ اندھیرے کے سبب ان کو کچھ نہ دکھلائی دیتا ہوگا اور دھوئیں کے سبب ان کی آنکھیں بے کار ہو گئی ہوں گی جس کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورہ قمر میں فرمایا ہے کہ بے شک انہوں نے دند مچائی لوط کے مہمانوں سے پھر بے کار کر دیں ہم نے ان کی آنکھیں۔

”وَلَقَدْ رَوَدُوهُ لَأَعْنَضِيْفُهُ فَطَنَمْسِنَا اَعْيَنَهُمْ“۔

مفسرین نے فطمسننا اعینہم کے معنی لکھے ہیں کہ اندھا کر دیا اور یہ امر قرار دیا ہے کہ ان فرشتوں نے جو حضرت لوط کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ بطور اعجاز کے ان کو اندھا کر دیا اور ان کو حضرت لوط کے مکان کا دروازہ جس کو وہ توڑ کر اندر جانا چاہتے تھے نہیں ملا۔

لیکن جو روایت کہ انہوں نے بیان کی ہے اس کی کوئی معتبر

منذ نہیں ہے اور نہ اعجاز کی کچھ حاجت ہے جب کہ آتشیں پہاڑوں کا اور زمین کی گندھک و نقطہ میں آتش پیدا ہوئی اُس کے دھوئیں کے گھٹ جانے سے اُن کی آنکھیں بے کار ہو گئیں اور دکھائی دینے سے رہ گیا۔ اسی کی نسبت خدا نے فرمایا کہ فطمسنا عینہم -

یہ حال دیکھ کر اُن تینوں شخصوں نے جو حضرت لوط کے ہاں آئے ہوئے تھے سمجھا کہ آتش فشانی زیادہ ہونے والی ہے اور حضرت لوط کو صلاح دی کہ یہاں سے بھاگ چلو چناں چہ سورہ ہود میں آیا ہے کہ اُن لوگوں نے کہا اے لوط ہم تیرے خدا کے بھیجے ہیں سو تو اپنے اہل کو لے کر رات کے حصہ میں نکل جا اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے مگر تیری بیوی کہ اُس کو بھی وہی پہنچنے والا ہے جو اوروں کو پہنچا ہے بے شبہ اُن کا وعدہ صبح کا وقت ہے کیا صبح قریب نہیں<sup>۱</sup> -

اور سورہ حجر میں یہ ہے کہ اپنے اہل کو لے نکل جا اور اُن کے پیچھے چلا جا اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جاؤ جہاں تم کو حکم دیا جاتا ہے - ہم نے اُس کی طرف یہ طے کر دیا کہ اُن کا پیچھا صبح کے وقت کٹ جائے گا<sup>۲</sup> -

ولا يلتفت منكم احد - یعنی کوئی مڑ کر نہ دیکھے اس سے غرض وہاں سے جلد چلے جانے کی تاکید ہے - جیسے کہ خدا نے

۱۔ قالو يا لوط انا رسل ربك من يصلوا اليك فاسر باهلك بقطع من الليل ولا يلتفت منكم احد الا امراتك انه مصيبها ما اصابهم ان موعدهم الصبح اليس الصبح بقریب - (سورہ ہود)

۲۔ فاسر باهلك بقطع من الليل واتبع ادبارهم ولا يلتفت منكم احد و امضوا حيث تومرون وقضينا اليه ذالك الامر ان دابر هؤلاء مقطوع مصبحين - (سورہ حجر)

حضرت آدم کی نسبت کہا تھا ولا تقربا هذه الشجرة - یعنی پاس نہ جانا اس درخت کے مگر حضرت لوط کی بیوی جو ایمان والوں میں نہ تھی اس نے اس نصیحت کو نہیں مانا اور اس عذاب میں مبتلا ہو کر مرنے والوں کے ساتھ مر گئی۔

جن لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت لوط کی بیوی بھی ساتھ بھاگی تھی مگر اس نے بھاگتے میں جو مڑ کر دیکھا تو نمک کی ہو گئی یا مڑ کر دیکھنے کے سبب مر گئی اس کی کچھ اصل نہیں ہے اور نہ قرآن مجید سے یہ بات پائی جاتی ہے۔

---

## حضرت ابراہیم اور کعبہ کی تعمیر

کعبہ درحقیقت نماز پڑھنے کی جگہ یعنی مسجد ہے - جس کو حضرت ابراہیم نے بنایا تھا - خود خدا نے اس کو مسجد کہا ہے - جہاں فرمایا ہے ”ان المشرکین نجس فلا یقربوا المسجد الحرام“ اور جہاں فرمایا ہے ”لقد صدق الله رسوله الرويا بالحق لتدخلن المسجد الحرام انشاء الله“ ابراہیم اور اس کی تمام اولاد ایسے مقام کو بیت اللہ کہا کرتے تھے اور اس لیے کعبہ کو بھی بیت اللہ کہتے ہیں -

انسان کی ایک جلی عادت ہے کہ ایک ایسے وجود کے لیے جو نہ دکھائی دیتا ہے ، نہ چھوا جاتا ہے اور نہ سمجھ میں آتا ہے اور بہ جز اس کے کہ ہے ، اور کوئی خیال اس کی نسبت قائم نہیں ہو سکتا - کوئی نہ کوئی محسوس نشان قائم کر لیتا ہے اور اس محسوس نشان کے ذریعہ سے اپنا عجز اور نیاز اس غیر محسوس اور بیچون و بیچگوں ذات کے سامنے ادا کرتا ہے - قدیم زمانہ کے لوگوں کو بالطبع ایسے نشان کے قائم کرنے کی زیادہ تر رغبت ہوتی تھی اور یہی بات ہے کہ جس کے سبب سے ہم قدیم سے قدیم قوموں کا اور وحشی سے وحشی لوگوں کا جب حال تحقیق کرتے ہیں تو ان میں بت پرستی کے یعنی ایک شے محسوس کے پوجنے کے آثار پائے جاتے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال حضرت ابراہیم کے زمانہ تک معدوم نہیں ہوا تھا اور اسی سبب سے حضرت ابراہیم بھی خدا کی عبادت کے لیے ایک بن گھڑا پتھر کھڑا کر لیتے تھے اور یہ

رسم حضرت موسیٰ کے وقت تک قائم تھی۔ اس فعل میں جو انبیاء نے کیا اور اس فعل میں جو بت پرست کرتے تھے۔ فرق یہ ہے کہ بت پرست غیر خدا کے نام محسوس شے قائم کر کے پرستش کرتے تھے اور اس لیے وہ خدا کی پرستش نہ تھی بلکہ اس غیر خدا کی پرستش تھی جس کے نام سے وہ محسوس شے قائم تھی۔ انبیاء نے جو محسوس شے قائم کی وہ خدا ہی کے نام پر قائم کی اور خدا ہی کی پرستش کی نہ کسی غیر خدا کی۔ مگر مبارکی ہو اس کو (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو) جس نے ان تمام نشانیوں کو مٹا دیا اور اس بے نشان کی عبادت کو بغیر کسی نشان کے قائم کیا اور بحر و بر اور پہاڑ اور گھر اور مسجد سب یکساں خدا کی عبادت ہونا سکھا دیا۔ کوئی سمت خدا کی عبادت کے لیے مخصوص نہیں کی۔ یہ سمجھنا کہ کعبہ سمت خدا کی عبادت کے لیے مخصوص ہے محض غلطی ہے اور بانی اسلام کی ہدایت کے خلاف وہ سمت عبادت کے لیے مخصوص ہے محض غلطی ہے اور بانی اسلام کی ہدایت کے خلاف وہ سمت عبادت کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ ایک تمیز اور تفرقہ کے لیے مخصوص ہے، جس کو ہم آگے بیان کریں گے۔

کتاب پیدائش باب ۱۲ ورس ۷ میں ہے کہ ”تب خداوند نے ابراہیم کو دکھلائی دے کر کہا یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اس پر ظاہر ہوا ایک مذبح بنایا اور اسی باب کی آٹھویں آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پھر وہاں سے حضرت ابراہیم نے کوچ کیا اور آگے جا کر پھر ایک مذبح بنایا اور خدا کے نام سے یعنی خدا کے گھر کے نام سے اس کو موسوم کیا۔

اسی کتاب کے تیرھویں باب کی اٹھارویں آیت میں ہے کہ بلوطستان مری میں ابراہیم جا رہا تھا اور وہاں خداوند کے لیے ایک مذبح بنایا۔

ان تینوں آیتوں سے ثابت ہے کہ خدا کے لیے مذبح تعمیر کرنا اور خدا کے نام سے اس کو پکارنا اور وہاں خدا کے نام پر قربانی کرنا حضرت ابراہیم کا طریقہ تھا ۔

یہ طریقہ ان کی اولاد میں بھی جاری تھا ۔ چنانچہ کتاب پیدائش باب ۲۶ ورس ۲۵ میں لکھا ہے کہ ”یر شمع میں اسحاق پسر ابراہیم کو خدا دکھائی دیا اور اُس نے وہاں مذبح بنایا اور خدا کے نام سے اس کو موسوم کیا ۔

اب ہم کو یہ بتانا رہا کہ یہ مذبح کس طرح بنایا جاتا تھا اُس کی تفصیل بھی توریت مقدس میں موجود ہے ۔

کتاب خروج باب ۲۰ ورس ۲۵ میں لکھا ہے کہ ”اگر تو میرے لیے پتھر کا مذبح بنا دے تو تراشے ہوئے پتھر کا مت بنائو کیوں کہ اگر تو اسے اوزار لگاوے گا تو اسے ناپاک کرے گا ۔

اور اسی کتاب کے باب ۲۴ ورس ۴ میں لکھا ہے کہ ”اور موسیٰ نے خداوند کی ساری باتیں لکھیں اور صبح کو سویرے اٹھا اور پہاڑ کے تلے ایک مذبح بنایا اور اسرائیل کے بارہ سبطوں کے عدد کے موافق بارہ ستون بنائے گئے ۔

اور کتاب پیدائش باب ۲۸ ورس ۱۸، ۱۹، ۲۲ میں لکھا ہے کہ یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اُس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا لے کے ستون کی مانند کھڑا کیا اور اس کے سر پر تیل ڈالا اور اس کا نام بیت ایل (یعنی بیت اللہ خدا کا گھر) رکھا اور کہا کہ یہ پتھر جو میں نے ستون کی مانند کھڑا کیا خدا کا گھر یعنی بیت اللہ ہوگا ۔ جب کہ حضرت ابراہیم نے اپنی بیوی سارہ کے کہنے سے اپنی دوسری بیوی حاجرہ کو مع حضرت اسماعیل اپنے بیٹے کے جو حاجرہ بیوی کے پیٹ سے تھے نکال دیا اور وہ اُس کوہستان مکہ

میں آکر ٹھہرے تو حضرت ابراہیم نے ان کی عبادت کے لیے اسی طرح جیسا کہ وہ کیا کرتے تھے ایک پتھر کھڑا کر کے مذبح بنایا ہوگا جو اب ہم مسلمانوں میں حجر اسود اور یمین الرحان کے نام سے مشہور ہے۔ اس حجر اسود کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ ایک جزو کعبہ کا ہو گیا تھا۔ مگر وہ ایسی شے ہے جو اب تک موجود ہے۔ جہاں اس طرح پر مذبح بنایا جاتا تھا وہاں کوئی عمارت بنا دینے کا بھی دستور تھا۔ جس کا اشارہ توریت کی آن آیتوں سے بھی پایا جاتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔ پس بعد اس مذبح بنانے کے حضرت ابراہیم نے وہاں کعبہ بنایا۔ جو اب بیت اللہ کہلاتا ہے اور اسی کے ایک کونے میں پتھر لگا دیا۔ اس آیت میں اسی تعمیر کا ذکر ہے۔

اگرچہ ڈایوڈورس یونانی مؤرخ کی تاریخ میں کعبہ کا ذکر ہے اور اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام عرب تعظیم کرتے تھے مگر بعض نا سمجھ آدمی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ توریت میں کہیں اس مقام پر حضرت ابراہیم کے مذبح بنانے یا کعبہ کی تعمیر کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ مگر ان کا یہ اعتراض محض لغو اور بے بنیاد ہے توریت میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جو مذکور نہیں۔ حالانکہ ان کا تاریخی ثبوت موجود ہے اور توریت میں ذکر نہ ہونے سے اس کا عدم وقوع لازم نہیں آتا۔ اصل یہ ہے کہ توریت اور جو کتابیں اس سے متعلق ہیں وہ خاص بنی اسرائیل کے حالات میں لکھی گئی ہیں۔ اس لیے ان میں بنی اسماعیل کا وہاں تک کا ذکر ہے جہاں تک کہ بنی اسماعیل اور اسرائیل کے مشترک حالات رہے ہیں اور جہاں سے بنی اسماعیل کے حالات علیحدہ ہو گئے ہیں وہاں سے بنی اسماعیل کا ذکر ان کتابوں میں نہیں ہے۔ اللہ ماشاء اللہ کہیں



کہیں کسی سبب اور کسی تعلق سے آ جاتا ہے ۔ مکہ میں بنی اسماعیل کے لیے حضرت ابراہیم کا مذبح یا کعبہ بنانا بنی اسرائیل سے کچھ تعلق نہیں رکھتا تھا اور ان کتابوں میں اس کا ذکر نہ ہونے کی یہ کافی وجہ ہے ۔ مگر ہر زمانہ کے عرب کی متواتر روایتوں سے جن سے کسی امر کے ثبوت میں کچھ شبہ نہیں رہتا اور نیز غیر قوموں کی کتابوں سے اور نیز قدیم جغرافیہ سے اور خود مکہ کے گرد کی قدیم ویران بستیوں سے جو حضرت اسماعیل کے بیٹوں کے نام پر آباد ہوئی تھیں ، کچھ شبہ نہیں رہتا ۔

حضرت ابراہیم نے جب کعبہ بنایا تو صرف اس کی دیواریں بنائی تھیں ۔ چھت اس پر نہیں تھی ۔ بنی جرہم کے زمانے میں پہاڑی نالہ کے سبب سے حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا کعبہ ڈھے گیا ۔ تب بنی جرہم نے اس کو تعمیر کیا ۔ پھر وہ عالیق کے زمانہ میں جو ایک قبیلہ بنی حمیر کا تھا ڈھے گا ۔ تب عالیق نے اس کو بنایا ، پھر اس میں کچھ نقصان آ گیا تو قصی نے اس کو تعمیر کیا ۔ پھر آگ لگنے کے سبب کعبہ جل گیا اور قریش نے اس کو تعمیر کیا ۔ اُس زمانے میں آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہو چکے تھے اور آپ کی عمر تخمیناً بارہ چودہ برس کی تھی ۔ یزید کے زمانہ میں جب کعبہ پر فوج کشی ہوئی تو پھر کعبہ جل گیا اور عبداللہ بن زبیر نے اس کو تعمیر کیا ۔ مگر حجاج بن یوسف نے عبد الملک بن مروان کے وقت میں عبداللہ بن زبیر کی عمارت کو ڈھا ڈالا اور از سر نو اس کو اسی طرح پر بنا دیا ۔ جیسا کہ قریش کے زمانہ میں تھا اور اب جو عمارت موجود ہے وہ حجاج بن یوسف کی بنائی ہوئی ہے مگر اس کے گرد کی جو عمارتیں ہیں اور جو عمارات حرم کعبہ کہلاتی ہیں ان کو بہت سے بادشاہوں نے بنایا ہے اور وہ نہایت عالیشان عمارتیں ہیں ۔

# حضرت ابراہیم اور مشرکوں کے لیے دعائے مغفرت

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم کی دعائے مغفرت کا چار جگہ ذکر ہے :

(۱) ایک سورہ ابراہیم میں - جہاں حضرت ابراہیم نے مکہ کے لیے اور حضرت اسماعیل و حضرت اسحاق کے لیے برکت کی دعا مانگی ہے - اسی دعا کے ساتھ یہ بھی دعا کی ہے کہ ”ربنا اغفر لی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب“ یعنی اے ہمارے پروردگار بخش دے مجھ کو اور میرے والد اور والدہ کو اور سب ایمان والوں کو جس دن کہ قائم ہو حساب -

(۲) دوسرا مقام سورہ مریم میں ہے جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے چچا آذر کو باپ کہہ کر بت پرستی چھوڑنے اور خدا پر ایمان لانے کی نصیحت کی ہے - مگر اُن کے چچا نے نہ مانا اور خفا ہو کر کہا اگر تو بس نہیں کرتا تو میں تجھ کو سنگ سار کروں گا اور تو میرے پاس سے چلا جا اُس وقت حضرت ابراہیم نے کہا ”سلام علیک فاستغفر لک ربی“ چنانچہ اُس کے بعد حضرت ابراہیم اور کلدانیاں سے جو اُن کا وطن تھا جلا وطن ہو گئے - یہ وہ آیت ہے جس میں حضرت ابراہیم نے اپنے چچا آذر کے حق میں دعائے مغفرت کا وعدہ کیا تھا -

(۳) تیسرا مقام سورہ شعرا میں ہے جہاں حضرت ابراہیم نے

اپنے چچا کو باپ کہہ کر اور نیز اُس کو گمراہ قرار دے کر اُس کے لیے دعائے مغفرت کی اور کہا ”واغفر لای انہ کان من الضالین“۔

(۴) چوتھا مقام سورہ ممتحنہ میں ہے جہاں خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی بت پرستی کے متعلق دعائے مغفرت کی پیروی نہ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ”الا قول ابراہیم لابیه لاستغفرن لک وما اسلک لک من الله من شیء“ یعنی حضرت ابراہیم کے اس قول کی پیروی نہیں چاہیے جو اُنہوں نے اپنے چچا سے اُن کی مغفرت کی دعا کی نسبت کہا تھا اور اُسی وعدہ کے مطابق اُنہوں نے دعا بھی کی تھی۔

سورہ ممتحنہ کی آیت سے بطور دلالت النص ظاہر ہوتا ہے کہ مشرک کے لیے دعائے مغفرت کرنی نہیں چاہیے اور سورہ توبہ کی آیت میں بہ نص صریح بیان ہوا ہے کہ مشرکین کے لیے گو وہ کیسے ہی قریب کے قرابت مند ہوں دعائے مغفرت نہ کی جاوے۔ چنانچہ فرمایا ما کان للنبی والذین آمنوا ان یستغفروا للمشرکین و لو کان اولیٰ قربی من بعد ماتبتین لہم انہم اصحاب الجحیم یعنی نبی کو اور مومنین کو واجب نہیں ہے کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا مانگیں چاہے وہ اُن کے قریبی رشتہ دار ہی ہوں۔ بعد اس کے کہ اُن پر ظاہر ہو گیا کہ وہ اہل دوزخ ہیں۔

حضرت ابراہیم نے اپنے چچا کے لیے اس لیے دعائے مغفرت کی تھی کہ اُن کو اپنے چچا کے ایمان لانے کی توقع تھی مگر جب اُن کو یقین ہو گیا کہ وہ ایمان نہیں لانے کا۔ تو اُنہوں نے اُس سے اپنی بیزاری ظاہر کی جیسے کہ اسی آیت میں بیان ہوا ہے کہ ”فلما تبین لہ انہ عدو الله تبرأ منه ان ابراہیم لاواہ حمیم“۔

بعض مخالفین اسلام نے ان آیتوں سے اسلام پر بے رحمی کا الزام لگایا ہے کہ اسلام نے نہایت بے رحمی سے مشرک والدین کے لیے بھی دعائے مغفرت کی ممانعت کی ہے مگر یہ آن کی غلطی ہے۔ اس لیے کہ اسلام نے جس قدر والدین کے ادب کی گو وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں اور مشرکوں کے ساتھ بھی صلہ رحم کی تاکید فرمائی ہے۔ جس کی بنا محض رحم اور انسانیت پر ہے شاید اور کسی مذہب میں نہیں ہے مگر مغفرت یا عدم مغفرت کو رحم یا عدم رحم سے کچھ تعلق نہیں ہے اس لیے کہ مغفرت کا مدار صرف ایمان پر ہے کہ اگر کوئی بیٹا اپنے باپ پر ایمان نہیں لایا کیسا ہی رنج و غم و افسوس و رحم کیا کرے اور دعا مانگا کرے اُس سے کیا ہوتا ہے اُس کی مغفرت نہیں ہو سکتی اور جب کہ یہ بات محقق قرار پا چکی کہ مشرکین کی مغفرت نہیں ہوئے کی۔ تو انبیاء کو اور نیز تمام مسلمانوں کو نہیں چاہیے کہ مشرکین کے لیے وہ زندہ ہوں یا مردہ دعائے مغفرت کریں۔ کیوں کہ ایسا کرنے میں اس بات کا شبہ ہوتا ہے کہ اُن کو خدا کے اس وعدہ پر کہ مشرکین کو نجات نہیں دینے کا پورا پورا یقین نہیں ہے۔ باقی رہی مشرکین کے لیے دعائے خیر کہ وہ ایمان لے آویں اور کفر و شرک سے نجات پاویں جو اُن کے ساتھ اصلی محبت و رحم ہے اُس کی ممانعت نہیں ہے خود انبیاء نے ایسا کیا ہے اور ہر ایک مسلمان کو ایسا کرنا چاہیے بلکہ مشرکین سے جو زیادہ تر قراوت قریبہ رکھتا ہو اُن کے لیے اور زیادہ اور دلی اضطراب اور رنج و غم سے ایسی دعا کرنی لازم ہے۔

## حضرت یوسف کا قصہ

(حقیقت کی روشنی میں)

قرآن کریم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو ”احسن القصص“ فرمایا ہے اور مفسرین نے اس پر ایسے عجیب و غریب حاشیے چڑھائے ہیں جن کی انتہا نہیں۔ سرسید نے اس واقعہ کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ لکھا ہے اور بڑی تحقیق کے ساتھ اس پر قلم اٹھایا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں جو جو اہم آیات قرآنی آئی ہیں سب کی الگ الگ تشریح اور تفصیل اپنے مخصوص نقطہ نگاہ سے کی ہے نیچے وہ سارا بیان درج کیا جاتا ہے جو سرسید نے اس سلسلے میں تحریر کیا ہے ناظرین سے آمید ہے کہ سرسید کی اس تحقیق اور تلاش کو بہت دل چسپ پائیں گے۔

(محمد اسماعیل پانی پتی)

ولقد ہمیت بہ و ہم بہا۔ کی نسبت مفسرین نے بہت لمبی لمبی دور ازکار بحثیں کی ہیں۔ کہیں اس پر بحث ہے کہ ہم بہا کے لفظ سے حضرت یوسف سے گناہ صادر ہوا یا نہیں۔ کہیں اس پر بحث ہے کہ رویت برہان سے کیا مراد، پھر ایک روایت کہی جاتی ہے کہ حضرت یعقوب کی صورت دانتوں سے آنکلی کاٹتے ہوئے دکھائی دی ایک روایت بتائی جاتی ہے کہ مکان کی چھت پر

کچھ الفاظ لکھے ہوئے دکھائی دے اسی طرح کی بہت سی بے فائدہ اور بے ہودہ باتیں تفسیروں میں لکھی ہیں اور ان پر جرح ، قدح و تعدیل و تصویب کی ہے مگر قرآن مجید کا مطلب بہت صاف ہے البتہ کسی قدر قواعد نحو کے مطابق اس پر بحث ہو سکتی ہے اگرچہ ہمارے نزدیک اخفش و سیبویہ یا بصری و کوفیہ کے مستنبطہ قواعد نحو سے قرآن مجید کو جکڑنا اور اس پر جرح محض غلط ناواجب ہے کیوں کہ کتنا ہی استغرا کیا جاوے کسی زبان کے تمام محاورات و طرز ادا اور ایڈیم کا استغراء نہیں ہو سکتا لیکن ہم اول اصلی و صاف معنی قرآن مجید کے بیان کر کے بقدر ضرورت مسئلہ نحوی پر بھی بحث کریں گے ۔

پہلی آیت میں خدا نے فرمایا تھا کہ اس عورت نے مکان کے دروازے بند کر دیے اور یوسف سے کہا کہ آؤ میں تیرے لیے ہوں یعنی حضرت یوسف سے فحش کی خواہش کی حضرت یوسف نے کہا خدا کی پناہ یعنی انکار کیا اور یہ دلیل پیش کی کہ جس نے مجھ کو گھر میں رکھا ہے یعنی اس عورت کا شوہر وہ میرا رب یعنی مربی ہے اور مجھ کو عزت سے رکھا ہے اور ظلم کرنے والے فلاح نہیں پاتے ۔

اب دوسری آیت میں جو لفظ و ہم بھا کا ہے اس کے یہ معنی کہ حضرت یوسف نے اس عورت سے فحش کا قصد کیا یا ان کے دل میں اس کا ارادہ آیا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتے کیوں کہ پہلی آیت میں صاف اس کام سے انکار بطور نص قطعی بیان ہو چکا ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ ہم بھا کے معنی عدم وقوع ”ہم“ کے ہوں پس ’ہم بھا‘ ، ’لولا‘ کی جزا ہے اور جزا بسبب اہم اور مقصود بالذات ہونے کے شرط پر مقدم ہو گئی ہے ۔ اس لیے دوسری آیت کے صاف معنی جو نص قرآنی سے پائے جاتے ہیں یہ

ہیں کہ ”اگر یوسف نے دلیل اپنے رب کی نہ دیکھی ہوتی یعنی نہ سمجھی ہوتی تو یوسف نے اس کے ساتھ قصد کیا ہوتا“ پس قرآن مجید سے فحش کا قصد کرنا یا اس کا ارادہ دل میں آنا حضرت یوسف کی نسبت بیان نہیں ہوا ہے۔

رویت کا لفظ آنکھ سے ہی دیکھنے پر مخصوص نہیں ہے بلکہ دل میں جو بات یقین اور استحکام سے آجاتی ہے اُس پر بھی رویت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس آیت میں جو لفظ ’را‘ کا ہے اس کی نسبت بھی تفسیر کبیر میں آنکھ سے دیکھنے کے معنی نہیں بیان ہوئے ہیں بلکہ اُس رویت قلبی کے معنی لیے ہیں جو انبیاء و صلحا کو منکرات پر اقدام کرنے سے روکتی ہے۔

فا المراد با لرؤة حصول تملک الاخلاق (یعنی تطہیر نفوس الانبیاء و تذکیر الاحوال الرادعة لہم عن الاقدام علی المنکرات) - (تفسیر کبیر)

فالہم عبادة عن جواذب الطبیعة و رؤة البرہان عبارة عن جواذب العبوریة - (تفسیر کبیر)

اب یہ بات غور طلب ہے کہ ”برہان ربہ“ سے کیا مراد ہے۔ تعجب ہے کہ تمام مفسرین نے پہلی آیت میں جو لفظ ”رب“ ہے اُس سے وہ شخص مراد لیا ہے جس نے حضرت یوسف کو خرید کر اپنے گھر میں رکھا تھا اور پرورش کیا تھا اور دوسری آیت میں جو لفظ ”ربہ“ ہے اس سے خدا مراد لیا ہے جس کے لیے کوئی قرینہ نہیں ہے بلکہ بلحاظ سباق پہلی آیت کے دوسری آیت میں بھی وہی شخص مراد لیا ہے جو پہلی آیت میں تھا۔

لہٰذا اب معنی آیت کے اور لفظ ”برہان“ کے بالکل صاف ہیں اگر یوسف نے یہ دلیل نہ سمجھی ہوتی کہ جس نے مجھ کو

میں رکھا ہے اور میرا رب یعنی مربی یا پرورش کرنے والا

اسے گور

ہے اس کی عورت کے ساتھ فحش ظلم ہے اور ظلم کرنے والے فلاح نہیں پاتے تو یوسف نے اس کے ساتھ قصد کیا ہوتا۔

اب رہی یہ بحث کہ ”لولا“ جب بطور شرط کے واقع ہو تو جزا کا اس پر مقدم کرنا بموجب قواعد مستنطبه نحو جائز ہے یا نہیں اس کی نسبت تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ :

لا نسلم ان يوسف عليه السلام هم بها والدليل عليه انه تعالى قال وهم بها لولا ان راء ببرهان ربه و جواب لولا هم هنا مقدم و هو كما يقال - قد كنت من الهالكين لولا ان فلانا خلصك - (تفسیر کبیر)

ہم اس بات کو نہیں مانتے کہ حضرت یوسف نے اس عورت کے ساتھ قصد کیا تھا کیوں کہ خدا نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ قصد کیا ہوتا اگر نہ دیکھتا دلیل اپنے پروردگار کی۔ اس جگہ لولا مقدم ہے اور اس کی ایسی مثال ہے کہ کہوٹی کہے کہ تو ہوتا مرے ہوؤں میں سے اگر نہ فلاں شخص تجھ کو بچاتا۔

اس پر زجاج کا اعتراض نقل کیا ہے اس کا اعتراض یہ ہے کہ ’لولا‘ کا جواب پہلے لانا شاذ ہے اور کلام فصیح میں موجود نہیں ہے۔

اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ جواب ’لولا‘ کا مؤخر لانا بہتر ہے مگر مقدم لانا ناجائز نہیں ہے اور جواب ’لولا‘ کے مقدم آنے پر سورہ قصص کی اس آیت سے سند لی ہے کہ :

واصبح فوا دام موسیٰ فارغا ان كادت لتبدي به لولا ان ربطنا عاصی قلبها لتكون من الممؤنین - (سورہ قصص)

اسی کو

موسیٰ کی ماں کا دل بے صبر ہو گیا ، قریب تھا کہ اس کا دل ظاہر کر دیوے اگر ہم نے بندش رکھی ہوتی اس کے دل

پر



اس پر زجاج کا دوسرا اعتراض نقل کیا ہے کہ 'لولا' کا جواب بغیر لام کے نہیں آتا۔ اگر 'ہم' بھا، 'لولا' کا جواب ہوتا تو یوں کہا جاتا۔ ولقد همت به ولهم بها لولا ان راء برهان ربه۔

اس کا جواب یہ دیا ہے کہ 'لولا' کا جواب لام کے ساتھ آتا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بغیر لام کے لانا جائز نہیں ہے۔

اس کے بعد تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ 'لولا' کا جواب چاہتا ہے اور یہ یعنی 'وہم' بھا، اس کا جواب ہو سکتا ہے پھر ضرور ہے کہ وہ اس کا جواب ہو۔ یہ بات کہنی نہیں چاہیے کہ ہم اس کے جواب کو مضمّر مانیں گے اور بہت جگہ قرآن میں جواب کو چھوڑ دیا جاتا ہے کیوں کہ ہم کہتے ہیں کہ اس بات میں کہ قرآن میں جواب چھوڑ دیا گیا ہے کچھ جھگڑا نہیں ہے مگر اصلی بات یہ ہے کہ جواب کا محذوف ہونا نہیں چاہیے۔ صرف اسی جگہ اس کا حذف کرنا یا چھوڑنا بہتر ہوتا ہے جب کہ لفظ میں ایسی دلالت پائی جاوے کہ اس سے وہ جواب محذوف متعین ہو جاوے اور اگر اس جگہ ہم جواب کو محذوف مانیں تو لفظ میں کوئی دلالت ایسی نہیں ہے جو جواب محذوف کو متعین کر دے اور اس جگہ بہت سے جواب مضمّر ہو سکتے ہیں اور ایک کو باقیوں سے بہتر سمجھنے کی دلیل نہیں ہے۔ انتہی۔

صاحب تفسیر کبیر نے اس بات کی کوئی مثال نہیں دی کہ 'لولا' کا جواب بغیر لام کے بھی آیا ہے مگر قرآن مجید میں متعدد اس کی مثالیں ہیں۔ سورۃ نور میں ہے۔ ولولا فضل الله عليكم ورحمته ما زكي منكم من احد ابدا (آیت ۲۱) اور سورۃ واقعہ میں ہے "فلولا ان كنتم غير مدينين ترجعونها

ان کنتم صدقین (آیت ۸۵ و ۸۶) اور اس شعر زمانہ جاہلیت میں بھی جواب 'لولا' کا بغیر لام کے آیا ہے اور وہ شعر یہ ہے -

ولولا انسی رحیل حرام

هصرت قرونها ولثمت فاهما

اور فرزدق نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی شان میں کہا ہے -

ما قال لاقط الا فی تشهد

لولا التشهد کانت لاوه نعم

اگرچہ ان آیتوں اور شعروں میں 'لولا' کا جواب مؤخر ہے مگر جب کہ اس کا جواب بحالت مؤخر ہونے کے بغیر لام کے آیا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ بحالت مقدم ہونے کے بغیر لام کے نہ آوے چناں چہ ہم اس کی مثال بھی پیش کریں گے -

بلا شبہ تفسیر کبیر نے نہایت عمدہ طریق پر بیان کیا ہے کہ 'وہم بہا' جواب مقدم ہے، 'لولا' کا، لیکن ہم مختصر طور پر یہ بات کہتے ہیں کہ خود قرآن مجید سے ثابت ہے کہ 'وہم بہا' جواب مقدم ہے 'لولا' کا، کیوں کہ پہلی آیت سے کسی قسم کے 'ہم' یعنی قصد سے انکاریان ہو چکا ہے تو آیت میں ہر قسم کے 'ہم' یعنی قصد سے نفی ہونی چاہیے اور اس کی نفی نہیں ہوتی جب تک کہ 'وہم بہا' کو 'لولا' کا جواب مقدم نہ قرار دیا جاوے پس نص قرآنی سے ثابت ہے کہ 'ہم بہا' جواب مقدم 'لولا' کا ہے -

ہم اسی قدر پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے بلکہ بیان کرتے ہیں کہ عرب کے اشعار میں بغیر لام کے بھی لولا کا جواب مقدم آیا ہے - امرا القیس کہتا ہے -

یغالبین فیہ الذخیر لولا ہو اجر

جناد بھا صرعی لہن نصیص

غلو کرتیں وہ اونٹنیاں قناعت کرنے میں پانی سے  
چارہ پر اگر ایسی دوبھر نہ ہوتی جس پر ٹڈیاں زمین پر گر پڑی ہیں  
اور وہ چرچر بول رہی ہیں گویا بہنے کی وہ چرچراہٹ ہے -  
زہیر جو بہت مشہور اور قدیم شاعر زمانہ جاہلیت کا ہے  
کہتا ہے -

المجد فی غیر ہم لولا ماثرہ

و صبر نفسہ والحرب تستعر

بزرگی اس کے سوا اوروں میں ہوتی ہے اگر نہ ہوتی اس کی  
یعنی مدوح کی خویاں اور استقلال نفس ایسی حالت میں کہ لڑائی  
بھڑک رہی ہے -

(شہد شاہد) - شاہد کا لفظ زیادہ تر گواہ کے معنوں  
میں مستعمل ہے مگر ایسے گواہ پر جس نے اس واقعہ کو جس کا وہ  
گواہ ہے بچشم خود دیکھا ہو اس لیے قرآن مجید کے مترجموں نے  
اس کا ترجمہ کیا ہے (گواہی داد گواہ) اور اردو میں ترجمہ کیا  
ہے (گواہی دی گواہ نے) مگر یہ ترجمہ صریح غلط ہے کیوں کہ  
اگر 'شاہد' کے معنی گواہ کے لیے جاویں تو اس کی گواہی  
”ان کان قمیصہ قدمین قبل الی آخرہ“ ہوگی اور صاف ظاہر  
ہے کہ وہ گواہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک واقعہ کی نسبت حکم  
یا فیصلہ ہے پس خود سیاق قرآن ان معنوں سے جو مترجموں نے  
اختیار کیے ہیں انکار کرتا ہے اسی لیے اس تفسیر کے مصنف نے  
جو تفسیر ابن عباس کے نام سے مشہور ہے 'شہد شاہد' کی  
تفسیر میں لکھا ہے 'حکم حاکمہ' شاہد سے حاکم مراد لینا گو  
سیاق قرآن کے مناسب ہو مگر لفظ کی دلالت سے بہت بعید ہے -

شہد اور شاہد کا لفظ جیسا کہ گواہ کے معنوں میں مستعمل ہے اس سے زیادہ حاضر اور موجود ہونے کے معنوں میں مستعمل ہے پس صحیح ترجمہ ان لفظوں کا وہ ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے کہ (حاضر ہوا حاضر ہونے والا) یعنی اس تنازع کے وقت جو اس عورت اور حضرت یوسف میں ہوا ایک شخص آیا اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ”ان کان قمیصہ قد سن قبل الدخ۔“ اب اس بات پر بحث ہے کہ وہ شاہد کون تھا۔ تفسیر کبیر میں متعدد روایتیں اس کی نسبت لکھی ہیں جو اسی قسم کی ہیں جیسے کہ بے سر و پا روایتیں تفسیروں میں ہوتی ہیں مگر وہ روایت جس پر ایک گروہ مفسرین کو اتفاق ہے اس قابل ہے کہ اس پر اعتاد کیا جاوے اور وہ یہ ہے کہ۔

انہ، کان لہا ابن عم و کان رجلا حکیمًا واتفق فی ذالک الوقت انہ کان مع الملک یریدان یدخل علیہا فقال قدمنا الجلبۃ من وراء الباب و شق القميص الا انا لا ندري ایکم صاحبہ فان کان شق القميص من قدمہ فانت صادق و الرجل کاذب و ان کان من خلفہ فالرجل صادق وانت کاذبہ فلما نظر والی القميص و راوا الشق من خلفہ قال ابن عمہا انہ من کید کن عظیم ای من عمل کن ثم قال لیوسف اعرض عن هذا واکتمہ و قال لہا استغفیری لذنبک و هذا قبول طائفۃ عظیمۃ من المفسرین۔ (تفسیر کبیر)

اس عورت کا چچا زاد بھائی تھا اور وہ ایک حکیم آدمی تھا اتفاق سے اس وقت وہ بادشاہ کے ساتھ تھا اور اس عورت کے پاس جانے والا تھا اس نے کہا کہ میں نے دروازہ سے ورے کھینچا تانی اور آواز قمیص پھٹنے کی سنی، مگر میں نہیں جانتا کہ تم

دونوں میں کون آگے تھا۔ پس اگر کرتا آگے سے پھٹا ہو تو تو سچی ہے اور وہ شخص جھوٹا ہے اور اگر پیچھے سے پھٹا ہو تو وہ شخص سچا ہے اور تو جھوٹی ہے۔ پھر جب قمیص کو دیکھا اور معلوم ہوا کہ وہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس عورت کے چچا زاد بھائی نے کہہ دیا بیشک تمہارا مکر ہے اور بیشک تمہارا مکر بڑا ہے یعنی یہ کام تمہارا ہے۔ پھر اُس نے یوسف سے کہا کہ اس سے در گذر کرو اور اس کو پوشیدہ رکھو اور اس عورت سے کہا کہ تو معافی مانگ اپنے گناہ سے۔ یہ قول ہے ایک گروہ عظیم کا مفسرین میں سے۔ پس یہ روایت ایسی ہے کہ اس کو تسلیم کیا جا سکتا ہے اور اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شہد شہد کا لفظ بمعنی گواہ کے نہیں آیا بلکہ ایسے شخص کی نسبت آیا ہے جو وہاں حاضر تھا۔

انیسویں اور بیسویں آیت کے اکثر الفاظ نہایت غور طلب ہیں اور مفسرین نے بلاشبہ ان پر غور کی ہے اور اپنی سمجھ کے مطابق ان کی تفسیر بھی بیان کی ہے مگر تشفی کے قابل نہیں ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ تفسیر نا معتمد روایتوں پر مبنی ہے ہم چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے خود قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے ان کی تفسیر سمجھیں۔

اُن آیتوں میں ہے کہ جب شہر کی عورتوں نے حضرت یوسف کے ساتھ عزیز مصر کی عورت کے عشق کا چرچا کیا اور کہا کہ وہ علانیہ گمراہی میں ہے اور جب عزیز مصر کی عورت نے 'ان کا چرچا کرنا سنا تو ان کو دعوت میں بلایا جس میں حضرت یوسف بھی موجود ہوئے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ وہ چار پانچ عورتیں تھیں ایک عزیز مصر کے شراب پلانے والے کی عورت۔ دوسری اُس کی روٹی پکانے والے یعنی داروغہ باورچی خانہ کی عورت، تیسری افسر جیل خانہ کی عورت۔ چوتھی داروغہ اصطبل کی عورت۔ پانچویں

حاجب یعنی افسر منتظم دربار کی عورت -

ان آیتوں میں جو الفاظ قابل غور ہیں منجملہ ان کے ایک لفظ 'بمکرہن' ہے یعنی جب عزیز مصر کی عورت نے ان عورتوں کا چرچا کرنا سنا تو اس کو بلفظ بمکرہن سے تعبیر کیا - پس غور کرنے کی بات ہے کہ ان کے اس چرچے کو کیوں اس لفظ سے تعبیر کیا - تفسیر کبیر میں اور اسی طرح اور تفسیروں میں لفظ 'بمکرہن' کی تفسیر 'بقولہن' کی ہے پھر اس پر بحث کی ہے ان کے قول کو 'مکر' کے لفظ سے کیوں تعبیر کیا ہے - تفسیر کبیر میں اس کی تین وجہیں لکھی ہیں جو صحیح نہیں معلوم ہوتیں -

اول یہ کہ - اس چرچہ سے ان کا مطلب یہ تھا کہ عزیز مصر کی عورت ہم کو بھی یوسف دکھا دے - مگر یہ کسی قدر بعید از عقل ہے کہ ان عورتوں نے جو عزیز مصر کے محل میں آنے جانے والی اور اس کے افسروں کی عورتیں تھیں اور حضرت یوسف بھی وہیں رہتے تھے اور انہوں نے ان کو کبھی نہ دیکھا ہو -

دوسرے یہ کہ عزیز مصر کی عورت کے عشق کا راز ان کو معلوم تھا مگر اس کے چھپانے کو کہا تھا جب انہوں نے اس کا چرچا کیا تو یہ دغا بازی و مکر ہوا - تسلیم کرو کہ دغا بازی اور خلاف وعدگی ہوئی رازداری نہ ہوئی مگر اس میں مکر کیا ہوا -

تیسرے یہ کہ انہوں نے عزیز مصر کی عورت کی پوشیدہ پوشیدہ غیبت کی جو مکر کے مشابہ تھی اس توجیہ کا بودا پن خود اس سے ظاہر ہے - اب ہم قرآن مجید ہی سے تلاش کرتے ہیں کہ ان عورتوں نے جو چرچا کیا اس پر مکر کا کیوں اطلاق کیا قرآن مجید کی اور آیتوں سے جن کا ہم ذکر کریں گے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورتیں خود حضرت یوسف کے عشق میں مبتلا تھیں اور حضرت

یوسف کو اپنی طرف ملتفت کرنا چاہتی تھیں اور ظاہر میں عزیز مصر کی عورت کو یوسف کے عشق پر ملامت کرتی تھیں اور اس لئے اُن کے اُس چرچے اور ملامت کرنے کو اُن کے مکر سے تعبیر کیا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتیں مع عزیز مصر کی عورت کے اُس عشق بازی میں شریک تھیں اور ایک کو دوسری کا حال معلوم تھا اور اسی سبب سے عزیز مصر کی عورت نے ان کی بات چیت کو مکر سے تعبیر کیا اور بسبب راز دار ہونے کے یوسف کی دعوت میں ان کو بلایا اور سب نے مل کر حضرت یوسف کو فحش کے ارتکاب پر مجبور کرنا یا ان کو کسی جرم کے حیلہ میں پھنسانا چاہا تھا کیوں کہ حضرت یوسف پہلے جرم کے اتہام سے بری ہو چکے تھے اور وہ مجاس جس میں حضرت یوسف اور وہ عورتیں بلائی گئی تھیں دعوت کی تھی جس میں متعدد قسم کے کھانے تھے اور اُن کے کاٹنے کے لیے ہر ایک کو ایک چھری دی گئی تھی چنانچہ تفسیر کبیر اور نیز تفسیر موسوم بہ ابن عباس میں لکھا ہے کہ وہ عورتیں دعوت میں بلائی گئی تھیں اور پھل کاٹنے یا گوشت کاٹنے کو چھریاں ان کو دی تھیں اور وہ گوشت کو چھری سے کاٹ کر کھاتے تھے مگر ان عورتوں نے صرف حضرت یوسف کو جرم میں پھنسانے کے لیے خود دانستہ اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور اسی جرم کے اتہام میں ان کو قید خانہ میں بھیجا۔ تفسیر کبیر اور تفسیر ابن عباس کی اصل عبارتیں یہ ہیں۔

حاصل الکلام انہا دعت اولئک النسوة و اعتدت لکل واحدة منهن سكيناً اما لاجل اكل الفاكهة او لاجل قطع اللحم۔ (تفسیر کبیر)

واقعت (اعطت) کل واحدة منهن سكيناً۔ تقطع بها اللحم لانهم كانوا لا ياكلون الا ما يقطعون بها لما كينم۔ (تفسیر ابن عباس)

اب اس مطلب کو ہم قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کرتے ہیں۔ جب بادشاہ نے خواب کی تعبیروں کو جو حضرت یوسف نے دی تھیں سن کر کہا کہ حضرت یوسف کو قید خانہ سے لاؤ تو جو شخص لینے آیا تھا اس سے حضرت یوسف نے کہا کہ۔

فارجع الی ربک مسئلہ ما بال النسوة التی قطعن ایدیہن ان ربی بیکم عدلہن علیہم۔ (آیت ۵)

تو پھر جا اپنے مالک کے پاس اور اس سے پوچھ کہ کیا حال ہے ان عورتوں کا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے بے شک میرا رب یعنی وہ جس نے میری پرورش کی ہے اُن کے مکر کو جانتا ہے۔ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے ہاتھ خود مکر کرنے کے لیے کاٹے تھے۔

اس پر بادشاہ نے یا عزیز مصر نے ان سے پوچھا کہ۔  
ما قال خطیبہ کن اذ راد دتن یوسف عن نفہ سہ قل ان حاش اللہ ما علمنا علیہ من سوء۔ (آیت ۵۱)

تمہاری کیا حالت تھی جب کہ تم نے لگاؤ کی یوسف سے اُس کو اپنے آپ کی حفاظت سے ڈگمگا دینے کو اُن عورتوں نے کہا دھائی خدا کی ہم نے یوسف میں کوئی برائی نہیں جانی۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح عزیز مصر کی عورت نے حضرت یوسف سے لگاؤ کی باتیں کی تھیں وہی حال ان عورتوں کا تھا جنہوں نے دانستہ مکر کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔

تفسیر کبیر میں بادشاہ کے اس قول کی نسبت ”اذ راد دتن یوسف عن نفہ سہ“ دو احتمال لکھے ہیں ایک یہ کہ۔

ان قوله اذ راد دتن یوسف عن نفہ سہ وان کانت صیغۃ الجمع فالمراد منها الواحدہ کہ۔ ولہ تعالیٰ



الذین قال لهم الناس ان الناس جمعوا لكم (والثانی)  
ان المراد منه خطاب الجماعة ثم هنها وجهان (الاول)  
ان كان واحدة منهم راودت يوسف عن نفسها (والثانی)  
ان كل واحدة منهم راودت يوسف لاجل امرأة العزیز۔  
(تفسیر کبیر)

اگرچہ راو دتن صیغہ جمع کا ہے لیکن اس سے مراد واحد ہے  
یعنی وہی عورت عزیز مصر کی۔ مگر یہ احتمال محض غلط ہے۔ اول تو  
اس لیے کہ صیغہ جمع سے واحد مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں دوسرے  
یہ کہ بادشاہ نے یوسف کے پیغام پر سوال کیا تھا اور حضرت یوسف  
نے صاف کہا تھا کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے  
اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے پس انہی عورتوں سے بادشاہ نے 'اذ راو دتن  
یوسف عن نفسه' کہہ کر سوال کیا پس تحقیق معلوم ہوا  
کہ وہ صیغہ جمع کا ہے ان عورتوں کی نسبت بولا گیا ہے جو تعداد  
میں چار پانچ تھیں پھر اس سے واحد مراد لینا خلاف واقع اور خلاف  
حقیقت ہے۔ دوسرا احتمال یہ لکھا ہے کہ اس سے گروہ عورتوں کا  
مراد ہے خواہ ان میں سے ہر ایک نے حضرت یوسف کو خود اپنے  
نفس کے ساتھ فحش کرنے کی لگاؤٹ کی ہو خواہ عزیز مصر کی  
عورت کے ساتھ مگر گو یہ احتمال اس تفسیر کا موید ہے جو ہم نے  
بیان کی ہے مگر اس احتمال میں بھی جو دو شقیں بیان ہوئی ہیں  
ان میں سے ہم پہلی شق کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ وہ زیادہ تر  
الفاظ قرآن کے مناسب ہے۔

ان آیتوں کے بعد کی آیت میں جو عزیز مصر کی عورت کا یہ  
قول ہے کہ - قالت قد لکین الذی السمیتنی فیہ -  
(آیت ۳۲)

یعنی وہی شخص ہے جس کی بابت تم مجھ کو ملاست کرتی ہو اس

کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ان کی ملامت یوسف کے ساتھ عشق رکھنے کی تھی۔ مفسرین نے اس واقعہ کی صورت اس طرح سمجھی ہے کہ ان عورتوں نے حضرت یوسف کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور عزیز مصر کی عورت نے ان کو دعوت میں بلایا کہ جب وہ یوسف کے حسن و جمال کو دیکھیں گی تو ملامت نہیں کرنے کیں جب انہوں نے دفعۃً حضرت یوسف کو دیکھا تو ان کے حسن و جمال کے سبب ان کو ہوش نہ رہا انہوں نے بجائے گوشت یا میوہ کے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور کہا کہ یہ تو انسان نہیں ہے بلکہ فرشتہ ہے۔ اس وقت عزیز مصر کی عورت نے کہا کہ یہ وہی ہے جس کے عشق کی بابت تم مجھ کو ملامت کرتی ہو۔

مگر جس طرح کہ ہم نے قرآن مجید کی ایک آیت کی دوسری آیت سے تفسیر بیان کی ہے اس سے صورت واقعہ کی اس کے برخلاف ہے جو مفسرین نے نکالی ہے بلکہ صورت واقعہ یہ تھی کہ ان عورتوں کی ملامت اس بات پر تھی کہ عزیز کی عورت جو بہت اعلیٰ درجہ کی ہے اپنے ایک غلام پر اس طرح فریفتہ ہو جاوے اور وہ اس پر ملتفت نہ ہو۔ پس اس مجالس دعوت میں جب ان عورتوں نے بھی ہر طرح سے حضرت یوسف کی خوشامد اور ان سے لگاؤ کی اور آخر کار ان کو دھمکانے اور ڈرانے اور مجرم ٹھہرانے کے لیے اپنے ہاتھ بھی کاٹ لیے اور جب بھی حضرت یوسف فحش کے مرتکب نہ ہوئے تو ان عورتوں نے کہا کہ یہ تو انسان نہیں ہے بلکہ ایک بزرگ فرشتہ ہے کہ کسی داؤ میں نہیں آیا۔ اس پر عزیز مصر کی عورت نے کہا کہ یہ وہی ہے جس کی بابت تم مجھ کو ملامت کرتی ہو کہ میں تو اس پر فریفتہ ہوں اور وہ مجھ پر ملتفت نہیں ہوتا اس کے بعد عزیز مصر کی عورت کا یہ کہنا کہ۔

ولقد راودته عن نفسه فاستعصم ولئن لم يفعل

ما امرۃ یسجنن ولیسکونا من الصباغیرین - (آیت ۳۲)  
میں نے اس سے لگاؤ کی آس کو اپنے آپ کی حفاظت سے  
ڈگمگانے کو مگر وہ نہیں ڈگمگایا اور بچا رہا اگر وہ نہ کرے گا  
جو میں اس کو کہتی ہوں تو وہ ضرور قید کیا جاوے گا اور البتہ  
ہوگا چھٹ بھویوں میں سے آس پر حضرت یوسف کا یہ کہنا کہ -

قال رب السبجن احب الی مما تدعوننی الیه (آیت ۳۳)  
اے میرے خدا قید خانہ مجھے زیادہ پیارا ہے آس بات سے جو وہ  
مجھ سے چاہتی ہیں ، بالکل موید و مثبت آس واقعہ کا ہے جو ہم  
نے بیان کیا ہے پس ان تمام آیتوں کے ملانے سے اس واقعہ کی وہی  
تصویر سامنے آ جاتی ہے جو ہم نے بیان کی ہے -  
(ثم یدالہم من بعد ساراؤ الابات) -

اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت یوسف کے قید میں  
بھیجنے کا ارادہ مجلس دعوت کے بعد پیدا ہوا پس سوال یہ ہے کہ قید  
میں بھیجنے کی بنیاد وہی پہلا واقعہ تھا جس میں کرتا پھٹا تھا یا اور  
کوئی نیا امر پیدا ہوا ہمارے نزدیک دعوت کے جلسہ میں ان عورتوں  
کا مکر سے ہاتھ کاٹ لینا ایک نیا واقعہ حضرت یوسف کو قید میں  
بھیجنے کا پیدا ہوا لیکن مفسرین اس پہلے ہی واقعہ کو قید کا سبب  
قرار دیتے ہیں بہر حال یہ ایک ایسا خفیف امر ہے جس میں زیادہ  
بحث کی ضرورت نہیں مگر تفسیر کبیر میں جو کچھ اس کی نسبت  
لکھا ہے - اس کو اس مقام پر نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے  
چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ -

اعلم ان زوج المرأة لما ظہر لہ براءۃ ساحة یوسف  
علیہ السلام فلا جرم لم یتعرض لہ فاحتالت المرأة  
بعد ذالک لجمع الحیل حتی تخمل یوسف علیہ السلام  
علی موافقتها علی مرادھا فلم یلتفت یوسف الیہا

فلما ایستدنه احتمالت فی طریق اخری قالت لزوجهها ان هذا العبد العبرانی فضحنی فی الناس یقول لهم انی راوتہ عن نفسہ وانا لا اقدر علی اظہار عذری فاما ان تاذن لی فاخرج و اعتذرو اما ان تجسہ کما حبستنی مغند ذالک وقع فی قلب العزیز ان الاصلح حسبه حتی یسقط عن السنۃ الناس فکثر هذا لحدیث حتی تقبلی الفضيحة فہذا هو المراد من قوله - ثم بدالہم من بعد مارا والايات یسبحنہ حتی حین لان البدء عبارة عن تعین المرای عما کان علیہ فی الاول والمراد من الاية برائتہ بقدر القمیص من و یروخش الرحبہ والزام المحکم یاہا قوله انه من کید کن عظیم - (تفسیر کبیر)

جب عورت کے شوہر کو حضرت یوسف کی پاک دامنی معلوم ہوئی تو اس نے حضرت یوسف سے کچھ تعرض نہیں کیا پس عورت نے اس کے بعد ہر طرح کے حیلے کیے تاکہ یوسف اس کے ڈھب پر چڑھ جائیں - لیکن وہ بالکل ملتفت نہ ہوئے پس جب وہ مایوس ہوگئی تو ایک طریقہ نکالا اور اپنے شوہر سے کہا کہ اس عبرانی غلام نے مجھ کو لوگوں میں رسوا کیا - لوگوں سے کہتا ہے کہ میں نے اس کو بھسلایا اور میں اس کی کوئی تاویل نہیں کر سکتی یا تو مجھ کو اجازت دو کہ میں گھر سے نکل کر اس کا دفعیہ کروں یا اس کو قید کر دو جیسا کہ تم نے مجھے قید کر دیا ہے - اس بات پر عزیز مصر کو خیال ہوا کہ یوسف کا قید ہی کرنا مناسب ہے تاکہ لوگوں کی زبانوں پر یہ تذکرہ نہ رہے اور رسوائی کم ہو جائے اور خدا کے اس قول میں ثم بدالہم من بعد مارا والايات کا یہی مطلب ہے کیوں کہ بدء کے یہ معنی ہیں کہ پہلے جو رائے تھی وہ بدل جائے اور آیت سے مراد حضرت یوسف کی پاک دامنی

ہے۔ قمیص کے پیچھے کی جانب سے پھٹے ہونے سے اور فیصلہ کرنے والے کے اس الزام دینے سے کہ یہ تمہارا فریب ہے اور تمہارا فریب بہت بڑا ہے۔

اس کے بعد جو آیتیں ہیں وہ حضرت یوسف کے قید میں جانے اور دو قیدیوں اور فرعون مصر کی خوابوں کے متعلق ہیں جن کی تفسیر بیان ہو چکی ہے۔

اب تمام سورہ میں صرف دو تین مقام قابل غور باقی رہ گئے ہیں ایک یہ ”وابیضت عیناہ من الحزن فہو کظیم“ دوسرے یہ کہ ”اذہبوا بقمیصی هذا فالقوہ علی وجہہ ابی یات بصیرا۔ فلما ان جاء البشیرا التاہ علی وجہہ فاء قد بصیرا“۔ تیسرے یہ کہ ”ولما فصلت العیر قال ابوہم انی لاجد رج یوسف لولا ان تغندون“ پس اب ہم تینوں مقاموں کی تفسیر بیان کرنی چاہتے ہیں۔

’ابیضت عیناہ‘ سے زوال بصارت یعنی اندھا ہو جانا مراد لینا صحیح نہیں ہے غم سے اور زیادہ رونے سے انسان کی آنکھوں میں آس کی بینائی میں ضعف آ جاتا ہے اور آنکھوں کے ڈھیلوں میں جو سفیدی ہے آس کی رنگت اصلی سفید رنگ میں اور پر رونق نہیں رہتیں بلکہ بے رونق اور اصلی رنگ سے زیادہ سفید ہو جاتی ہیں اور تراوت کے بجائے خشکی آ جاتی ہے یہاں تک کہ آنسو نکلنے بھی موقوف ہو جاتے ہیں اور آنکھیں ڈگر ڈگر کرنے لگتی ہیں پس یہی حال حضرت یعقوب کی آنکھوں کا ہو گیا تھا قرآن مجید کے یہ الفاظ ’من الحزن فہو کظیم‘ صاف اسی مطلب کو ظاہر کرتے ہیں۔

لیکن یہ حالت دفعۃً بدل جاتی ہے جب کہ وہ غم دور ہو جاوے دل میں طاقت اور دماغ میں قوت آ جاتی ہے خون کی گردش

نیز ہو جاتی ہے اور ان سب باتوں سے آنکھوں پر رونق ہو جاتی ہے۔ ضعف بصر جاتا رہتا ہے اور اصلی بصارت پھر آ جاتی ہے اسی حالت کی نسبت یات بصیرا۔ اور فاء قد بصیرا کہا گیا ہے۔ یہ سب امور طبعی ہیں جو انسان پر ایسی حالت میں گزرتے ہیں پس کوئی ضرورت نہیں کہ ہم ان طبعی واقعات کو بے ہودہ اور بے سروپا روایتوں کی بناء پر دوراز کار قصے بناویں اور چھوٹے قصوں کو قرآن مجید کی تفسیر میں داخل کر کے کلام الہی کے ساتھ بے ادبی کریں۔

تفسیر کبیر میں بھی بعض اقوال ایسے لکھے ہیں جو بہت کچھ اس تفسیر سے جو ہم نے بیان کی ہے مناسبت رکھتے ہیں اس مقام پر ان کا نقل کرنا خالی از لطف نہ ہوگا۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ۔ انہ لما قال یا اسغنی علی یوسف غلبہ للبکاء وعند غلبۃ البکاء یکثر السماء فی العین فتصیر العین کأنھا ابیضت من بیاض ذالک السماء وقوله ابیضت عینہا من الحزن کمنایۃ عن غلبۃ البکاء والدلیل علی صحته ہذا القول ان تاثیر الحزن فی غلبۃ البکاء لا فی حصول العمی فلو حملنا الا یضا من علی غلبۃ البکاء وکان ہذا القلیل حسنا ولو حملناہ علی العمی لا یحسن ہذا القلیل فکان ما ذکرناہ اولی و ہذا التفسیر مع الدلیل رواہ الواحدی فی البسیط عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ (تفسیر کبیر)

یعنی جب حضرت یعقوب نے کہا کہ ہائے افسوس یوسف پر تو ان پر رونے نے غلبہ کیا اور رونے کے وقت آنکھ میں پانی بہت ہو جاتا ہے اور آنکھ ایسی ہو جاتی ہے گویا سپید ہو گئی ہے اس پانی سے اور خدا کا یہ قول کہ یعقوب کی آنکھیں غم سے سپید ہو

گئیں رونے کے غلبہ سے کنایہ ہے اور اس قول کے صحت کی دلیل یہ ہے کہ غم کا اثر رونے کا غلبہ ہے نہ اندھا ہو جانا پس اگر ہم سپیدی کو غلبہ بکا پر محمول کریں تو یہ تعلیل معقول نہ ہوگی۔ اس لیے ہم نے جو ذکر کیا وہی بہتر ہے اور یہ تفسیر باوجود اس دلیل کے حضرت ابن عباس سے مروی بھی ہے جیسا کہ واحدی نے بسط میں روایت کیا ہے پس اس روایت سے جو حضرت ابن عباس سے بیان ہوئی ہے صاف ظاہر ہے کہ ابیضت عیناہ سے حضرت یعقوب کا اندھا ہو جانا مراد نہیں ہے۔

ایک اور قول اسی مقام پر تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ و منهم من قال ماعمی لکنہ صار بحیث یدرک ادراکاً ضعیفاً۔ (تفسیر کبیر) بعضوں نے کہا ہے کہ وہ اندھے نہیں ہو گئے تھے بلکہ ان کو نظر آنا تھا لیکن کم نظر آتا تھا۔

اس کے بعد تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ - فارقد بصیرا ای رجع بصیراً و معنی الارتداد انقلب الشی الی حالة قد کان علیہا وقولہ فارتد بصیرا ای صیرہ اللہ بصیرا کہا یقال طالت الذخلة والله تعالی اطالها واختلّفوا فیہ فقال بعضهم انه كان قد عمی بالکلیۃ فالله تعالی جعلہ بصیرا فی هذا الوقت قال آخرون بل كان قد ضعف بصره من كثرة البكاء وكثرة الاحزان فلما القوا القميص علی وجهه وبشر بحياة یوسف علیہ السلام عظم فرحه و انشرح صدره و زالت احزانه فضاء ذالك قوی بصره و زال النقصان عنه۔ (تفسیر کبیر)

یعنی پھر وہ بصیر ہو گئے اور ارتداد کے معنی کسی شے کا اس حالت پر واپس آ جانا ہے جو پہلی تھی اور خدا کا یہ قول فارتد قد بصیرا اس کے یہ معنی ہیں کہ خدا نے ان کو بصیر کر دیا،

جیسا کہ محاورہ میں کہتے ہیں کہ کھجور لمبی ہو گئی اور خدا نے اس کو لمبی کر دیا اور اس میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے سو بعضوں نے کہا کہ وہ بالکل اندھے ہو گئے تھے اور اللہ نے ان کو اس وقت بصیر کر دیا اور بعضوں نے کہا ہے کہ ان کی نگاہ زیادہ رونے سے اور غم سے ضعیف ہو گئی تھی پس جب ان پر کرتہ ڈالا اور یوسف کی زندگی کی خوش خبری دی تو ان کو بہت خوشی حاصل ہوئی اور ان کا سینہ کھل گیا اور غم جاتا رہا۔ پس ان کی نگاہ ٹھک ہو گئی اور جو نقصان تھا جاتا رہا۔

اب 'لا جدریج یوسف' پر غور کرنی باقی ہے۔ یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب کو اس بات پر کہ حضرت یوسف کو بھیڑیا کہا گیا ہرگز یقین نہیں تھا اور وہ بلاشبہ ان کو زندہ سمجھتے تھے اور ایسے موقع پر یہی خیالات ہوتے ہیں کہ وہ کہیں چلا گیا ہوگا اور کسی نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا ہوگا یا بطور غلام کے بیچ ڈالا ہوگا اور اس زمانہ کی حالت کے موافق یہ اخیر خیال زیادہ قوی ہوگا آنہی وجوہات سے ان کو ہمیشہ یوسف کی تلاش رہتی تھی اور ہمیشہ اس کے ملنے کی توقع رکھتے تھے اور ان کے تلاش کرنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ یہ ایسا امر ہے جو ہمیشہ ہوتا ہے اس زمانہ میں بھی اگر کسی کا لڑکا گم ہو جاتا ہے یا کہیں نکل جاتا ہے تو ہمیشہ اس کی تلاش میں رہتا ہے اور اس سے ملنے یا اس کے مل جانے کی توقع رکھتا ہے۔

اس زمانہ میں مصر کی ایسی حالت تھی کہ لڑکے اور لڑکیوں کو پکڑ لے جا کر وہاں بیچ ڈالنا زیادہ قرین قیاس تھا اور کچھ تعجب نہیں ہے کہ حضرت یعقوب کو بھی یہ خیال ہو کہ کسی شخص نے یوسف کو پکڑ لیا ہو اور مصر میں لے جا کر بیچ ڈالا ہو۔ تفسیر کبیر میں ایک روایت لکھی ہے گو اس روایت کا طرز



بیان کیسا ہی فضول ہو مگر اس کی فضولیات چھوڑ کر دو نتیجے اُس سے نکالے جا سکتے ہیں ایک یہ کہ حضرت یعقوب کو یوسف کے زندہ ہونے کا یقین تھا دوسرے یہ کہ اُن کو یوسف کے مصر میں ہونے کا احتمال تھا اور وہ روایت یہ ہے کہ - قال یعقوب علیہ السلام و اعلم من الله مالا تعلمون ای اعلم من رحمة و احسانه مالا تعلمون وهو انه تعالى یاتیننی بالفرح من حیث لا احتسب فهو اشارة الى انه كان بتوقع وصول یوسف الیه و ذکر والسبب هذا التوقع امورا احدها ان ملک الموت اتاه فقال له یا ملک الموت هل قبضت روح ابنی یوسف قال لا یا نبی الله ثم اشار الى جانب مصر وقال اطلبه ههنا - (تفسیر کبیر) - یعنی حضرت یعقوب نے کہا کہ میں خدا کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے یعنی میں خدا کا وہ احسان اور رحمت جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور وہ یہ ہے کہ خدا میرے لیے خوشی لائے گا اور مجھے پہلے سے اس کی کچھ خبر نہ ہوگی پس یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حضرت یعقوب یوسف کے ملنے کی امید رکھتے تھے اور لوگوں نے اس امید کے مختلف وجوہ بیان کیے ہیں ایک یہ کہ ملک الموت ان کے پاس آیا تو اُن سے یعقوب نے پوچھا کہ تم نے میرے بیٹے کی روح قبض کر لی اُنہوں نے کہا اے خدا کے پیغمبر! نہیں - پھر ملک الموت نے مصر کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ ادھر تلاش کیجیے -

بلاشبہ حضرت یعقوب نے مصر میں بھی تلاش کی ہوگی مگر وہ عزیز مصر کے ہاتھ بیچے گئے تھے اور محلوں میں داخل تھے اور ایک مدت تک قید رہے ان کا پتہ نہیں لگ سکتا ہوگا مگر جب حضرت یوسف کے بھائی مصر میں گئے اور حضرت یوسف بھی اُس زمانہ

میں عروج کی حالت میں تھے اور رعایت اور سلوک جو انہوں نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا تھا اور پھر اپنے حقیقی بھائی کے لانے کی بھی تاکید کی تھی اور کچھ حالات بھی اُن کے سننے ہوں گے تو ان کے بھائیوں اور ان کے باپ کے دل میں ضرور شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ کہیں یہ یوسف ہی نہ ہو مگر جس درجہ شامی پر اُس وقت حضرت یوسف تھے یہ شبہ پختہ نہ ہوتا ہوگا اور دل سے نکل جاتا ہوگا ۔

اس بات کا ثبوت کہ یوسف کے بھائیوں کے دل میں بھی شبہ تھا کہ وہ یوسف ہی نہ ہو خود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے کیوں کہ جب حضرت یوسف نے اُن سے کہا کہ ”تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا تو بغیر اس کے کہ حضرت یوسف کہیں کہ میں یوسف ہوں اُن کے بھائی بول اٹھے کہ اے انکس لانت یوسف یعنی کیا سچ مچ تم یوسف ہو ۔ اسی طرح حضرت یعقوب کے بیٹوں کے مصر میں آنے جانے اور حالات سننے سے یوسف کی نسبت مصر میں ہونے بلکہ یوسف کے یوسف ہونے کا شبہ قوی ہو جاتا تھا اس امر کی تقویت کے علاوہ اس پہلی روایت کی موید چند اور روایتیں تفسیر کبیر میں موجود ہیں ۔

ایک روایت یہ ہے کہ ۔ قال السدی لما اخبرہ بنوہ بسیرۃ الملک و کمال حالہ فی اقوالہ و افعالہ طمع ان یکون ہو یوسف و قال یبعدان یظہر فی الکفار مثله ۔ (تفسیر کبیر)

یعنی سدی کا قول ہے کہ جب حضرت یعقوب کو ان کے بیٹوں نے عزیز مصر کے صفات اور ان کے اقوال و افعال کے کمال سے مطلع کیا تو ان کو آمید ہوئی کہ وہ یوسف ہی ہوں گے اور

یہ کہا کہ کافروں میں تو ایسا شخص پیدا نہیں ہو سکتا ۔  
ایک یہ کہ : علم قطعاً ان بنیامین لا یسرق وسمع  
ان المملک ما اذاه ویا ضربہ فغلب علی ظنہ ان  
ذالک المملک ہو یوسف (تفسیر کبیر) ۔ یعنی انہوں نے  
قطعاً جان لیا کہ بنیامین چوری نہیں کر سکتا اور یہ سنا کہ بادشاہ  
نے اس کو نہ ستایا نہ مارا پس اُن کو گمان غالب ہوا کہ یہ  
بادشاہ یوسف ہی ہوگا ۔

ایک یہ ہے کہ : انه رجع الی اولاده وتکلم معہم علی  
سبیل اللطف وهو قولہ یابنی اذہبوا فتحسسوا من  
یوسف و اخیہ واعلم انه علیہ السلام لما طمع فی  
وجدان یوسف بناء علی الاسارات المذكورة قال لبنیہ  
تحسسوا من یوسف ۔ (تفسیر کبیر)

یعنی وہ اپنی اولاد کی طرف مخاطب ہوئے اور ان کے ساتھ  
مہربانی سے باتیں کیں جیسا کہ خدا نے کہا اذہبوا فتحسسوا  
من یوسف و اخیہ ۔ اور جان تو کہ حضرت یعقوب کو جب  
اُن نشانہوں کی امید بندھی تو انہوں نے بیٹوں سے کہا کہ یوسف  
کا پتہ لگاؤ ۔

پس جب کہ حضرت یعقوب کا شبہ اس قدر قوی ہو گیا اور  
جو مہربانی یوسف نے اپنے بھائی کے ساتھ کی تھی اس کو سن کر  
ان کو گمان غالب ہو گیا تھا کہ وہ بنیامین کا بھائی یوسف ہے تو  
ان کو یقین کامل ہوا کہ اب کے جو قافلہ واپس آوے گا تو ٹھیک  
خبر یوسف کی لاوے گا جب کہ تیسری دفعہ یہ لوگ مصر میں  
گئے تو حضرت یوسف نے سب کے سامنے کہہ دیا تھا کہ میں  
یوسف ہوں اور حضرت یعقوب کو معہ تمام کنبہ کے بلانے کے  
لیے کہا تھا اور ان کے لیے بہت سا سامان مہیا کرنے کو حکم دیا

تھا جس کے لیے کچھ عرصہ لگا ہوگا اس عرصہ میں حضرت یوسف کے مصر میں موجود ہونے کی خبر افواہاً حضرت یعقوب کو پہنچ گئی ہوگی اُس افواہ پر ان کو یقین ہوا اور انہوں نے فرمایا کہ ”انی لا جدریج یوسف لولا ان تفسندون“ یعنی میں پاتا ہوں خبر یوسف مئی اگر تم مجھ کو بہکا ہوا نہ کہنے لگو۔

ہم کو نہیں معلوم کہ قرآن مجید میں کہیں ”ریح“ کا لفظ بمعنی بو کے آیا ہو اس مقام پر ”ریح“ کا لفظ یوسف کی طرف مضاف ہے تو اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں اور کہیں بھی ریح کا لفظ کسی شخص یا اشخاص کی نسبت مضاف ہو کر آیا ہے یا نہیں اگر آیا ہے تو اس کے کیا معنی ہیں تلاش کے بعد ہم کو یہ آیت ملی و اطيعوا اللہ و رسوله ولا تنازعوا فتفشلوا و تذہب ریحکم - (سورہ انفال آیت ۴۸) یعنی جاتی رہے گی ہوا تمہاری یعنی قوت و اتفاق کی جو خبر مشہور ہے اُس کی شہرت جاتی رہے گی۔

علاوہ اس کے خود ریح کو بشرایا یعنی خبر دینے والی خدا نے کہا ہے ”هو الذی یرسل الریاح بشرایا بین یدی رحمته۔ (سورہ اعراف آیت ۵۵) اور ریح کو مبشرات بھی کہا ہے یعنی خبر دینے والیاں ”ومن آیاتہ ان یرسل الریاح مبشرات“ (سورہ لقمان آیت ۴) پس ریح یوسف سے صاف مراد اُس افواہی خبر سے ہے جس سے یوسف کا ہونا حضرت یعقوب نے سنا تھا۔

مفسرین کے دل میں یہ کہانی بسی ہوئی تھی کہ جب حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا ہے تو حضرت جبریل نے بہشت سے ایک قمیص لا کر حضرت ابراہیم کو پہنا دیا تھا جس کے سبب سے وہ آگ میں نہیں جلے۔ وہ قمیص حضرت اسحاق اور آن کے بعد حضرت یعقوب کے پاس آیا حضرت یعقوب نے اس کو بطور

تعویذ کے چاندی میں منڈھ کر حضرت یوسف کے گلے میں لٹکا دیا جب ان کو اندھے کنوئیں میں ڈالا ہے تو وہ تعویذ اُن کے گلے میں رہ گیا تھا وہی قمیص اُنہوں نے بھیجا تھا جب وہ نکلا تو ہوا لگ کر تمام دنیا میں بہشت کے قمیص کی خوشبو پھیل گئی اوروں نے تو جانا کہ کاکھ کی بو ہے مگر حضرت یعقوب نے بو کو پہچان لیا اور جان گئے کہ بہشت کی یا یوسف کے قمیص کی ہے پس اس خیال پر قرآن مجید میں بھی ریح کے معنی بو قرار دے دیے۔ یہ قصہ تفسیر کبیر میں بھی مندرج ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس پر یقین نہیں کر سکتے جو اپنا کرتا کہ انہوں نے بھیجا تھا وہ بلاشبہ ایک شاہانہ کرتا ہوگا اور صرف بطور نشانی کے بھیجا تھا کوئی اور عجیب بات اس کرتے میں نہ تھی بہ جز اس کے کہ اُس سے حضرت یعقوب کو پورا یقین اور ان کے دل کو تسلی ہو جاوے کہ یوسف زندہ ہے اور ایسے عالی درجہ پر خدا نے اس کو پہنچا دیا ہے۔

(لقد کان فی قیصصہم عبرۃ) اب ہم کو غور کرنی چاہیے کہ اس قصے میں عبرت پکڑنے کی کیا چیزیں ہیں۔ مفسرین نے جو کچھ لکھا ہو لکھا ہو مگر چند باتیں بلاشبہ اس میں نہایت عبرت پکڑنے کی ہیں۔

سب سے اول حضرت یوسف کی پاک دامنی ہے حضرت یوسف جوان تھے اور انسان کا نفس اشارہ جوانی کے زمانہ میں ادنیٰ سی بات میں پاک دامنی سے ڈگمگا دیتا ہے۔ حضرت یوسف کو اس ڈگمگا دینے کی اس قدر زیادہ ترغیبیں تھیں۔ جو بہت کم کسی انسان کو ہو سکتی ہیں۔ عزیز مصر کی عورت جو ایک بادشاہ کی بیگم ہونے کا درجہ رکھتی تھی اس کی خواست گار تھی وہ خود بھی جوان اور خوب صورت تھی دنیا کی تمام نعمتیں یوسف کو

دینے پر موجود تھی - وہ اور یوسف ایک محل میں رہتے تھے جب چاہیں تنہائی میں مل سکتے تھے متعدد دفعہ وہ عورت اس طرح پیش آئی کہ اس حالت میں ایک جوان مرد کا ایک جوان عورت کی خواہش کا نہ پورا کرنا اگر نا ممکن نہیں تو حد سے زیادہ مشکل ہے اور باوجود ان باتوں کے حضرت یوسف کا صرف خدا کے ڈر سے اور اس احسان مندی کی وجہ سے کہ اُس کے شوہر نے مجھے خریدا ہے اور پرورش کیا ہے اور اپنے گھر میں رکھا ہے میں کیوں کر اس کی خیانت کر سکتا ہوں پاک دامن رہنا بے انتہا غور کرنے اور نصیحت پکڑنے کے قابل ہے ادھر خدا کا خوف اور خدا کے احکام کی اطاعت نصیحت دیتی ہے اور ادھر محسن کے احسان کو کبھی نہ بھولنا اور قدرتی جذبات انسانی پر بھی احسان مندی کو غالب رکھنا انسانوں کے واسطے بہت بڑی نصیحت ہے -

جب عزیز مصر کی عورت نے کہا کہ اگر تو میری بات نہ مانے گا تو میں تجھ کو قید خانہ میں بھیج دوں گی اور ذلیل کر دوں گی تو یوسف نے اُس مصیبت اور دقت کو گوارا کر کے کس سچے دل اور خلوص نیت سے کہا کہ اے میرے پروردگار قید خانہ مجھ کو بہت پیارا ہے اُس بات سے جو وہ مجھ سے چاہتی ہے - یہ قول حضرت یوسف کا کس قدر دل میں اثر کرنے والا اور عبرت اور نصیحت دینے والا ہے -

باپ سے کم سنی میں مفارقت ، بھائیوں کا ظلم ، اندھے کنوئیں ڈال دیے جانے کی مصیبت ، بطور غلام کے پکڑے جانے اور بیچے جانے کی ذلت اور پھر عیش و آرام میں آکر قید خانہ میں ڈالے جانے کی ذلت و مصیبت سب کو صبر سے سہنا اور ہر حالت میں خدا کی مرضی پر راضی رہنا کبھی اُس کی شکایت نہ کرنا کیا انسانوں کے لیے عمدہ سے عمدہ نصیحت نہیں ہے -

اُس کے بعد جب یوسف بادشاہت کے درجہ پر پہنچ گئے اور بھائیوں پر بخوبی قابو پایا تو ان کے تمام ظلموں کو جو اُن کے ہاتھ سے سہے تھے اور ان کی تمام برائیوں اور بد سلوکیوں کو یک لخت بھلا دینا اور نہایت اخلاق و محبت سے اُن کے ساتھ پیش آنا اور نہایت مصیبت کے وقت پے در پے اور طرح بطرح سے ان کے ساتھ سلوک کرنا دنیا میں ان کی خطاؤں سے در گذر کرنا اور عاقبت میں ان کے گناہوں کی معافی چاہنا کیا انسانوں کے لیے اپنے اخلاق درست کرنے کے لیے کچھ کم نصیحت ہے۔

ماں باپ کی خدمت اور تعظیم و ادب جو عین بادشاہت کے درجہ پر پہنچ کر حضرت یوسف نے ادا کیا ہمارے لیے کیسی عمدہ نصیحت ہے۔

حضرت یوسف کے بھائیوں نے جو بد سلوکی اپنے بھائی اور اپنے بڑھے باپ کے ساتھ کی اور آخر کار اس سے نادام اور پشیمان ہوئے کیا ہمارے لیے ایسے یا اس کی مانند کاموں سے بچنے کے لیے عمدہ نصیحت نہیں ہے۔

حضرت یعقوب کو اس واقعہ سے جو رنج پہنچا اور زمانہ دراز تک اُس رنج و مصیبت میں مبتلا رہے مگر ہر حال میں خدا ہی کو یاد رکھا اسی سے کہا جو کچھ کہا اسی سے توقع رکھی جو توقع رکھی اور اگر کوئی لفظ زبان سے نکلا تو یہی نکلا کہ انما اشکوا بثی و حزنی الی اللہ تو کیا ان کی یہ حالت ہم کو خدا کی مرضی پر راضی اور احسان کا شکر ادا کرنے اور اس کے رحم کے ہر حالت میں متوقع رہنے کے لیے کیسی کچھ نہایت موثر نصیحت نہیں ہے۔

پھر اس چھوٹی صورت اور مختصر الفاظ میں ان واقعات کو کو ایسی عمدگی سے بیان کیا ہے کہ لفظوں پر غور کرنے سے ہر

ایک بات کی تفصیل اور جزئیات اور انسانی جذبات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے بندھ جاتا ہے اور وہ واقعات دل میں اثر کرتے ہیں اور خدا کے اس فرمانے پر کہ - مَا كَانَ حَدِيثًا يَفْتَرِي وَلَكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ - دل سے ایمان آ جاتا ہے -

---



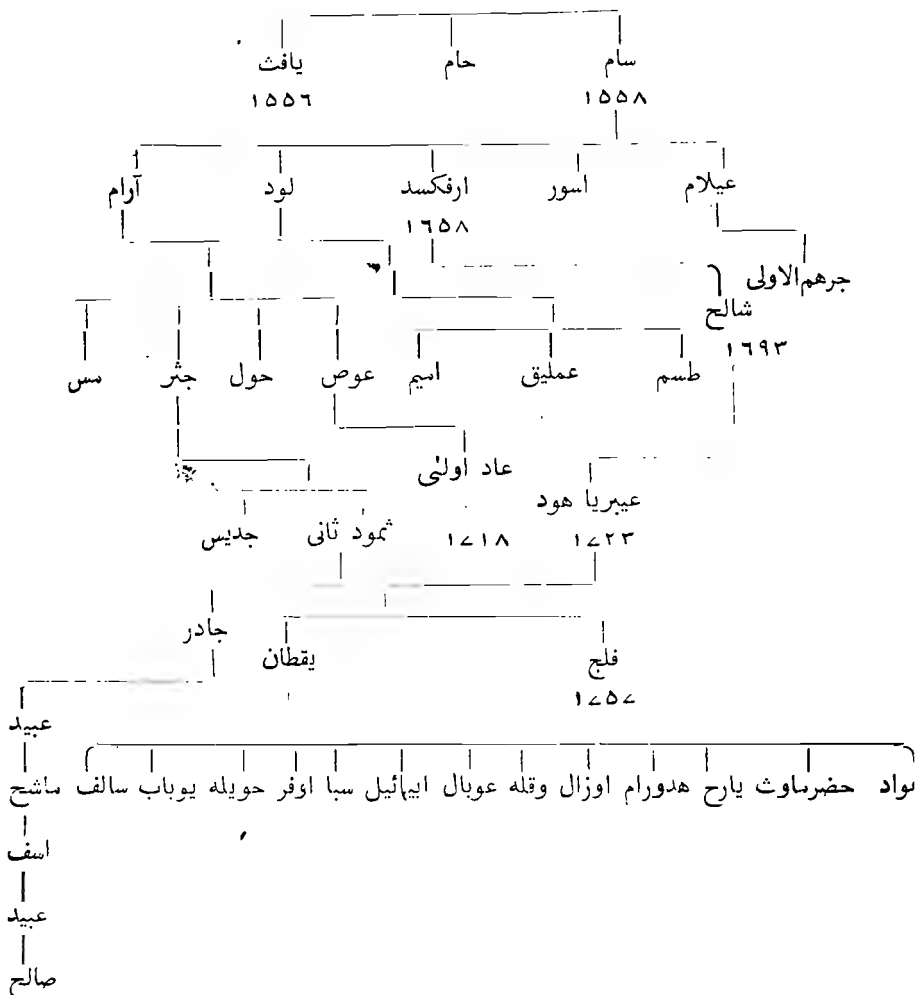
# قوم عاد اور قوم ثمود کے حالات

(سرسید کا ایک نہایت تحقیقی مضمون)

عاد اور ثمود کی نسبت کچھ لکھنے سے پہلے مندرجہ ذیل شجرہ انساب لکھنا مناسب ہے۔ - (سید احمد)

نوح

۱۰۵۶ء (دنیایوی)



## قوم عاد اولیٰ

عاد اولاد سام بن نوع سے ہے۔ سام کا بیٹا آرام اور اس کا بیٹا عوص اور اس کا بیٹا عاد۔ معالم التنزیل میں لکھا ہے و هو عاد بن عوص بن آرام بن سام و هم عاد الاولیٰ۔ قوم عاد کی آبادی عربیا ڈرزا یعنی عرب کے ریتلے میدان میں تھی اور الاحقاف کہلاتی تھی معالم التنزیل میں لکھا ہے۔ کانت منازل قوم عاد بالاحقاف وہی رسال بین عمان و حضر موت۔ عرب کے نقشہ میں جو ریگستان پچاس درجہ طول اور بیس درجہ عرض پر واقع ہے وہ جگہ الاحقاف ہے جہاں قوم عاد آباد تھی۔

یہ قوم عاد اولیٰ کہلاتی ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہے۔ ”وانہ اہلک عاد الاولیٰ“ (سورہ نجم آیت ۵۱) ثمود جس کا ذکر آگے آئے گا وہ عاد ثانی کہلاتا تھا اور ایک تیسرا عاد ہے جو عبد شمس یعنی سبا اکبر کی اولاد میں ہے اور جس کا بیٹا شداد ہے جو سنہ ۲۰۹۲ دنیوی میں پیدا ہوا تھا پہلی دونوں قومیں عاد کی حضرت ابراہیم سے پہلے تھیں اور تیسری قوم حضرت ابراہیم کے زمانہ میں۔ ہمارے مفسروں نے علاوہ ان لغو قصوں کے جو قوم عاد کی نسبت لکھے ہیں ایک اور غلطی یہ کی ہے کہ ان تینوں قوموں کے واقعات کو گڈ مڈ کر دیا ہے۔

قوم عاد اولیٰ کا واقعی زمانہ بتلانا نہایت مشکل ہے مگر انگریزی مورخوں نے جو توریت میں بیان کیے ہوئے حساب کے زمانے قائم کیے ہیں اسی حساب کی بنا پر ہم بیان کرتے ہیں کہ سام ۱۵۵۸ دنیوی میں پیدا ہوا تھا اور ارفکسد جو آرام کا بھائی ہے ۱۶۵۸ دنیوی میں یعنی سو برس بعد پس یہی زمانہ قریباً آرام کی پیدائش کا خیال ہو سکتا ہے اور عاد دو پشت بعد آرام سے ہے پس اگر ساٹھ برس دو پشت کے لیے ہم اضافہ کریں تو ظاہر

ہوتا ہے کہ عاد ۱۷۱۸ء دنیوی یعنی اٹھارہویں صدی دنیوی میں  
ہوا تھا۔

ہود جن کا نام توریت میں عیبر لکھا ہے وہ بھی اولاد سام  
بن نوح سے ہیں عیبر کی پیدائش توریت کے حساب سے ۱۷۲۳  
دنیوی کی ہے اور اس سے ثابت ہے کہ عاد اور ہود ایک ہی  
زمانہ میں تھے اسی صدی میں نمرود نے بابل یا سریا میں  
بادشاہت قائم کی تھی اور حام پدر مصریم نے مصر میں اور عاد بن  
عوص نے الاحقاف میں اور عیبر یعنی ہود کے بیٹے یقطان نے یمن  
اور اس کے اطراف میں۔ حضر موت یقطان کا ایک بیٹا تھا جس کے  
نام سے یمن کے قریب کا وہ ملک جو انڈین اوشن یا بحر عرب کے  
کنارہ پر ہے مشہور ہے۔

یہ قوم عاد اولیٰ کی نہایت قوی اور قد آور تھی جیسے کہ  
اب بھی بعض ملکوں کے لوگ قوی اور قد آور ہوتے ہیں یہی بات  
خدا تعالیٰ نے اس قوم کی نسبت فرمائی ہے ”و زادکم فی الخلق  
بصطة (سورہ اعراف ۶۷) ان کے قد معمولی قد آور آدمیوں سے  
زیادہ نہ تھے۔ تفسیروں میں جو یہ بات لکھی ہے کہ چھوٹے سے  
چھوٹا آدمی ان میں کا ساٹھ ذراع کا لمبا تھا اور اوسط آدمی سو  
ذراع کا لمبا تھا اور لمبے سے لمبا چار سو ذراع کا محض غلط ہے۔  
نہ قرآن مجید سے یہ ثابت ہے نہ اور کسی سند سے۔ قدیم علماء نے  
بھی اس سے انکار کیا ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ۔ وقال  
قوم یحتمل ان یکون المراد من قوله وزادکم فی الخلق  
بصطة کونہم من قبيلة واحدة متشاکین فی القوة والشدة  
والجلادة وکون بعضهم محبا للباقین ناصر الهم و  
زوال العداوة والخصومة من بینہم فانہ تعالیٰ لما  
خصہم بهذه الانواع من الفضائل والمناقب فقد قرر

لہم حصولہا فصیح ان یقال و زادکم فی الخلق بسطة  
(تفسیر کبیر) یعنی عالموں نے ”زادکم فی الخلق بصطة“ سے  
آن کا زیادہ وہ قوی ہونا مراد لیا ہے نہ لمبا قد ہونا۔ بعض  
عالموں نے ان لفظوں سے یہ مراد لی ہے کہ اس قوم کے لوگ  
کثرت سے تھے اور آپس میں محبت رکھتے تھے اور ایک دوسرے  
کے مددگار ہوتے تھے اور اس ارتباط کے سبب سے گویا ایک جسم  
ہو گئے تھے نہ یہ کہ آن کے قد بہت لمبے تھے اور وہ تمام دنیا کے  
لوگوں سے زیادہ چوڑے چکے تھے۔

سورة الفجر میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے ”الم ترکیف  
فعل ربک بعباد ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلہا  
فی البلاد۔“

اس آیت میں بھی اسی قوم عاد اولیٰ کا تذکرہ ہے۔ ارم عاد  
کے دادا کا نام ہے جو کہ متعدد قومیں عاد کے نام سے مشہور تھیں  
جیسے کہ ہم نے اوپر بیان کیا اسی لیے خدا تعالیٰ نے ایک  
جگہ اس قوم کو عاد اولیٰ کر کے بیان کیا اور اس جگہ اس کے  
دادا کے نام سے۔ پس ارم بیان ہے یا بدل ہے لفظ عاد سے یعنی ارم  
کی اولاد والا۔ عاد ذات العباد سے بھی اسی طرح آن کا قوی اور قد آور  
ہونا بتایا ہے جیسے کہ لفظ زادکم فی الخلق بسطة سے بتایا ہے۔  
لفظ لم یخلق مثلہا فی البلاد سے صاف پایا جاتا  
ہے کہ عاد سے آن کے مخلوق قد مراد ہیں نہ کسی مکان  
کے مصنوعی ستون۔ چنانچہ اکثر تفسیروں میں اور نیز  
تفسیر کبیر میں ہے اسی کے مطابق علماء و مفسرین کے اقوال  
نقل کیے ہیں مگر اس کے سوا اور قول بھی ہیں جن میں غلطی  
سے ارم کو شہر کا نام سمجھا ہے اور ”ذات العباد“ سے عمارات  
رفیعہ مراد لی ہے اور یہ محض غلط ہے اس لیے کہ قوم عاد اولیٰ

ریگستان میں رہتی تھی اور اُن کی کوئی عالی شان عمارتیں نہ تھیں۔ بعض عالموں نے غلطی پر غلطی یہ کی ہے کہ ارم کو باغ تصور کیا ہے اور لکھا ہے کہ عدن کے پاس شداد نے بنایا تھا مگر یہ محض ناواقفیت سے لکھا ہے شداد کے باپ کا نام بھی عاد ہے مگر وہ اُس زمانہ میں نہ تھا اور نہ اس نے کوئی ایسا باغ جیسا کہ مفسرین بیان کرتے ہیں بنایا تھا۔

بعض مفسرین کی یہ رائے ہے کہ قوم ارم خیموں میں رہتی تھی اور خیموں میں ضرور ہے کہ عاد یعنی استا دے ہوں جن پر خیمے کھڑے ہوتے ہیں اور عمد کی جمع عاد آئی ہے مگر اس رائے سے یہ الفاظ قرآن مجید کے کہ ”لَمْ يَخْلُقْ مِثْلَهَا فِي الْبِلَادِ“ مساعدت نہیں کرتے۔ رورنڈ فارسٹر نے ایک تاریخانہ جغرافیہ عرب کا لکھا ہے اور اُس میں نویری کے تاریخانہ جغرافیہ سے بعض حالات نقل کیے ہیں ۶۶۰ عیسوی اور ۶۷۰ عیسوی کے درمیان یعنی مطابق ۳۵۰ و ۵۰۰ ہجری کے معاویہ ابن ابی سفیان کے عہد حکومت میں عبدالرحمان یمن کا حاکم تھا اُس نے چند کتبے قدیم زمانہ کے یمن و حضر موت کے نواح کے کھنڈرات میں پائے تھے اور پڑھے گئے تھے اور لوگوں نے خیال کیا تھا کہ یہ کتبے قوم عاد کے زمانہ کے ہیں۔ اُن کا عربی ترجمہ نویری کے جغرافیہ میں مندرج ہے اُن میں سے چند کتبوں کے ترجموں کو اُس کتاب سے ہم اس مقام پر لکھتے ہیں :

ترجمہ کتبہ اول مندرجہ جغرافیہ نویری

غنینا زمانا فی عراصة ذا القصر  
بعیش غیمہرضنک ولا نذر  
یفیض علینا البحر بالمد زاجرا  
فانہارنا مبزعة یجر

خلال نخيل باسقات نواطرها  
 تفق بالقصب المجزع والتمر  
 تصطاد صيد البر بالنخيل والقنا  
 وطور انصيد النون من لجج الجر  
 و نرفل في الخزا المرقم تارة  
 وفي القزاحيانا وفي الحلل الخضر  
 يلينا ملوك يبعدون عن الخنا  
 شديد على اهل الخيانة والعذر  
 يقيم لنا من دين هود شرايعا  
 ونومن بالايات والبعث والنشر  
 اذا ما عدو حل ارضا يريدنا  
 بزرنا جميعا بالمشقة السمر  
 نحامسى على ادلائنا و نساءنا  
 على الشهب والكميق المنيق والشعر  
 نقارح من يبغى علينا ويعتدى  
 باسيافنا حتى يولون يالدبر

دوم - ترجمه كتبه مندرجه جغرافيه نویری

غنينا بهذا القصر و هو اقلم يكن  
 لنا همة الا البلد ذو القطف  
 تروح علينا كل يوم هنييدة  
 من الابل يعشق في معاطننا الطرف  
 واضعاف تلك الابل شاء كانها  
 من الحسن ارام او البقر القطف  
 فعشتا بهذا القصر سبعة احقب  
 باطيب عيش جبل عن ذكره الوصف

فجات سنون مسجديات قواحل  
اذا مامضا علم اتى اخر يقفو  
فظلنا كان لم تغن في الخير لمحة  
فما تواو لما يبق خف ولا ظلف  
كذلك من لم يشكر الله لم يزل  
معالمه من بعد ساحتہ تعفو

سوم - کتبہ مندرجہ کتاب ابن هشام

قال ابن هشام حضر السيل عن قبر باليمن فيه امرأة  
في عنقها سبع مخانق من برو في يديها ورجليها من  
الاسورة والخلاخيل والد ماليج سبعة سبعة وفي كل اصبع  
خاتم فيه جوهرة مشمعة و عند راسها تابوت - مملوما  
لا و لوح فيه مكتوب -

باسمک اللہم الہ حمیر

انا تاجۃ بنت ذی شفر بعثت ما یرنا الی یوسف  
فابطا علینا فبعثت لا ذی  
بمد من ورق لتا تینی بمد من طحن  
فلم تجده فبعثت بمد من ذهب  
فلم تجده فبعثت بمد من بحری  
فلم تجده نامرت به فطحن  
فلم انتفع به فاقفالت  
فمن سمع بی فلیر حمنی  
واية امرأة لیست حلیا من حلی  
فلا ماتت الامیتی

۱۸۳۴ء میں سرکار انگریزی نے یمن کی پیمائش کے لیے کچھ  
افسر بھیجے انھوں نے حضرموت میں جو سمندر کے کنارے پر ہے

ایک پہاڑ پر ایک قلعہ کے کھنڈرات معلوم کیے اور ان کھنڈرات میں پتھر پر کھدے ہوئے کتبے دیکھے تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ قلعہ حصن غراب کے نام سے مشہور ہے (طول بلد ۸۴ درجہ ۳۰ دقیقہ اور عرض بلد ۱۴ درجہ) - وہاں ایک اونچی جگہ پر ایک کتبہ ملا - پرانے حرفوں میں پتھر پر کھدا ہوا جو حرف کہ کوفی حرفوں سے بھی بہت پہلے کے ہیں اور اس سے کسی قدر نیچے ایک اور کتبہ پایا اور ایک پہاڑی کی چوٹی پر ایک اور چھوٹا سا کتبہ ملا - علاوہ اس کے حصن غراب سے پچاس میل کے فاصلہ پر اور کھنڈرات ملے - لقب الحجر کے نام سے اور اس کے دروازہ پر ایک کتبہ ملا ان کتبوں کی بعینہ نقل کر لی گئی -

ان کتبوں کی تحقیقات ہوتی رہی جب وہ پڑھے گئے تو معلوم ہوا کہ نویری کے جغرافیہ میں جو کتبہ ہے وہ ترجمہ ہے حصن غراب کے بڑے کتبہ کا چنانچہ اصل کتبہ کا ترجمہ انگریزی میں کیا گیا جس کا اردو ترجمہ ہم اس مقام پر لکھتے ہیں -

### ترجمہ حصن غراب کے بڑے کتبہ کا

ہم رہتے تھے رہتے ہوئے مدت سے عیش و عشرت میں زمانہ میں اس وسیع محل کے ہماری حالت بـری تھی مصیبت اور بدبختی سے بہتا تھا ہمارے تنگ راستہ میں -

سمندر زور سے لہراتا ہوا اور غصہ سے ٹکراتا ہوا ہمارے قلعہ سے - ہمارے چشمے بہتے تھے - گنگناقی ہوئی آواز سے گرتے تھے - کھجور کے بلند درختوں سے اوپر جن کے رکھوالے کثرت سے بکھیرتے تھے خشک کھجور (یعنی آن کی گٹھلیاں) ہماری گھاٹی کی کھجور کی زمین میں وہ اپنے ہاتھ سے پھیلاتے تھے سوکھے چانول (یعنی بوتے تھے) -

ہم شکار کرتے تھے پہاڑی بکروں کو اور نیز خرگوش کے



بچوں کو پہاڑیوں رسیوں اور سرکنڈوں سے بھگا کر ہلاتے تھے جھگڑتی ہوئی مچھلیوں کو۔

ہم چلتے تھے آہستہ مغرور چال سے پہنے ہوئے سوئی کے کام کیے ہوئے مختلف رنگ کے ریشمی کپڑے بالکل ریشم کے کاہی سبز رنگ کی چارخانہ دار پوشاک۔

ہم پر حکومت کرتے تھے بادشاہ جو بہت دور تھے ذلت سے اور سخت سزا دینے والے تھے بدکار اور منکر آدمیوں کے اور انہوں نے لکھی ہمارے واسطے مطابق اصول ہود کے۔

عمدہ فتویٰ ایک کتاب میں محفوظ رہنے کے لیے اور ہم یقین کرتے تھے معجزہ کے بھید میں مردوں کے بھید میں اور ناک کے سوراخ کے بھید میں۔

ایک حملہ کیا لیٹروں نے اور ہم کو ایذا پہنچاتے ہم اور ہمارے فیاض نوجوان جمع ہو کر چلے معہ سخت اور تیز نوکدار برچھیوں کے آگے کو جھپٹتے ہوئے۔

مغرور اور بہادر حایتی ہمارے خاندانوں اور ہماری بیویوں کے لڑتے ہوئے دلیری سے گھوڑوں پر سوار جن کی لمبی گردنیں تھیں اور جو سمندر اور لوہیا رنگ اور سرنگ تھے۔

ہم اپنی تلواروں سے زخمی کرتے ہوئے اور چھیدتے ہوئے اپنے دشمنوں کو یہاں تک کہ دھاوا کر کے ہم نے فتح کیا اور کچل ڈالا ان ذلیل آدمیوں کو۔

ترجمہ آس کتبہ کا جو اس کتبہ کے نیچے کھدا ہوا ہے

علیحدہ حصوں میں تقسیم کیا گیا اور لکھا گیا۔ سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ کی طرف اور نقطہ لگے ہوئے یہ گیت فتح کا سرش

اور زرغانے عوص نے چھید ڈالا (یعنی زخمی کر دیا) اور تعقب کیا بنی عک کا اور اُن کے چہروں کو سیاہی سے بھر دیا -

ترجمہ چھوٹے کتبہ کا جو پہاڑی کی چوٹی پر ہے

دشمن کی سی نفرت سے گناہ گار آدمیوں پر -

ہم نے حملہ کیا آگے کو دوڑا کر اپنے گھوڑوں کو اُن کو پاؤں کے نیچے روند ڈالا -

ترجمہ کتبہ کا جو نقب الحجر کے دروازہ پر ہے

رہتے تھے اس محل میں اب (ابو) محارب اور بحشہ جب کہ یہ ابتداء میں تیار ہوا رہتے تھے اُس میں خوشی سے فرزندانہ اطاعت کے ساتھ نواس اور ونیا حاکم اعلیٰ حربیحل مالک محل کا جس نے فیاضی سے بنایا کارواں سرائے اور کنواں - - - اُس نے نیز بنایا عبادت خانہ فوارہ اور تالاب اور بنایا زمانہ اپنے عہد میں - ریورنڈ فاسٹر نے اس بڑے کتبہ کے نیچے جو کتبہ ہے اُس میں عک کا نام دیکھ کر اس کتبہ کا زمانہ قرار دینے پر توجہ کی اور کہا کہ عک بیٹا تھا عدنان کا اور مسلمانوں کی حدیث کے مطابق جو ام سلمہ سے منقول ہے عدنان حضرت اسماعیل کی چوتھی پشت میں تھا پس اس حساب سے کہ ایک پشت کا زمانہ تیس برس لگایا جاوے تو عک یعقوب کی زندگی کے اُس زمانہ میں ہوگا جب کہ یوسف بھی موجود تھے اور قریب پچاس برس کے قبل اُس وقت کے جب کہ مصر اور اُس کے قرب و جوار کے ملکوں میں قحط ہوا تھا -

ریورنڈ فاسٹر لکھتے ہیں کہ یوسف کی تاریخ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں اسماعیل کی اولاد مختلف فرقوں اور قوموں میں منقسم ہو کر پھیل گئی تھی اور نویری کے جغرافیہ میں جو

دوسرا کتبہ ہے اُس سے قحط کا حال معلوم ہوتا ہے جس میں وہ قوم تباہ ہو گئی۔ ان وجوہ سے وہ ان کتبوں کو یعقوب علیہ السلام کے زمانہ کا قرار دیتے ہیں۔

جب کہ رپورنڈ فاسٹر نے یہ تسلیم کر لیا کہ یہ کتبے قوم عاد کے ہیں جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے اور اُن کا زمانہ اُنہوں نے حضرت یعقوب کے زمانے کے مطابق قرار دیا تو اب وہ قرآن مجید پر گویا دو اعتراض کرتے ہیں ایک یہ کہ قوم عاد کا نوح کی قوم کے بعد ہونا جیسا کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ ”اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح“ صحیح نہیں ہے دوسرے یہ کہ کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنے بادشاہوں کے قوانین پر عمل کرتے تھے اور حضرت ہود کا اُن لوگوں میں جانا جیسا کہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے کہ ”واللی عاد اخاہم ہودا“ ثابت نہیں ہوتا۔

مگر یہ دونوں اعتراض جیسے عجیب ہیں ویسے غلط بھی ہیں۔ اول یہ کہ قوم عاد اولیٰ جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ یمن یا حضرموت میں نہیں بستی تھی۔ یمن و حضرموت و حویلہ میں خود حضرت ہود کی اولاد بستی تھی اور حضرموت اور حویلہ اور سبا جن کے نام سے اب تک وہ مقامات مشہور ہیں حضرت کے پوتے تھے اور یقطان ابن عیبر یعنی ہود وہاں جا کر بسے تھے پس اُنہوں نے جو ان کتبوں کو عاد کی قوم کے کتبے قرار دیے ہیں یہ محض غلطی ہے۔

دوسرے یہ کہ جو زمانہ ان کتبوں کا رپورنڈ فاسٹر نے قرار دیا ہے وہ بھی غلط ہے۔ ام سلمہ کی روایت جس کی بناء پر رپورنڈ فاسٹر نے عدنان کو حضرت اسماعیل کی چوتھی پشت میں قرار دیا ہے وہ روایت ہی غلط اور محض نا معتبر و بے سند ہے

صحیح نسب نامہ کے بموجب جو برخیا کاتب وحی ارمیا نبی نے لکھا ہے (دیکھو خطبات احمدیہ) اس کے مطابق عدنان باپ معد و عک کا اکتالیسویں پشت میں حضرت ابراہیم سے تھا حضرت ابراہیم بموجب حساب مندرجہ توریت کے ۲۰۰۸ ذبیوی میں پیدا ہوئے تھے پس جو حساب نسلوں کے پیدا ہونے کا ہے اس حساب سے عک قریباً ۳۴۰۰ ذبیوی میں ہوگا یعنی چودہ سو برس بعد حضرت ابراہیم کے اور کتبہ میں عک پر فتح یابی نہیں لکھی ہے بلکہ بنی عک پر لکھی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عک کی بھی کئی پشت کے بعد کا ہے۔

نویری کے دوسرے کتبہ کو جس میں قحط کا ذکر ہے مسٹر فاسٹر پہلے کتبہ کا تتمہ سمجھتے ہیں تاکہ پہلے کتبہ کو بھی یعقوب و یوسف کے زمانے کا قرار دیں۔ مگر وہ اصلی کتبہ دستیاب نہیں ہوا اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں تھا نہ یہ معلوم ہے کہ کس خط میں تھا پس کوئی دلیل نہیں ہے کہ نویری کے پہلے اور دوسرے کتبہ کو ایک زمانہ کا قرار دیا جائے۔

کچھ عجب نہیں کہ یہ کتبے قوم حمیر کے ہوں جس میں سلاطین نام دار اور باوقار گذرے ہیں۔ یقطان ابن عیبر یا ابن ہود یمن میں آباد ہوا اس کا بیٹا سبا تھا اور سبا کا بیٹا حمیر اس کی اولاد میں بڑے بڑے بادشاہ گذرے ہیں اور اسی کی اولاد کی سکونت حضرموت میں تھی جو اس کے ایک بیٹے کے نام سے مشہور ہے پس یہ کتبے قوم حمیر کے ہو سکتے ہیں نہ قوم عاد کے۔ اس کی تائید اس کتبہ سے ہوتی ہے جس کا ذکر ابن ہشام نے کیا ہے۔ جو اطراف یمن کی ایک قبر میں سے نکلا ہے۔ کیونکہ اس کے شروع میں لکھا ہے ”باسمک اللہم الہ حمیر“ اور یہ ایک ایسا ثبوت ہے جس سے قوم حمیر کے کتبہ ہونے سے

انکار ہی نہیں ہو سکتا -

حصن غراب کے چھوٹے کتبہ میں بلاشبہ بنی عک پر فتح پانے کا ذکر ہے عک جو حضرت اسماعیل کی اولاد میں سے تھا اور جن کا مسکن حجاز میں تھا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اولاد یعنی بنی عک نے کسی زمانہ میں یمن پر یا حضرموت پر حملہ کیا ہوگا زمانہ کے حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ آس زمانہ میں ہوا جس زمانہ میں کہ بخت نصر نے مصر اور عرب پر حملے کئے تھے آس حملہ میں بنی عک کو شکست ہوئی ہوگی جس کا ذکر اس کتبہ میں ہے -

حصن غراب کے بڑے کتبہ سے جواب موجود ہے نہایت استحکام سے قرآن مجید کے اس تاریخی واقعہ کا ثبوت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے عرب میں ہود پیغمبر کو لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا تھا اور بعث و نشر کے عقاید انہوں نے تعلیم کیے تھے اور جو کہ قوم حمیر اور تمام بادشاہان یمن حضرت ہود کی اولاد میں تھے ان کے بادشاہوں نے ان تمام عقاید کو جو حضرت ہود نے تعلیم کیے تھے اپنی کتابوں میں لکھے تھے جس پر وہ یقین کرتے تھے مگر افسوس ہے کہ ان تمام عقائد کے ساتھ آخر کو ان لوگوں میں بت پرستی بھی پھیل گئی تھی جس کو محمد رسول اللہ نبی آخر الزمان نے تمام جزیرہ عرب سے بلکہ دنیا کے بہت بڑے حصہ سے معدوم کیا اور خدا کی وحدانیت کے اصول کو ایسی وضاحت اور عمدگی سے بتا دیا جس سے امید ہے کہ ان کے پیروں میں بت پرستی قائم ہونی ممتنعات عقلی سے ہے اور یہی ایک امر ہے جس کے سبب ابراہیم خلیل اللہ کے پوتے اور عبد اللہ کے بیٹے نے خاتم الانبیاء ہونے کا تاج پہنا اور اس کے دین نے ”الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی“

و رضیت لکم الاسلام دینا “ کا خطاب حاصل کیا ۔  
و صلی اللہ تعالیٰ علی جیدی محمد رسول اللہ وعلی آلہ  
و انا منهم اجمعین ۔

اب ہم کو آس عذاب کا بیان کرنا باقی ہے جو قوم عاد پر  
نازل ہوا تھا اور جس کا ذکر آن آیتوں میں آیا ہے جو حاشیہ پر  
مندرج ہیں '۔ وہ عذاب آندھی تھی جو اس ریکستان کے رہنے

۱۔ فارسلنا علیہم ریحاً صرصراً فی ایام نحسات لنذیقہم  
عذاب الخزی فی الحیوۃ الدنیا ولعذاب الآخرة اخزی و  
ہم لا ینصرون ۔ ۴۱ سورہ فصلت ۱۵ ۔

واماعا دفا ہلکوا بریح صرصر عاتیۃ سخرها علیہم سبع  
لیال وثمانیۃ ایام حسوما فترى القوم فیہا صرعی کانہم  
اعجاز نخل خاویۃ ۔ ۶۹ سورۃ الحاقہ ۶ و ۷ ۔  
فان اعرضوا فقل انذر تکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد و  
ثمود ۔ ۴۱ فصلت ۱۲ ۔

و فی عاد اذا ارسلنا علیہم الیرج العقیم ۔ مینذر من  
شی ات علیہ الاجعلۃ کالریم ۵۱ سورہ زاریات ۴۱ ۔ ۴۲ ۔  
وانہ اہلک عاد الاولیٰ ۔ ۵۳ سورۃ النجم ۵۱ ۔

”کذبت عاد فکیف کان عذابی و نذر ۔ انا ارسلنا علیہم  
صرصرا فی یوم نحس مستمر ۔ تنزع الناس کانہا اعجاز نخل  
منقعر ۵ سورۃ القمر ۱۸ و ۱۹ و ۲۰ ۔

واذکرا خا عاد اذا انذر قومہ بالاحقاف و قد خلت النذر  
من بین یدیہ و من خلفہ الاتعبدوا الا اللہ انی اخاف علیکم  
عذاب یوم عظیم قالو اجتئنا لتا فکنا عن آلہتنا فاتنا  
بما تعدنا ان کننت من المصادقین ۔ قال انما العلم  
عند اللہ اببلغکم ما ارسلت بہ ولیکنی اراکم قوما تجهلون ۔  
فلما راوہ عارضاً مستقبل اودیتہم قالوا هذا عارض مطرنا  
بل هو ما استعجائتم بہ ریح فیہا عذاب الیم ۔ تدمرہ کل  
شی بامر ربہا فاصبحوا الا یرى الامساکنہم کذالک نجزی  
المجرمین ۔ ۴۶ سورۃ احقاف ۱۰۰ ۔ لغایت ۲۳ ۔

لوں پر نازل ہوئی تھی آٹھ دن اور سات رات برابر آندھی  
 مئی اور بخوبی یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ جب ایسی آندھی  
 گہستان کے ملک میں چلی جو گرم ملک تھا اور جس میں نہایت  
 خت لو کی بھی کیفیت ہوگی تو وہاں کے رہنے والوں کا کیا  
 ل ہوا ہوگا۔ بے شک ان کی لاشیں ایسی ہی پڑھی ہوں گی کہ  
 یا درخت جڑ سے اکھڑ کر گر پڑے ہیں جس کی تشبیہ خدا نے  
 ہے ”کانہم اءجواز نخل منقعر۔ کانہم اءجواز نخل  
 اویہ“ ٹوکی گرمی کے مارے ان کے بدن بھگڑی ہو کر بکس گئے  
 ن گے جیسے نوزدہ انسان کا بدن ہو جاتا ہے جس کی تشبیہ خدا  
 اس طرح پر دی ہے کہ ”ما نذر من شیئ اتت علیہ  
 جعلتہ کالرمیم۔“

ارفسکد بن سام کی اولاد میں حضرت ہود تھے اور آرام بن سام  
 اولاد میں عاد اور قوم عاد تھی اسی وجہ سے خدا نے حضرت ہود  
 قوم عاد کا بھائی کہا۔ حضرت ہود احقاف میں گئے جہاں قوم  
 بستی تھی اور بت پرستی کرتی تھی۔ تین بت تھے جن کو وہ  
 تھے۔ حضرت ہود نے ان کو بت پرستی سے منع کیا اور  
 کہہ سوائے خدا کے اور کسی کی عبادت مت کرو۔ مجھ کو  
 ہے تم پر کسی دن سخت عذاب آوے گا۔ ان لوگوں نے  
 کہہ کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہمارے خداؤں کو ہم سے  
 دو اور جس عذاب سے تم ڈرائے ہو اس کو لاؤ اگر تم  
 ہو۔ حضرت ہود نے کہا اس کا علم تو خدا کو ہے میں  
 خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیتا ہوں۔ ایک دن انہوں نے دیکھا  
 ان کے ریگستان کی طرف کچھ گھٹا سی چلی آتی ہے انہوں نے  
 کیا بادل ہے جو خوب برسے گا مگر وہ نہایت سخت آندھی تھی  
 نے سب چیز کو اکھڑ کر پھینک دیا۔

یہ تو قصہ قوم عاد کے عذاب کا ہے مگر جو بحث کہ اس واقع پر اور مثل اس کے دیگر واقعات ارضی و ساوی بر ہو سکتی ہے جن کو قرآن مجید میں کسی قوم کی معصیت کے سبب سے اُس واقعہ کا بطور عذاب کے اُس قوم پر نازل ہونا بیان ہوا ہے غور طلب ہے۔ آندھی اور طوفان۔ پہاڑوں کی آتش فشانی اُن سے ملکوں کا اور قوموں کا برباد ہونا زمین کا دھنس جانا قحط کا پڑنا کسی قسم کے حشرات کا زمین میں پانی میں ہوا میں پیدا ہو جانا کسی قسم کے وباؤں کا آنا اور قوموں کا ہلاک ہونا سب امور طبعی ہیں جو اُن کے اسباب جمع ہو جانے پر موافق قانون قدرت کے واقع ہوتے رہتے ہیں انسانوں کے گنہگار ہونے یا نہ ہونے سے فی الواقع اس کو کچھ تعلق نہیں ہے اگرچہ توریت میں اور دیگر صحف الہیا میں اس قسم کے ارضی و ساوی واقعات کا سبب انسانوں کے گناہ قرار دیے ہیں جو مثل ایک پوشیدہ بھید کے سمجھ سے خارج ہے اُس سے ہم کو اس مقام پر بحث نہیں ہے۔ مگر قرآن مجید میں بھی ایسے واقعات کو انسانوں کے گناہوں سے منسوب کرنا بلاشبہ تعجب سے خالی نہیں ہے۔

اس قسم کے شبہی بلاشبہ انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ شبہات بے شک اصلی ہوتے ہیں کیوں کہ حوارث ارضی و ساوی حسب قانون قدرت واقع ہوتے ہیں۔ اُن کو انسانوں کے گناہوں سے کچھ تعلق نہیں ہوتا اور نہ انسانوں کے گناہ اُن حوادث کے وقوع کا باعث ہوتے ہیں مگر ان شبہات کے پیدا ہونے کا منشاء یہ ہے کہ لوگ حقیقت نبوت اور اُس کی غایت کے سمجھنے میں پہلے غلطی کرتے ہیں اور پھر اُس غلطی کی بناء پر اُس شبہ کو قائم کرتے ہیں۔ نبوت ہمیشہ فطرت کے تابع ہوتی ہے۔ اُس کا مقصد حقائق اشیاء کو علی ما ہی علیہ بیان کرنا نہیں ہوتا بلکہ



آس کی غایت تہذیب نفس ہوتی ہے پس جو امور کہ کسی قوم میں  
 یا انسان کے خیال میں ایسے پائے جاتے ہیں جو موید تہذیب نفس  
 کے ہیں گو کہ وہ مطابق حقائق اشیاء علیٰ ماہی علیہ کے مذہبوں  
 تو انبیا آس سے کچھ تعرض نہیں کرتے بلکہ وہ اس کو بلا لحاظ  
 اس بات کے کہ وہ مطابق حقیقت اشیاء علیٰ ماہی علیہ کے ہے  
 یا نہیں بطور ایک امر مسلمہ مخاطب کے تسلیم کر کے لوگوں کو  
 ہدایت کرتے ہیں آس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک شخص  
 بحث کرنے والا اپنے مخالف کے امر مسلمہ کو باوجودیکہ وہ  
 اس کو صحیح نہ جانتا ہو تسلیم کر کے مخالف ہی کے امر مسلمہ  
 سے مخالف کو ساکت کرنا چاہے پس ایسے موقع پر یہ سمجھنا کہ  
 جو کچھ انبیاء نے تسلیم کیا یا آس کو اپنے مقصد کے لیے کام  
 میں لائے آس کے مطابق حقائق اشیاء بھی ہیں یہ پہلی غلطی ہے  
 اور یہی غلطی باعث اس قسم کے شبہات کے پیدا ہونے کی ہوتی ہے -  
 مثلاً مثلاً لوگ یقین کرتے تھے کہ خدا نے چھ دن میں زمین و  
 آسمان پیدا کیے آس کی عبادت کرو اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ  
 آس پیغمبر کا بیان نسبت چھ دن میں آسمان و زمین کی پیدائش کے  
 بطور بیان حقیقت اشیاء علیہ کے ہے سخت غلطی ہے کیوں کہ  
 آس پیغمبر نے اس قوم کے امر مسلمہ ہی کو تسلیم کر کے آسمان و  
 زمین کے پیدا کرنے والے کے استحقاق عبادت کو ثابت کیا ہے -  
 انسان کی ابتدائی حالت کی فلاسفی پر غور کرنے سے جو  
 وحشی قوموں کی حالت یا وحشی زمانہ سے شروع ہوتی ہے ثابت  
 ہوتا ہے کہ جس طرح انسان کے دل میں اپنے سے زیادہ قوی و  
 زبردست اشیا کو اپنے گرد دیکھ کر کسی وجود قوی کا جس کو  
 انہوں نے خدا تسلیم کیا خیال آیا ہے آس کے ساتھ ساتھ آس کے

خوش رکھنے کے لیے اُسی کی عبادت کا بھی خیال ہوا ہے اور اسی کے ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہوا ہے کہ دنیا میں جو مصیبتیں آتی ہیں وہ اُس کی خفگی کے اور انسانوں کے افعال سے ناراض ہو جانے کے سبب آتی ہیں۔ پس یہ خیال کہ تمام آفات ارضی و سماوی انسانوں کے گناہوں کے سبب سے ہوتی ہیں ایک ایسا خیال تھا جو تمام انسانوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا اور اس زمانہ میں بھی جاہل قوموں کے دلوں میں ویسی ہی مضبوطی سے جا ہوا ہے۔ یہ خیال خواہ وہ حقیقت اشیاء علیٰ ماہی علیہ کے مطابق ہو یا نہ ہو ایک ایسا خیال ہے جو تہذیب نفس انسانی کا نہایت موید ہے اور بہ موجب اُس اصول فطرت کے جس کے تابع انبیا علیہم السلام ہوتے ہیں۔ اُن کو ضرور تھا کہ اس امر مسلمہ کو تسلیم کر کے لوگوں کو تہذیب نفس کی ہدایت کریں۔ پس قرآن مجید کے اس قسم کے بیانات کو جن میں حوادث ارضی و سماوی کو انسان کے گناہوں سے منسوب کیا ہے یہ سمجھنا کہ وہ ایک حقیقت اشیاء علیٰ ماہی علیہ کا بیان ہے اُن سمجھنے والوں کی غلطی ہے نہ قرآن مجید کی۔

یہ اصول جو میں نے بیان کیا ایک ایسا اصول ہے کہ اگر وہ ذہن میں رکھا جاوے تو بہت سے مقامات قرآن مجید کی اصلی حقیقت منکشف ہوتی ہے مگر یہ اصول ایسا نہیں ہے جس کو میں نے ایجاد کیا ہو اور نبوت کو ماتحت فطرت قرار دیا ہو بلکہ اور محققین علماء کی بھی یہی رائے ہے جس کا بیان بہت مختصر طور پر ”ستۃ ایام“ کے بیان میں گذرا ہے مگر شاہ ولی اللہ صاحب نے تفہیمات الہیہ میں اس اصول کو زیادہ تر وضاحت سے بیان کیا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے جو کچھ اس کی نسبت لکھا ہے اُس کا مطلب بالکل اُسی کے مطابق ہے جو میں نے بیان کیا گو کہ دونوں کے طرز

ادا اور طریق تقریر اپنی اپنی طرز پر جدا گانہ مذاق سے ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :

اعلم ان النبوة من تحت الفطرة كما ان الانسان قد يدخل في صميم قلبه وجذر نفسه علوم و ادراكات عليها تبتنى ما يقاض عليه من روياء فيرى الامور مشبهة بما اخترته دون غيرها كذا لك كل قوم و اقليم لهم فطرة فطروا عليها امورهم كلها كاستقباح الذبح والقول بالقدم فطرة فطر الهنود عليها وجواز الذبح والقول بحدوث العالم فطرة فطر عليها بنو سام من العرب و الفارس فانما يحى النبى يتامل فيما عند هم من الاعتقاد العمل فيها كان موافقا لتهديب النفس يشبه لهم ويرشدهم اليه وما كان يخالف تهذيب النفس فانه ينهاهم عنه وقد يحصل بعض الاختلاف من قبل اختلاف نزول الجود كما ذكرنا في توجه المجوس الى القوى الفلكية وتوجهه الجنفاء الى الملاء الاعلى لا غير وكما ذكرنا في عموم بعثت النبى و خاتمته بخلاف سائر النبوة فالنبوة سويته و تهذيبه وجعله كاحسن ما ينبغي سواء كان ذلك الشئ شمعاً او طيناً والفطرة والملة بمنزلة المعاد كالشمع والطين فلا تعجب باختلاف احوال الانبياء عليهم السلام واختلاف امورهم عما يتعلق بالهدة فاصل النبوة تهذيب النفس باعتقاد تعظم الله والتوجه اليه و كسب ما ينجي من عذاب الله فى الدنيا والاخره واما مجازات السيئة فى الدورة الاولى كان لا يتوقف على معرفة البعث بعد الموت ولا الملائكة و فى الدورة الاخرى توقف على ايمان بالله بالصفات التعظيمية والملائكة

وکتبہ و رسلہ والایمان بالبعث بعد الموت امام مسئلہ  
 قدم العالم و حدوثہ و مسئلہ التناسخ و مسئلہ تحریم  
 الذبہ وحلہ و مسئلہ الصفات اللہ الی من التجدد  
 والتنقل والصفات المحدثہ كالروية والنزول والارادة  
 المتجددة والبداء وغير ذلك فانها كلها من الفطرة  
 والمادة ليست ببحث عن ذلك بالامالة - (تفهيمات)

یعنی یہ بات جان لینی چاہیے کہ نبوت فطرت کے ماتحت ہے  
 جیسا کہ انسان کے کبھی دل میں بہت سے علوم اور باتیں جم کر  
 بیٹھ جاتی ہیں اور انہی پر مبنی ہوتی ہیں وہ چیزیں جو اس پر اس  
 کے رویا میں فائز ہوتی ہیں پھر وہ ان چیزوں کی صورتوں کو  
 دیکھتا ہے جس کو اس نے پیدا کیا ہے اور نہ اس کے سوا اور  
 کسی کو ایسے ہی ہر ایک قوم اور اقلیم کی ایک فطرت ہے جس  
 پر اس کی سب باتیں پیدا کی گئی ہیں - جیسے جانور کے ذبح کرنے  
 کو برا جاننا اور عالم کو قدیم کہنا یہ ایک فطرت ہے کہ فطرت  
 ہنود کی اس پر ہے اور ذبح جانور کو جائز ماننا اور عالم کو حادث  
 کہنا فطرت ہے جس پر بنی سام یعنی عرب اور فارس مخلوق ہوئے  
 ہیں نبی جو آیا کرتا ہے وہ ان کے علوم اور اعتقادات اور اعمال  
 میں تامل کیا کرتا ہے جو ان میں سے موافق تہذیب نفس کے ہوتا  
 ہے اس کو ثابت رکھتا ہے اور ان کو وہی راہ چلاتا ہے اور جو  
 کہ تہذیب نفس کے خلاف ہو اس سے منع کرتا ہے اور کبھی  
 کچھ اختلاف ہو جاتا ہے بوجہ اختلاف فیض الہی جیسا کہ ہم  
 نے ذکر کیا ہے بیچ معاملہ متوجہ ہونے مجوس کے قوائے فلکیہ  
 کی جانب اور متوجہ ہوئے حنفا کے ملاء اعلیٰ کی جانب اور جیسا کہ  
 ہم نے ذکر کیا ہے بعثت نبی کے عام ہونے اور خاتم النبیین کے بیان  
 میں بخلاف اور نبیوں کے پس نبوت اس فطرت کا درست اور

آراستہ کرتا ہے اور اس کو درست کرنا جس قدر آس کا عمدہ تر ہونا ممکن ہے خواہ وہ شے موم ہو خواہ گارا فطرت مذہب کے لیے بمنزلہ مادہ کے ہے مثل موم اور گوندھی مٹی کے پس تعجب نہ کرنا چاہیے اختلاف احوال دنیا سے اور ان کے اس اختلاف سے جو ان امور سے متعلق ہیں جو بمنزلہ مادہ کے ہے پس اصل نبوت تہذیب نفس کی ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت کے اعتقاد سے اور آس کی طرف متوجہ ہونے سے اور ان امور کے کرنے سے جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے دنیا اور آخرت میں بچاؤے برائی کا بدلہ پہلے زمانہ میں اس پر موقوف نہ تھا کہ مرنے کے بعد اٹھنے کو جانیں اور پچھلے زمانہ میں اس پر موقوف ہے کہ اللہ پر ایمان لاویں اور آس کی صفات تعظیمیہ پر اور فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے سب رسولوں پر اور مرنے کے بعد اٹھنے پر ایمان لاویں اور مسئلہ قدم عالم اور حدوث عالم اور مسئلہ تناسخ اور مسئلہ حرام ہونے ذبح جانور کا اور مسئلہ صفات کا جو کہ بدلتے رہتے ہیں اور صفات جو کہ حادث ہیں جیسے دیکھنا اور اترنا اور نیا ارادہ اور ایسے ہی اور صفات پس یہ مسئلہ فطرقی ہے اور بمنزلہ مادہ کے ہے ایسے مسائل سے اصلی طور پر نبی بحث کرتا ہے۔

یہ بیان شاہ ولی اللہ صاحب کا ہماری دلیل سے بالکل مطابق ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہماری دلیل کا ماخذ یہی بیان ہے جو نہایت عالی دماغی اور بلا خوف لومۃ لایم کے شاہ صاحب نے فرمایا ہے۔

### قوم ثمود

ثمود جس کے نام سے قوم ثمود مشہور ہوئی جثر بن آرام بن سام بن نوح کا بیٹا ہے اور عاد اولیٰ اور ہود کا ہمعصر ہے حضرت صالح پیغمبر آس کی چھٹی پشت میں ہیں اور اسی لیے زمانہ حضرت

صالح کا اخیر اُنیسویں یا شروع بیسویں صدی دنیاوی میں اور قریباً سو برس پیشتر حضرت ابراہیم سے پایا جاتا ہے ۔

قوم ثمود الحجر میں آباد تھی اور پہاڑ کو کھود کر اُس میں گھر بنائے تھے تقویم البلدان میں اسماعیل ابو الفدا نے ابن حوقل کا قول نقل کیا ہے کہ وہ ان پہاڑوں میں گیا تھا اور اس نے اُن مکانات کو دیکھا تھا جو پہاڑ کو کھود کر بنائے تھے افسوس ہے کہ سلاطین اسلامیہ نے اس طرح پر عرب کے قدیم حالات کی تحقیقات نہیں کی ، کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جزیرہ عرب میں بہت سی ایسی چیزیں موجود ہوں گی جن سے پُرانے تاریخی حالات کی صحت پر بہت کچھ مدد مل سکتی ہے ۔

عاد اولیٰ حضرت نوح سے پانچویں پشت میں تھا اور عاد اور ثمود دونوں آپس میں بھائی تھے قوم عاد کے برباد ہونے کے بعد قوم ثمود نے ترقی کی تھی جس کی نسبت خدا نے فرمایا ”و اذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد“ اور جو کہ قوم ثمود نے قوم عاد کے بعد ترقی کی تھی اسی سبب سے ثمود کو عاد ثانی کہتے ہیں جیسے کہ نوح کو آدم ثانی ۔

حضرت صالح قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے جو واقعات کہ ان کے زمانہ نبوت میں گزرے اُن کا بیان مندرجہ حسب ذیل آیتوں میں ہے ۔

والبی ثمود اخواہم صالحا قال یا قوم اعبدوا الله ما لکم من الہ غیرہ قد جاء تکم بینة من ربکم هذه ناقة الله لکم آية فذروها تاكل فی ارض الله ولا تمسوها بسوء فیاخذکم عذاب الیم ۔ و اذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد وبواکم فی الارض تتسیخذون من سہولہا فصوراً و تنتہون الجبال بیوتاً فاذکروا الاء

الله ولا تعشوا في الارض مفسدين - فعثروا النافاة وعتوا:  
عن امر ربهم و اخذتهم الرجفة فاصبحوا في دارهم  
جاثمين - (الاعراف)

قال يا قوم ارائيتهم ان كنت على بينة من ربي  
واتاني منه رحمة فمن ينصرني من الله ان عصىة فما  
تزيدونني غير تخسير - و يا قوم هذه ناقة الله لكم  
آية فذروها تاكل في ارض الله ولا تمسوها بسوء فياخذكم  
عذاب قريب ففعلوا فقال تمتعوا في داركم ثلاثة ايام  
ذالك وعد غير مكذوب فلما جاء امرنا نجينا صالحا  
والذين آمنوا معه برحمة منا ومن خذى يومئذ ان ربك  
هو القوي العزيز واخذ الذين ظلموا الصيحة فاصبحوا  
في دارهم جاثمين - (١١ هود ٦٦ - ٤٠)

قالوا انما انت من المسحورين ما انت الا بشر  
مثلنا فات بايات ان كنت من الصديقين - قال هذا  
ناقة لها شرب ولكم شرب يوم معلوم - ولا تمسوها  
بسوء فياخذكم عذاب يوم عظيم - فعثروها فاصبحوا  
نادمين فاخذهم العذاب ان في ذالك لاية وما كان اكثر  
هم موقنين - (٢٦ - الشعراء ١٥٣ - ١٥٨)

واما ثمود فهديناهم فاستحبوا العمى على الهدى  
فاخذتهم صاعقة العذاب الهون بما كانوا يكسبون -  
(٣١ - فصلت ١٦٠)

انا مرسلوا الناقة فتنة لهم فارتق بهم واصطبروا  
نسيبهم ان الباء قسمة بينهم كل شرب محتضر - فنادوا  
صاحبهم فتعاطى فعقر - فكيف كان عذابي و نذر -  
انا ارسلنا عليهم صيحة واحدة فكانوا كهشيم المحتظر -  
(٥٣ - سورة القمر ٢٤ ، ٢١)

فاما ثمود فاهلكوا بالطاغية - ( ۹ - الحاقه ۶ )  
 كذبت ثمود بطغوها - اذ نبعت اشة لها فقال  
 لهم رسول الله ناقة الله وسقياها فكدبوه فعقة روها فدمم  
 عليهم ربهم بذنبهم فسواها - ( ۹۱ - سورة الشمس  
 ۱۱ - ۱۳ )

ان آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت صالح نے ان لوگوں  
 سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو خدا کی عبادت کرو تمہارے  
 لیے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے ان لوگوں نے کہا کہ تم تو  
 سحر زدہ ہو تم تو ہم ہی جیسے ایک آدمی ہو اگر تم سچے ہو تو  
 کوئی نشانی لاؤ - حضرت صالح نے کہا کہ تمہارے پاس ایک  
 دلیل تمہارے پروردگار کے پاس سے آئی ہے - یہ اللہ کی آونٹنی  
 تمہارے لیے نشانی ہے اس کو چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی  
 پھرے - باقی رہا پانی ایک دن اس کو پی لینے دیا کرو اور ایک  
 دن تم لے لیا کرو اور اس کو کچھ برائی مت پہنچاؤ نہیں تو تم کو دکھ  
 دینے والا عذاب پکڑ لے گا - وہ لوگ آونٹنی سے تنگ آ گئے انہوں  
 نے اس کو ذبح کر ڈالا یا اس کی کونچیں کاٹ دیں کہ مر گئی -  
 حضرت ہود نے کہا کہ تم تین دن اپنی جگہ میں چین کر لو  
 عذاب آنے کا وعدہ نہیں ٹلنے کا اس کے بعد ان پر یہ خدا کا عذاب  
 پڑا کہ بڑی گرگڑھٹ سے اور حد سے زیادہ بھونچال آیا اور وہ اپنے  
 رتنے کی جگہ میں گھٹنوں کے بل گر کر مر گئے -

قرآن مجید میں تو یہ قصہ اسی قدر ہے مگر ہمارے مفسرین  
 نے اس قصہ کو ایک تودہ طوفان بنا دیا ہے - جس کے لیے کوئی  
 معتبر سند بھی نہیں ہے - انہوں نے قرآن مجید کے ان لفظوں کو  
 کہ ”فات بایة ان كنت من الصادقین“ اور ان لفظوں کو  
 کہ ”قد جائتکم بمینة من ربکم“ دیکھ کر یہ تصور کیا



کہ وہ اونٹنی کسی عجیب و معجز طریقہ سے پیدا ہوئی ہوگی - کچھ عجب نہیں کہ پہلے سے عرب میں اس اونٹنی کی نسبت عجیب باتیں مشہور ہوں گی مفسروں نے ان افواہی باتوں کو قرآن مجید کے ان الفاظ کے خیال سے سچ سمجھا اور تفسیروں میں لکھ دیں - حالاں کہ اس کے لیے کوئی معتبر سند نہیں ہے - انہوں نے لکھا ہے کہ جب حضرت صالح - بتوں کی پرستش سے ان کو منع کیا اور خدائے واحد کی پرستش کی ہدایت کی تو قوم ثمود نے جس میں کہ خود حضرت صالح بھی تھے معجزہ طلب کیا حضرت صالح نے کہا کہ تم کیا چاہتے ہو - انہوں نے کہا کہ تم ہمارے تیوہار کے دن ہمارے ساتھ چلو ہم اپنے بتوں کو نکالیں گے تم خدا سے معجزہ مانگنا - ہم اپنے بتوں سے مانگیں گے - اگر تمہاری دعا کا اثر ہوا تو ہم تمہارے مرید ہو جاویں گے اور اگر ہماری دعا کا اثر ہوا تو تم ہمارے مرید ہو جانا - اس اقرار پر دونوں شہر کے باہر گئے - انہوں نے اپنے بتوں سے کچھ دعا مانگی مگر کچھ نہ ہوا - حضرت صالح سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ اس پہاڑ کے ٹکڑے میں سے ایک اونٹنی نکلے - حضرت صالح نے ان سے اقرار لیا کہ اگر نکلے تو تم ایمان لے آؤ گے - سب نے اقرار کیا - جب بات پکی ہو گئی تو حضرت صالح نے دو رکعت نماز پڑھی اور خدا سے دعا مانگنی شروع کی - وہ پہاڑ کا ٹکڑا پھولنا شروع ہوا اور حاملہ کے پیٹ کی مانند پھول گیا - پھر پھٹا اور اس میں سے نہایت بڑی موٹی مشٹنڈی اونٹنی نکلی اور اسی وقت اس نے اپنے برابر کا بچہ بھی دے دیا -

اس اونٹنی کا پیدا ہونا ہی عجیب طرح پر بیان نہیں کیا بلکہ اس کی عجیب عجیب صفات بھی بیان کی ہیں لکھا ہے کہ جہاں قوم ثمود رہتی تھی وہاں پانی بہت کم تھا اور ٹھیرا تھا کہ ایک

دن وہ پانی آونٹنی پیا کرے اور ایک دن وہ لوگ لیا کریں آونٹنی میں یہ عجیب صفت تھی کہ وہ سارا پانی جس کو تمام لوگ پی سکتے تھے سڑپ جاتی تھی اور پہاڑ پر چلی جاتی تھی پھر وہاں سے آتی تھی اور لوگ اُس کا دودھ دوہتے تھے اور اس قدر کثرت سے دودھ ہوتا تھا کہ تمام قوم کے لیے بجائے پانی کے کافی ہوتا تھا۔ حضرت صالح نے کہا کہ تمہارے شہر میں ایک لڑکا پیدا ہونے کو ہے کہ تمہاری موت اس کے ہاتھ سے ہوگی انہوں نے یہ بات سن کر جو لڑکا پیدا ہوا اُس کو مار ڈالا یہاں تک کہ نو لڑکوں کو مارا جب دسواں لڑکا پیدا ہوا کہا کہ بھئی اب تو ہم نہ ماریں گے مگر بدبختی سے یہ وہی لڑکا تھا جس کے ہاتھ سے اُن کی موت ہونے والی تھی۔

بہر حال وہ لڑکا بڑا ہوا جوان ہوا یاروں میں بیٹھنے لگا ایک دن وہ اپنے یاروں کی مجلس میں تھا اور سب نے شراب پینے کا ارادہ کیا اور شراب میں پانی ملانے کو پانی چاہا مگر وہ دن آونٹنی کے پانی پینے کا تھا وہ سب پانی پینے کا تھا وہ سب پانی پی گئی تھی ایک قطرہ شراب میں ملانے کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔

اُس جوان کو نہایت غصہ آیا وہ پہاڑ میں گیا اور آونٹنی کو بلایا جب آئی تو اُس کو ذبح کر ڈالا یا کونچیں کاٹ ڈالیں کہ وہ مر گئی۔ پھر اُن پر تین دن میں عذاب آیا پہلے دن سب کے بدن سرخ ہو گئے۔ دوسرے دن زرد ہو گئے۔ تیسرے دن کالے ہو گئے۔ اس پر بھی نہ مرے تب بھونچال آیا اور اُس کے سبب سے مر گئے اس قصہ کا لغو اور مہمل ہونا خود اس قصہ سے ظاہر ہوتا ہے مفسرین نے اس قصہ کو اگرچہ لکھا ہے مگر چنداں اعتبار نہیں کیا۔ بعضوں نے تو ”روی“ کر کر لکھا ہے کہ یہ لفظ خود قصہ کے ضعیف اور بے سند ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ صاحب

تفسیر کبیر نے لکھا ہے کہ :

اعلم ان القرآن قد دل علی ان فیہا آیۃ فاما ذکر  
انہا كانت آیۃ من ای الوجہ وہ فہو غیر مذکور والعلم  
حاصل بانہا كانت معجزۃ من وجہ الاحوالۃ -  
(تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۲۶۱)

یعنی قرآن سے پایا جاتا ہے کہ اس آونٹنی میں کچھ نہ کچھ  
ایک نشانی تھی مگر یہ بات کہ وہ کیا نشانی تھی اور کس طرح پر  
تھی بیان نہیں ہوئی مگر اتنی بات معلوم ہے کہ وہ کسی نہ کسی  
وجہ سے معجزہ تھی -

مگر میں کہتا ہوں کہ جس وجہ سے صاحب تفسیر کبیر نے  
اس کو معجزہ مافوق الفطرت قرار دیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے -  
شمود کی قوم نے بتوں کی پرستش اختیار کی تھی اور کئی  
نسلیں ان کی بت پرستی میں گذر گئی تھیں جب حضرت صالح نے  
ایسے خدائے واحد کی پرستش کی ہدایت کی جس کی نہ کوئی صورت  
ہے ، نہ شکل ہے ، نہ اس کا وجود دکھائی دیتا ہے ، نہ کوئی اس کے  
پاس جا کر اسے دیکھ سکتا ہے صرف خیال ہی خیال میں وہ ہے  
اور خیال میں بھی بیچون و بیچگوں میرا حیزو - مکان اور شکل و  
صورت وجہت و مثال سے تو ایک فطرقی بات تھی کہ ایک پشتینی  
بت پرست کہتے کہ اگر تم سچے ہو تو اس کی نشانی لاؤ - جس کے  
ذریعہ سے وہ اس بن دیکھے خدا کی پرستش کریں کیوں کہ بغیر  
کسی ظاہری وجود کے ان کے دل کو تسلی نہیں ہو سکتی تھی -  
انہوں نے ایک آونٹنی کو بطور سانڈ کے چھوڑ دیا کہ یہ خدا کی  
آونٹنی ہے اور تمہارے لیے خدا کی نشانی ہے اس کو کسی قسم کی  
ایذا مت پہنچاؤ اور چرنے پھرنے دو - معلوم ہوتا ہے کہ اس  
طرح پر جانوروں کے چھوڑنے کی قدیم رسم تھی عرب متعدد طرح

پر سائنڈ چھوڑتے تھے۔ اوٹنی جب پانچ بجے جن لیتی تھی تو اس کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے اور جہاں وہ چرتی چرنے دیتے تھے اور پانی پینے سے نہ ہکاتے تھے۔ بیماری سے اچھا ہونے یا سفر سے آنے پر یا دس برس خدمت لینے کے بعد اوٹ کو بتوں کے نام پر بطور سائنڈ کے چھوڑتے تھے جو بحیرہ اور سائبہ اور حام کے نام سے مشہور ہیں۔ حضرت صالح نے بھی اسی طرح اس اوٹنی کو چھوڑا صرف اتنا فرق کیا کہ کسی بت یا کسی مخلوق کے نام پر نہیں چھوڑا بلکہ خدا کے نام پر چھوڑا۔

آیت کے لفظ کے معنی معجزہ کے نہیں ہیں اور اس لیے مصنف تفسیر کبیر کا یہ لکھنا کہ ”والعلم حاصل بانھا کانت معجزة بوجه مالا محالة“ صحیح نہیں ہے۔ آیت کے معنی نشانی کے ہیں۔ محمد بن ابی بکر الرازی نے لغات قرآن میں لکھا ہے کہ الایة العلامة و منه قوله تعالیٰ ان آیة ملکہ، و قوله تعالیٰ، وجعلنا الليل والنهار آیتین، ای علامتین، پس آیت کے لفظ سے یہ قرار دینا کہ وہ اوٹنی یا سائنڈ ہی ایک معجزہ تھی جو خلاف قانون قدرت یا مافوق الفطرت پیدا ہوئی تھی قابل تسلیم نہیں ہے۔

دوسرا لفظ ان آیتوں میں ”بیسمة من ربکم“ کا ہے۔ ان الفاظ کا جو قرآن مجید میں ہیں ترجمہ یہ ہے کہ کہا (صالح) نے اے میری قوم عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارے لیے کوئی خدا سوائے اُس کے بے شک آئی ہے تمہارے پاس دلیل تمہارے پروردگار سے۔ یہ اوٹنی اللہ کی تمہارے لیے نشانی ہے۔ اگر یہ کہا جاوے کہ اوٹنی ہی وہ دلیل تھی تو الفاظ ”لکم آیة“ بیکار ہو جاتے ہیں کیوں کہ اُس حالت میں صرف اتنا کہنا کافی تھا کہ قد جاءکم بیسمة من ربکم هذه ناقة الله فذروها تاكل الخ“

دوسرے یہ کہ خدا کی تمام مخلوقات وہ کسی طرح پر پیدا ہو خدا پر دلیل ہے آونٹنی کے پیدا ہونے سے گو کہ وہ کسی عجیب طرح سے پیدا ہوئی ہو خدا پر دلیل ہونے کی کچھ خصوصیت نہیں ہو سکتی - پس صاف ظاہر ہے کہ قد جاء تکم بینة من ربکم جدا جملہ ہے اور اس سے وہ دلیل مراد ہے - جو انبیاء اپنی امت کو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید اور اس کے استحقاق عبادت کی نسبت بتاتے ہیں اور ہذہ ناقة الله لکم آیة الی اخرہ جملہ مستانفہ ہے اس کو بینة من ربکم سے کچھ تعلق نہیں ہے -

اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ اس کو بینة من ربکم سے تعلق ہے تو بھی اس سے کوئی نتیجہ سوائے اس کے نہیں نکلتا کہ حضرت صالح نے اس آونٹنی کو جس طرح ایک نشانی بتایا تھا اسی طرح اور اسی مقصد سے اس کو دلیل یا گواہ بھی کہا تھا - بینة کے لفظ سے اس سانڈھنی کا معجزہ ہونا اور خلاف قانون قدرت یا مافوق الفطرت پیدا ہونا کس طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے - تعجب ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام قصہ حضرت صالح کا بیان کیا اور جو بات سب سے مقدم اور سب سے زیادہ عجیب تھی کہ پہاڑ کو فی الفور آونٹنی کا حمل رہا اور وہ مثل حاملہ کے پیٹ کے پھولنا شروع ہوا اور شق ہو گیا اور آونٹنی پلی پلائی ساٹھ گز چوڑی اور معلوم نہیں کس قدر لمبی سنڈ مسنڈ اس میں سے پیدا ہوئی اور پیدا پیدا ہوتے ہی اپنی برابر کا بچہ جنا اور قدرتی مسئلہ المظروف اقصر من الظرف والجزا قصر من الكل کو بھی باطل کر دیا - اس کا بیان بالکل چھوڑ دیا اور مفسرین کو اس کا الہام کیا کیوں کہ انہوں نے بغیر غور و فکر اور بغیر کسی معتبر سند کے اس قصہ کو لکھا ہے جو بغیر الہام کے اور کسی طرح لکھا نہیں جا

سکتا تھا افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین نے ایسے ہی لغو بے معنی قصوں کو قرآن مجید کی تفسیروں میں داخل کر کے مسائل مستحکم اسلام کو مضحکہ اطفال بنایا ہے اور اس کے نور عالم افروز کو لغویات کے گرد و غبار سے دھندلا کر دیا ہے۔ خدا ان پر رحم کرے آمین۔

جب کہ ان لوگوں نے اس ساندھنی کو مار ڈالا اور کفر و بت پرستی کو نہ چھوڑا تو حضرت صالح نے فرمایا کہ تم تین دن اور چین کر لو پھر تم پر خدا کا عذاب ضرور آوے گا۔ اعداد جو ایسے مقام پر بیان ہوتے ہیں ان سے وہی عدد مقصود نہیں ہوتا بلکہ ایک زمانہ مراد ہوتا ہے اس طرح کے کلام کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ چند روز تم اور چین کرو پھر تم پر عذاب ہوگا۔ بدکار انسان کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ تین دن کا یا چند روز کا یہ عیش و آرام ہے اور اس سے اس کی تمام عمر مراد ہوتی ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کا حال معلوم ہوگا پس اسی طرح حضرت صالح نے فرمایا ”تمتعوا فی دیارکم ثلثة ایام“۔

جو آفت کہ قوم ثمود پر آئی وہ شدید بھونچال تھا۔ لفظ طاعیہ جو بعض آیتوں میں ہے وہ اس کی شدت اور حد سے زیادہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ لفظ صیحہ کا اس بھونچال کی آواز گڑگڑاٹھ پر اشارہ کرتا ہے اور رجفہ کے معنی بھونچال کے ہیں۔ غرض کہ جس طرح عادت اللہ جاری ہے بھونچال کے آنے وہ قوم غارت ہو گئی یعنی اس کے بہت سے آدمی مر گئے اور بہت سے بچے بھی رہے قوم ثمود کے مکانات پہاڑوں میں بھی تھے اور میدانوں میں بھی تھے۔ میدانوں کے مکانات پر تو بھونچال سے صدمہ ظاہر ہے۔ مگر پہاڑ کے اندر کے مکانات پر بھی متعدد

طرح سے صدمہ پہنچ سکتا ہے یہ واقعہ کوئی ایسا واقعہ نہیں  
 ہے جس کو معجزہ یا خلاف قانون قدرت یا ما فوق الفطرت تصور  
 کیا جاوے۔

---

## قصہ طالوت و جالوت

طالوت و جالوت کی لڑائیوں کا ذکر سورہ بقرہ میں آیا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب بنی اسرائیل میں سموئیل نبی تھے اور ان آیتوں میں پانچ واقعوں کا بیان ہے -

(۱) بنی اسرائیل کا اپنے نبی سے درخواست کرنا کہ ان پر کوئی بادشاہ مقرر کرے -

(۲) سموئیل نبی کا بنی اسرائیل پر طالوت کو بادشاہ مقرر کرنا -

(۳) تابوت سکینہ کا طالوت کے عہد میں بنی اسرائیل کے پاس آ جانا -

(۴) طالوت کے لشکر کو دریا کے پاؤں سے منع ہونا -

(۵) فلسطینیوں کا شکست پانا اور جالوت کا داؤد کے ہاتھ سے مارا جانا -

یہ تمام واقعات توریت کی کتاب سموئیل میں مندرج ہیں مگر تیسرے اور چوتھے واقعہ میں کسی قدر اختلاف ہے - یعنی کتاب سموئیل میں قابوت سکینہ کا طالوت کے عہد سے پہلے آ جانا لکھا ہے - اور قرآن مجید میں طالوت کے عہد میں اور اس پر عیسائی مؤرخوں نے اعتراض کیا ہے کہ غلطی سے ماقبل کے واقعے کو مابعد کے واقعے میں شامل کر دیا -

کتاب سموئیل سے پایا جاتا ہے کہ تابوت سکینہ بمقام شیلوہ تھا جہاں عیسیٰ بنی اسرائیل پر حاکم تھا اس کے عہد میں بنی اسرائیل اور فلسطینیوں میں بمقام ابن عیدز لڑائی ہوئی اور



بنی اسرائیل کی شکست ہوئی۔ (دیکھو کتاب سموئیل ۱ باب ۴ ورس ۲) تب بنی اسرائیل نے تابوت سکینہ کو شیلوہ سے لشکر گاہ میں منگایا اور دوبارہ لڑے اور شکست عظیم ہوئی اور عیسیٰ کے دونوں بیٹے مارے گئے اور تابوت سکینہ کو فلسطینی چھین لے گئے (دیکھو کتاب سموئیل ۱ باب ۴ ورس ۱۰، ۱۱)۔ عیسیٰ بھی یہ خبر سن کر کرسی سے گر پڑا اور مر گیا۔ اُس زمانہ میں سموئیل نبی ہو چکے تھے مگر اُن کی عمر چھوٹی تھی۔

فلسطینی تابوت سکینہ کو مقام ابن عیزر سے جہاں سے آنہوں نے فتح کیا تھا بمقام اشدود لے گئے اور واگون بت کے مندر میں رکھا (دیکھو کتاب سموئیل ۱ باب ۵ ورس الغایت ۵)۔ پھر وہاں سے بمقام گٹ لے گئے۔ (دیکھو کتاب مذکور ورس ۸) پھر وہاں سے بمقام عقرون لے گئے۔ (دیکھو کتاب مذکور ورس ۱۰) اس کے بعد فلسطینیوں نے ایک گاڑی میں دو گایوں کو جوت کر اور تابوت سکینہ کو اس پر رکھ کر جنگل میں چھوڑ دیا اور وہ گاؤں اس کو لے کر بمقام بیت الشمس چلی آئیں اور یوشع کے کھیت میں جا کھڑی ہوئیں اُس نے تابوت اتار لیا اور اپنے ہاں رکھا۔ (دیکھو کتاب سموئیل ۱ باب ۶) کتاب سموئیل میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کی شکست ہونے اور تابوت چھین لے جانے کے سات مہینہ بعد ہوا۔

اس کے بعد تابوت سکینہ قریات یعارم میں آیا اور ایبنا داب کے گھر میں بمقام گبعاء رکھا گیا۔ (دیکھو کتاب سموئیل ۱ باب ۷ ورس ۱) مگر کتاب سموئیل میں نہیں لکھا کہ بیت الشمس میں کس قدر مدت رہا عیسائی مؤرخوں کے نزدیک سن ۱۱۴۱ قبل مسیح کے تابوت سکینہ فلسطینیوں نے چھین لیا تھا اور سن ۱۱۴۰ میں قریات یعارم میں آ گیا۔ وہاں آنے کے بیس برس بعد یہودیوں نے

بتوں کی عبادت سموئیل نبی کی فہمائش سے موقوف کی اور خدا کی پرستش اختیار کی - (دیکھو کتاب سموئیل ۱ باب ۷ ورس ۱، ۲) اور بنی اسرائیل سے سموئیل کی سرداری میں ایک لڑائی فلسطینیوں سے ہوئی اور فلسطینیوں نے شکست کھائی - جب سموئیل ضعیف ہوئے تب بنی اسرائیل نے کسی بادشاہ کے مقرر کرنے کو کہا اور طالوت کو سن ۱۰۹۵ قبل مسیح میں بادشاہ مقرر کیا -

کتاب سموئیل میں طالوت یعنی شاول اور جالوت کی لڑائی اور اس کے مارے جانے کا ذکر ہے - مگر طالوت کے لشکر کو دریا کے پانی پینے سے منع کرنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ توریت کی کتاب قضاۃ باب ہفتم میں جدعون کے لشکر کو ایک چشمہ کے پانی پینے سے منع کیا گیا تھا اور یہ واقعہ سن ۱۲۴۹ قبل مسیح کے ہوا تھا اس لیے عیسائی مؤرخ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں غلطی سے جدعون کے لشکر کے واقع کو طالوت کے لشکر کے واقعہ سے ملا دیا ہے -

ان دونوں اعتراضوں کے تسلیم کرنے کے لیے جو مخالفت کتاب سموئیل پر مبنی ہے ضرور ہے کہ کتاب سموئیل میں جو واقعات اور جو ترتیب ان واقعات کی ہے ان کو صحیح تسلیم کر لیا جاوے اور یہ بات بھی مان لی جاوے کہ کوئی واقعہ طالوت کے لشکر کا ایسا نہیں ہے جو کتاب سموئیل میں لکھنے سے رہ گیا ہو - حالانکہ خود عیسائی مؤرخ ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتے سموئیل کی کتابوں کے مضامین میں باہم اختلاف - کتاب اول سموئیل باب ۱۶ ورس ۲۱، ۲۲ سے ظاہر ہے کہ طالوت داؤد سے اور اس کے باپ یشی سے بخوبی واقف تھا - داؤد کو اس کے باپ کے پاس سے بلایا تھا اور اپنا سلح دار کیا تھا - اسی کتاب کے باب ہفتم ورس ۱ سے ظاہر ہے کہ داؤد طالوت سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا

تھا۔ لڑائی کے ہنگامہ میں جب داؤد اپنے بھائیوں کی خبر لینے آیا تو داؤد نے کہا کہ جالوت سے میں لڑوں گا۔ یہ خبر سن کر طالوت نے داؤد کو بلایا اور گفتگو کے بعد لڑنے کی اجازت دی اور اپنی زرہ و خود و تلوار بھی دی جس کو داؤد نے لے کر پھر دے دیا۔ (دیکھو کتاب اول سموئیل باب ۱۷ ورس ۳۱ لغایت ۳۹) مگر اسی باب کے ورس ۵۵ میں لکھا ہے کہ جب داؤد لڑنے کو بڑھا تو طالوت نے اپنے لشکر کے سردار سے پوچھا کہ یہ جوان کس کا بیٹا ہے اور ورس ۵۸ میں لکھا ہے کہ جب داؤد نے جالوت کا سر کاٹ لیا اور طالوت کے پاس لے آیا تو طالوت نے پوچھا کہ تو کس کا بیٹا ہے۔ پس ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک طالوت داؤد سے مطلق واقف نہ تھا۔ اس اختلاف کے سبب خود عیسائی مؤرخوں کی یہ رائے ہے کہ کتاب سموئیل میں قصہ الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ جالوت کی لڑائی کے بعد داؤد طالوت کا مصاحب اور سلح دار ہوا ہے اس پر بھی اختلاف رفع نہیں ہوتا کیوں کہ سولہویں باب سے داؤد کی پہلی دفعہ بطور مطرب بریط نواز کے طالوت سے ملاقات ہونی پائی جاتی ہے۔

مقدمین علمائے عیسائی نے خیال کیا ہے کہ باب ہفت دہم کتاب اول سموئیل کے ورس ۱۱ لغایت ۳۱ ورس ۵۵ لغایت ۵۸ و باب ہیجدہم کے ورس ۱ لغایت ۵ صحیح نہیں ہیں اور ان کو خارج کر دیا ہے۔ چنانچہ سیٹو ایجنٹ کے قلمی نسخہ وٹیکن میں وہ آیتیں نہیں ہیں اور اگر وہ آیتیں نکال ڈالی جاویں تب بھی اور آیتوں میں جیسے کہ باب ۱۶ کے ورس ۱۸ لغایت ۲۱ و باب ۱۷ کے ورس ۳۳ لغایت ۳۴ کی مطابقت ہی نہیں ہو سکتی۔ انہی اختلافات کے سبب بعض عیسائی عالموں کی یہ رائے ہے کہ سارے کا سارا سترہواں باب الحاق و نامعتبر ہے جان کیٹو نے اپنی کتاب

سیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ”یہی کافی نہیں ہے کہ جس مقام کو ہم غلط سمجھیں اسے الحاق سمجھ کر خارج کر دیں اور باقی کو بلا کم و کاست صحیح جانیں کیوں کہ ممکن ہے کہ جنہوں نے الحاق کیا تھا انہوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو۔

علاوہ اس کے یہ بھی تحقیق نہیں ہے کہ سموئیل کی کتابیں کب لکھی گئیں اور کس نے لکھی ہیں۔ یہودی اور بڑے بڑے عیسائی عالم خیال کرتے ہیں کہ سموئیل کی کتاب کا بڑا حصہ یا پہلے چوبیس باب سموئیل کے لکھے ہوئے ہیں اور باقی ناٹان نبی و گید نبی کے لکھے ہوئے ہیں۔ ابر ہانیل اور کروشیس خیال کرتے ہیں کہ یہ سب کتابیں یرمیاہ نبی نے لکھی ہیں۔ جان کی یہ رائے ہے کہ یہ کتابیں سموئیل کے بہت زمانہ بعد یعنی قید بابل کے تیسویں سال میں لکھی گئی ہیں اگر درحقیقت ایسا ہی ہو کہ تین ہاتھوں نے ان کتابوں کو لکھا ہو تو واقعات کا الٹ پلٹ ہو جانا یا بعض واقعات کا تحریر سے رہ جانا ایک ایسا امر ہے جو آسانی سے خیال میں آ سکتا ہے۔

ہماری غرض اس بحث سے سموئیل کی کتابوں پر جرح و قدح کی نہیں ہے بلکہ صرف یہ بات ثابت کرنی ہے کہ قرآن مجید پر اس وجہ سے کہ سموئیل کی کتابوں سے بیان مختلف ہے اعتراض نہیں ہو سکتا جب تک کہ اور طرح پر اس کی غلطی ثابت نہ کی جاوے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ قرآن مجید میں جو کچھ لکھا ہے اس کی صحت پر کسی کو اس وجہ پر مجبور کروں کہ قرآن میں لکھا ہے۔ بلکہ میں دونوں واقعوں پر جو قرآن و کتاب سموئیل میں مندرج ہیں بطور ایک نکتہ چن مؤرخ کے غور کرنا اور اس نکتہ چینی سے دونوں قولوں میں سے ایک کو ترجیح دینا چاہتا ہوں۔

تابوت سکینہ کو فلسطینی فتح کر کے چھین لے گئے تھے۔ کتاب سموئیل میں اس کا واپس بھیج دینا ایسے عجیب اور کراماتی واقعوں پر مبنی کیا ہے جس کو کوئی آزاد رائے کا مؤرخ جو واقعات کو انسانوں کے حالات اور افعال کا نتیجہ سمجھتا ہے تسلیم نہیں کر سکتا۔ لڑائی کی شکست ہونے کے بعد بنی اسرائیل نہایت ضعیف ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ انہوں نے پھر قوت حاصل کی تھی تابوت سکینہ کا دشمنوں کے ہاتھ میں چلا جانا بلاشبہ ان کو نہایت رنج دیتا ہوگا اور ان کی نہایت آرزو یہ ہوگی کہ وہ اس کو پھر اپنے دشمنوں سے واپس لیں۔

اس شکست کے بیس برس بعد وہ فلسطینیوں سے پھر لڑے اور فلسطینیوں نے شکست پائی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے فلسطینی کمزور ہو گئے تھے۔ فلسطینی خوب جانتے ہوں گے کہ بنی اسرائیل جب تک کہ تابوت سکینہ ان کے ہاتھ نہ لگے لڑائی سے باز نہیں آنے کے۔ اس عرصہ میں بنی اسرائیل کو زیادہ قوت ہو گئی اور سموئیل نبی نے تمام فرقوں کو جو عیسیٰ کے مرنے کے بعد متفرق ہو گئے اکٹھا کر لیا اور طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اور یہ امر بنی اسرائیل کی زیادہ قوت کا اور فلسطینیوں کو جو کمزور ہوتے جاتے تھے زیادہ خوف کا باعث ہوا ہوگا۔ انہوں نے سمجھا ہوگا کہ اگر قابوت سکینہ واپس کر دیا جاوے تو شاید مصیبت جنگ سے حفاظت ہو جاوے انہوں نے جانچا اس کو منتقل کیا اور آخر کار ایک گاڑی میں لاد کر مع زر و تحائف کے بیت الشمس کی سرحد میں جو بنی اسرائیل کا ایک شہر فلسطینیوں کی سرحد سے ملا ہوا تھا چھوڑ آئے اور اس تمام اصلی واقعہ پر خیال کرنے سے اس بات کو کہ تابوت سکینہ طالوت کے عہد میں آیا ہوگا۔ جیسا کہ قرآن میں مندرج ہے زیادہ ترجیح ہوتی ہے۔

دریا کے پانی پینے سے منع کرنے کی نسبت اول ہم کو خیال کرنا چاہیے کہ جہاں طائلوٹ و جالوت میں لڑائی ہوئی تھی وہ کیا مقام تھا ۔ فلسطینی مقام سوکوه غریقہ دمیم میں جمع ہوئے تھے اور بنی اسرائیل وادی ایلاہ میں دونوں لشکروں کے درمیان دریائے شوروک واقع تھا ۔ فلسطینی اس کے بائیں کنارہ پر یعنی جانب جنوب تھے اور بنی اسرائیل اس کے دائیں کنارہ پر یعنی جانب شمال تھے اور بنی اسرائیل نے دریا کو عبور کر کے فلسطینیوں پر حملہ کیا تھا ۔ پس قرآن مجید کے ان لفظوں کی کہ ”ان اللہ مبتلیکم بنسہر“ جغرافیہ اور تاریخ سے بخوبی تصدیق ہوتی ہے ۔

باقی رہا اس کے پانی پینے سے منع کرنا ۔ ہر شخص جو لڑائیوں کے حالات سے واقف ہے اس بات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر فوج کشی کرتی ہے تو ہر ایک شخص اس کی قوم کا بہادر اور غیر بہادر اور دل چلا اور دل کا بودا قومی لحاظ سے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے لیکن جب وقت حملہ کرنے کا آتا ہے تو مہینہ سالار ایک طریقہ ایسے لوگوں کے انتخاب کرنے کا مقرر کرتا ہے جس کے سبب حملہ میں وہی لوگ شریک رہیں ۔ جو نہایت بہادر اور دل چلے ہوں اور درحقیقت اپنے دلی جوش سے لڑائی میں شریک ہوئے ہوں ۔

جب جدعون نے مدبانیوں پر فوج کشی کی تھی تو اس نے حملہ کے وقت یہ قرار دیا تھا کہ جو شخص اس چشمہ سے جو اس لشکر کے پاس تھا پانی پی لے وہ حملہ میں شریک نہ ہو اور جو نہ پیئے بلکہ صرف ہاتھ بھگو کے زبان تر کر لے وہ حملہ میں شریک رہے ۔ اس سے مقصود صرف یہ تھا کہ جن لوگوں کو لڑنے اور جان دینے میں تذبذب ہو وہ چھٹ جائیں اور جو بالکل لڑنے اور مرنے

پر آمادہ ہوں وہ حملہ میں شریک رہیں ۔

اگرچہ شبہ ہے کہ جہاں جدعون کی مدیانیوں سے لڑائی ہوئی تھی وہاں کوئی چشمہ نہیں تھا اور اس لیے کتاب قضاۃ میں طالوت کا واقعہ جدعون کے قصہ سے ملا دیا ہے ۔ لیکن اگر اس کو جدعون ہی کے وقت کا واقعہ تسلیم کر لیا جاوے تو طالوت کو یہ واقعہ ضرور معلوم ہوگا اور اتفاق سے طالوت کا لشکر بھی دریا کے کنارہ پڑا تھا اور دریا کے پار اتر کر حملہ کرنا قرار پایا تھا ۔ ہر طرح پر یقین کرنے کا موقع ملا ہے کہ طالوت نے بھی اُسی طریقہ پر ان لوگوں کا جو حملہ میں دل سے شریک ہوئے کو تھے انتخاب کرنا چاہا ہوگا ۔ اور وہی طریقہ انتخاب کا اختیار کیا ہوگا جو جدعون نے اختیار کیا تھا ۔ ہاں کتاب سموئیل میں اس انتخاب کا ذکر نہیں ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے ۔ کتاب سموئیل میں اس کا ذکر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ واقعہ نہ ہوا ہو ۔ عیسائی مؤرخوں نے کج بحثی سے یہ اعتراض کیا ہے کہ قرآن مجید میں جدعون کے قصہ کو طالوت کے قصہ میں ملا دیا ہے ۔ پس یہ اعتراض کرنے والوں کی غلطی ہے ۔ کیوں کہ تمام واقعات کو خیال کرنے سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جدعون کے عہد میں جو واقعہ ہوا وہ علیحدہ ہے اور طالوت کے عہد میں جو واقعہ ہوا اور جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ علیحدہ ہے اور کم سے کم اس میں تو کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس زمانہ کے یہود جب قرآن مجید نازل ہوا ۔ اس واقعہ کا طالوت کے عہد میں بھی واقع ہونے کا یقین رکھتے تھے ۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو انہی کے مقابلہ میں قرآن مجید میں اعلانیہ ایسا بیان نہیں ہو سکتا ۔

آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہے نہایت صاف ہیں صرف ایک

مقام تفسیر کے قابل ہے۔ جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ ”طالوت کے عہد سلطنت میں تابوت سکینہ کو فرشتے اُٹھا لاویں گے“ ”تَحْمَلْهُ الْمَلَائِكَةُ“ جالوت نے جب لڑائی میں مغلوب ہونے کے ڈر سے تابوت سکینہ کو بنی اسرائیل کے ملک میں بھیج دینا چاہا تو اُس کو ییلوں کی گاڑی پر لاد کر بنی اسرائیل کے ملک کی سرحد میں چھڑوا دیا تھا۔ یہ قصہ سموئیل کی کتاب میں ہے۔ ہمارے علمائے مفسرین نے کہہ دیا کہ ان ییلوں کو جن پر کوئی ہانکنے والا نہ تھا فرشتے ہنکا لائے تھے اور یہی معنی تَحْمَلْهُ الْمَلَائِكَةُ کے قرار دیے ہیں۔ بعض عالموں نے سمجھا کہ یہ معنی تو ٹھیک تَحْمَلْهُ کے لفظ کے چسپاں نہیں ہوتے۔ انہوں نے یہ قیاس لگایا کہ موسیٰ کے بعد سے تابوت سکینہ کو دنیا سے اوپر فرشتے اُدھر اُٹھائے ہوئے تھے پھر طالوت کو لا کر دے دیا یہ سب غلط قیاسات ہیں۔ آیت کا مطلب صاف ہے کہ بنی اسرائیل کو تابوت سکینہ کے ہاتھ آنے کی بڑی خواہش تھی۔ سموئیل پیغمبر نے جب طالوت کو بادشاہ مقرر کیا تو فرمایا کہ اس کی بادشاہت میں تابوت سکینہ آ جاوے گا اور جو کہ اس کا ہاتھ آنا نہایت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ اس کو فرشتے اُٹھا لاویں گے۔ جیسے کہ ایسے موقع پر بطور تقویت قلب کے بولا جاتا ہے۔



## موسلی ، فرعون اور بنی اسرائیل

حضرت موسلی ، بادشاہ فرعون اور حضرت موسلی کی قوم بنی اسرائیل کے متعلق جو واقعات قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں وہ ۱۹ موضوعات میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :

- (۱) تحقیق لفظ آیہ و لفظ بیسنہ - (۲) حقیقت سحر - (۳) تخیل تحریک جبل و عصائے سحرہ فرعون (۴) عصائے موسلی اور آس کا بطور اژدہ کے دکھائی دینا - (۵) بیان ید بیضا - (۶) ذکر قتل اولاد بنی اسرائیل - (۷) بیان قحط - (۸) ذکر طوفان ، وجراد - و قمل ، و ضفادع - و دم - (۹) غرق فی البحر - (۱۰) اعتکاف حضرت موسلی کا پہاڑ میں - (۱۱) حقیقت کلام خدا با موسلی - (۱۲) حقیقت تجلی للجبیل - (۱۳) بیان کتابت فی اللواح - (۱۴) اتخاذ عجل - (۱۵) ستر آدمیوں کا منتخب کرنا - (۱۶) ذکر استسقاء قوم موسلی اور ظاہر ہونا چشموں کا - (۱۷) سایہ کرنا ابر کا - (۱۸) من و سلویٰ کا آئنا - (۱۹) دخول باب -

ذیل میں ہم ان انیسویں امور کی نسبت علیحدہ علیحدہ بیان کرنا چاہتے ہیں -

### اول - تحقیق معنی لفظ آیہ و بیسنہ

ہم نے حضرت عیسیٰ کے بیان میں یہ تحت تفسیر ”و انینا عیسیٰ ابن مریم البیسنات“ لفظ آیہ و بیسنہ پر مفصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان الفاظ کے معنی معجزہ کے نہیں

ہیں بلکہ احکام کے ہیں اور یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ معجزہ دلیل ثبوت نبوت نہیں ہو سکتا اور اس صورت میں آیہ و بیِّنہ کے معنی اس غرض سے معجزہ کے لینے کہ وہ مثبت نبوت ہوتا ہے خطر القتاد سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتا۔ اس بحث کو آگے کے مضمون حضرت عیسیٰ کے معجزات میں پڑھیں۔

### دوم۔ حقیقت سحر

اور یہ کہ کن معنوں میں اُس کا استعمال ہوتا ہے

سحر کا لفظ قرآن مجید میں بہت جگہ آیا ہے مگر بہت سے الفاظ زبان عرب میں ایسے مستعمل تھے جن کے لیے فی الواقع کوئی حقیقت نہ تھی اور نہ درحقیقت اُن کا مصداق تھا نہ اُن کا کوئی مسمی حقیقتاً وجود رکھتا تھا۔ بلکہ عرب جاہلیت نے اپنے وہم میں ایک شے غیر موجود کا وجود قرار دیا تھا اور اُس سے کچھ افعال منسوب کئے تھے اور اُس شے غیر موجود وہمی کے لئے وہ الفاظ مستعمل کرتے تھے۔ قرآن مجید اہل عرب کی زبان میں نازل ہوا اور اس لئے اُس زبان کے محاورہ کے موافق وہ الفاظ بھی قرآن مجید میں آئے ہیں۔ مگر قرآن مجید میں اُس کا استعمال اُن اثروں کے سمجھانے کے لئے ہوا ہے جو اثر کہ اہل عرب اُن لفظوں سے پاتے تھے نہ اس لئے کہ اُن لفظوں کے لئے فی الواقع کوئی حقیقت تھی یا درحقیقت اُن کا کوئی مصداق تھا۔

اس کی مثال میں ہم ایک مباحثہ لطیف کا ذکر کرتے ہیں جو قتال ابو عبیدہ ارسِل الی  
 الفضل بن الربیع الی  
 البصرة فی الخروج الیہ  
 فقدمت علیہ وکننت اخبر  
 عن تبجرہ فاذا لی فدخلت  
 علیہ وهو فی مجلس طویل  
 خلیفہ منصور کے وزیر ابوالفضل  
 بن ربیع کی مجلس میں ایک بہت  
 بڑے عالم سے ہوا تھا۔ مراة  
 الجنان المشہور بہ تاریخ یافعی  
 میں لکھا ہے کہ فضل بن ربیع  
 نے جو خلیفہ منصور کا وزیر اور

عریض فیہ بساط واحد قد  
 ملاء وفی صدره فرش عالیة  
 لایر تقی علیہا الالبکریسی  
 وهو جالس علی العرش  
 فسلمت علیہ بالوزارة فرد  
 وضحک الی واستد ثانی من  
 فرشه ثم سألنی وبسطنی و  
 تلطف بی وقال فانشدنی  
 فانشدته من عیون اشعار  
 جاهلیة احفظها فقال قد  
 عرفت اکثر هذه وارید من  
 سلیح الشعر فانشدته  
 فطرب وضحک وزاده نشأ  
 طامم دخل رجل فی ذی الکتاب  
 وله هیئة حسنة فاجلسه  
 الی جانبی وقال اتعرف هذا  
 قال لا فقال هذا ابو عبیدة  
 علامة اهل البصرة اقدم مناه  
 لئلا یستفید من علمه قد عاله  
 الرجل ثم التفت الی وقال  
 لی کنت الیک مشتاقا و  
 قد سألت عن مسئلة افتادن  
 لی ان اعرفک ایما هاقلمت  
 هات فقال قال الله تعالی  
 طلعتها کانه رؤس الشیاطین

ایک بہت بڑا عالم تھا ابو عبیدہ  
 کے پاس جو اس زمانہ کے بہت  
 بڑے عالم متبحر تھے اور بصرہ  
 میں تھے ایک شخص بھیجا اور  
 اپنے پاس بلایا وہ آئے اور ان  
 کو وزیر کی مجلس میں آنے کی  
 اجازت ملی جب وہ مجلس میں  
 گئے تو دیکھا کہ وہ ایک بہت  
 لمبے چوڑے مکان میں ہے جس  
 میں بھرپور ایک ہی کپڑے کا  
 فرش بچھا ہوا ہے اور صدر میں  
 ایک بہت اونچی جگہ پر جس پر  
 بغیر زینہ کے چڑھا نہیں جا سکتا  
 مسند تکیہ لگا ہوا ہے اور وہ  
 اس پر بیٹھا ہے۔ ابو عبیدہ نے  
 موافق اس آداب کے جو وزیروں  
 کے لئے مقرر کیا تھا سلام علیک  
 کی وزیر نے اس کا جواب دیا اور  
 اپنی مسند کے پاس بیٹھنے کی  
 اجازت دی۔ پھر ابو عبیدہ کی  
 خیر و عافیت پوچھی اور  
 حالات دریافت کیے اور بہت  
 مہربانی کی۔ پھر کہا کہ کچھ  
 اشعار پڑھو۔ ابو عبیدہ نے عرب  
 جاہلیت کے نہایت عمدہ اشعار

وانہا یقع الوعد والا یعاد  
 بما قد عرف وھذالم یعرف  
 قال فقلت انہا کلم اللہ العرب  
 علی قدر کلامہم اما  
 سمعت قول امری القیس -  
 ایقتلنی والہم شرفی مضاجعی  
 ومسئونۃ رزق کانیاب اغوال  
 وھم لم یرو الغوال قط  
 ولکنہ لما کان امر الغول  
 یھولہم اوعد وابہ فما ستحسن  
 الفضل والسائل فی ذلک -  
 (مرآۃ الجنان - ورق ۱۵۷)

جو اس کو یاد تھے پڑھے -  
 وزیر نے کہا کہ ایسے تو بہت  
 سے اشعار میں بھی جانتا ہوں  
 میرا یہ مقصد تھا کہ کچھ  
 نمکین چٹ پٹے اشعار سناؤ ابو عبیدہ  
 نے ویسے ہی اشعار پڑھے جن  
 کو سن کر وزیر خوش ہوا اور  
 ہنسا اور مزے میں آ گیا - اتنے  
 میں وزیر کا ایک منشی جو وجیہ  
 آدمی تھا آ گیا وزیر نے اس کو  
 ابو عبیدہ کے پاس بیٹھنے کا حکم  
 دیا اور ابو عبیدہ کی طرف اشارہ

کر کے منشی سے پوچھا کہ تم ان کو جانتے ہو اس - عرض کیا  
 کہ میں نہیں جانتا وزیر نے کہا کہ یہ ابو عبیدہ ہیں علامہ اہل  
 بصرہ - میں نے ان کو بلایا ہے تاکہ ان کے علم سے ہم فائدہ  
 اٹھاویں اس منشی نے وزیر کو دعا دی اور ابو عبیدہ کی طرف متوجہ  
 ہوا اور کہا کہ میں آپ سے ملنے کا بہت مشتاق تھا - لوگوں نے  
 مجھ سے ایک مسئلہ پوچھا ہے آپ مجھ کو اجازت دیتے ہیں کہ اس  
 کو آپ سے کہوں - ابو عبیدہ نے کہا کہ کہو - اس منشی نے کہا  
 کہ خدا تعالیٰ نے دوزخ کے درخت کے پھل کو شیطان کے سروں  
 سے تشبیہ دے کر ڈرایا ہے مگر لالچ دینا یا ڈرانا ایسی چیز سے  
 ہو سکتا ہے جس کو لوگ جانتے ہوں مگر شیطانوں کے سروں کو  
 تو کوئی نہیں جانتا کہ کیسے ہیں - ابو عبیدہ نے کہا کہ خدا نے  
 عرب کے کلام کے مطابق کلام کیا ہے کیا تم نے امراء القیس کا

قول نہیں سنا چناں چہ ابو عبیدہ نے وہ شعر پڑھا جس کا مطلب یہ ہے -

کیا وہ مجھ کو مار ڈالیں گے اور تلوار میری ساتھ لیٹی ہے  
اور نیلی چمک دار برجھیاں ہیں مانند دانتوں غول بیابانی کے  
اُس شخص نے جس کے حق میں یہ شعر کہا ہے یا اور کسی  
نے غول بیابانی کو کبھی نہیں دیکھا تھا - مگر جب کہ غول  
بیابانی کا ہول اُس کے دل میں تھا تو اُس سے اُن کو ڈرایا - اس  
تقریر کو وزیر ابو الفضل اور اُس کے منشی دونوں نے پسند کیا -  
(انتہی)

غرض کہ جس طرح امراء القیس کے شعر سے یہ لازم نہیں آتا  
کہ درحقیقت غول بیابانی کے لمبے لمبے نیلے نیلے چمک دار دانت  
ہوتے ہیں اسی طرح قرآن مجید میں جو رؤس الشیاطین کا لفظ  
آیا ہے اُس کو یہ لازم نہیں آتا کہ درحقیقت شیطان کا ڈراؤنا سر  
ہوتا ہے بلکہ جس چیز سے اپنے خیالات کے موافق عرب دہشت  
کھاتے تھے اُسی سے اُن کے خیالات کے موافق وعید آئی ہے - اسی  
طرح سحر کا لفظ جہاں قرآن میں آیا ہے وہ صرف عرب جاہلیت کے خیال  
کے موافق آیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس طرح پر عرب  
جاہلیت سحر کو سمجھتے تھے درحقیقت اُس طرح پر اُس کا وجود  
تھا یا خدا تعالیٰ نے اُس کا واقعی ہونا بتایا ہے یا عرب جاہلیت  
کے خیالات کی تصدیق کی ہے -

اسی طرح سینکڑوں لفظ قرآن مجید میں حسب محاورہ زبان عرب  
و عزمت منذ ذالک اور بلحاظ خیالات عرب جاہلیت  
اليوم ان اصنع کتابا فی القرآن آئے ہیں جن سے اُن کا واقعی ہونا  
لمثل هذا و اشباہه و لما مراد نہیں ہے - علما نے متقدمین  
يحتاج اليه من علمه فلما نے اس باب میں کتابیں لکھی

رجعت الى البصرة علمت ہیں - چنان چہ تاریخ یافعی میں کتاب لذی سمیثہ البجاز - لکھا ہے کہ اس مباحثہ کے (مرآة الجنان یافعی صفحہ بعد ابو عبیدہ نے اسی دن سے ارادہ کیا کہ وہ قرآن کے اس قسم کے (۱۵۷)

الفاظ کے بیان میں ایک کتاب لکھے اور جب وہ بصرہ میں واپس آگیا تو اس نے کتاب لکھی اور اس کا نام مجاز رکھا - افسوس ہے کہ اس قسم کی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں ہمارے زمانہ کے عالم آن کتابوں سے نا واقف محض ہیں - اور جب کوئی شخص جس کو خدا نے بصیرت دی ہے قرآن مجید پر غور کر کے اور تمام حالات کو پیش نظر رکھ کے اس قسم کے الفاظ کی نسبت کچھ لکھتا ہے تو ان کو ایک نئی بات معلوم ہوتی ہے اور چونک اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو نص کے برخلاف ہے حالانکہ جس کو وہ نص سمجھتے ہیں درحقیقت وہی نص کے برخلاف ہے -

سحر جس طرح کہ لوگ اس پر یقین کرتے ہیں اور عرف عام میں جس طرح پر وہ سمجھتا جاتا ہے اس کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور نہ قرآن مجید سے اس کی تصدیق پائی جاتی ہے - ہاں تمام انسانوں میں خواہ وہ انبیاء ہوں یا اولیا یا عوام الناس یا کسی مذہب کے ہوں حتیٰ کہ حیوانوں میں بھی ایک قسم کی قوت مقناطیسی موجود ہے جو خود اس پر اور نیز دوسروں پر ایک قسم کا اثر پیدا کرتی ہے - یہ قوت بمقتضائے خلقت بعضوں میں ضعیف اور بعضوں میں قوی اور بعضوں میں اقویٰ ہوتی ہے - اور جس طرح اور قوائے انسانی ورزش سے قوت پکڑتے ہیں جیسے کہ پنچہ کشی کی ورزش سے پنچہ میں - کلائی کی ورزش سے کلائی میں زیادہ قوت آجاتی ہے اسی طرح اس قوت دماغی میں بھی خاص قسم کی ورزش سے قوت زیادہ ہو جاتی ہے - انسان جو خواب میں عجیب عجیب چیزیں دیکھتا ہے اور

عجیب واقعات و حالات اُس پر گزرتے ہیں جن کو وہ سمجھتا ہے کہ درحقیقت وہ تمام چیزیں موجود ہیں اور فی الواقع وہ حالات اُس پر گزر رہے ہیں اُسی قوت کے اثروں میں سے ہے حالاں کہ وہ چیزیں درحقیقت نہ موجود ہوتی ہیں اور نہ فی الواقع وہ حالات اُس پر گزرتے ہیں۔

یہ کیفیت جس طرح کہ خواب طبعی میں ہوتی ہے کبھی حالت بیداری میں بھی پیدا ہو جاتی ہے آدمی سمجھتا ہے کہ میں جاگتا ہوں اور درحقیقت وہ جاگتا بھی ہوتا ہے مگر اُس پر ایک قسم کی خواب طاری ہو جاتی ہے جو خواب مقناطیسی سے تعبیر کی جا سکتی ہے اور اس حالت میں انسان ایسی چیزوں کو موجود دیکھتا ہے جو فی الحقیقت موجود نہیں ہیں اور ایسے واقعات اپنے پر گزرتے ہوئے یقین کرتا ہے جو درحقیقت اُس پر نہیں گزرتے۔

یہ قوت مقناطیسی جس میں قوی ہوتی ہے وہ دوسرے شخص پر بھی ڈال سکتا ہے اور اُس دوسرے شخص پر بحالت بیداری ایک قسم کی خواب مقناطیسی طاری ہوتی جاتی ہے۔ کبھی دوسرا شخص جاگتا رہتا ہے اور خواب مقناطیسی اُس پر طاری رہتی ہے اور کبھی وہ اُسی خواب مقناطیسی میں بیہوش ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوتا ہے۔

اس قوت مقناطیسی سے کیا کیا چیزیں ظہور میں آتی ہیں بحث طلب ہیں جو لوگ اس فن کے عامل ہیں وہ اس قوت سے بہت سی عجائب و غرائب چیزوں کے ظہور کا دعویٰ کرتے ہیں مگر جب تک وہ تجربہ اور مشاہدہ میں نہ آویں اُس وقت تک اُن کے صحیح و غیر صحیح ہونے کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ ہاں صرف اُن باتوں کے وجود سے یا اُن کے ظہور پذیر ہونے سے انکار کیا جا سکتا ہے جو معلومہ قوانین قدرت کے برخلاف ہیں۔ یا این ہمہ جو امور

کہ اُس سے ظہور میں آویں وہ صرف خیالی اور وہمی ہوتے ہیں جیسے خواب کی چیزیں نہ اصلی اور واقعی ۔

یہ قوت بعض آدمیوں میں خلقی نہایت قوی ہوتی ہے اور جو لوگ مجاہدات کرتے ہیں اور لطائف نفسانی کو متحرک کرتے ہیں خواہ وہ اُن مجاہدات میں خدا کا نام لیا کریں یا اور کسی کا اُن میں بھی یہ قوت نہایت قوی ہو جاتی ہے اور اُس کے اثر ظاہر ہونے لگتے ہیں ۔ اُن اثروں کو جب کہ مسلمانوں سے ظاہر ہوتے ہیں مسلمان کرامت سے تعبیر کرتے ہیں اور جب کہ غیر مذہب والے سے ظاہر ہوتے ہیں اُس کو استدراج سے تعبیر کرتے ہیں حالاں کہ دونوں کی اصلیت واحد ہے ۔ بہر حال جو کچھ کہ اُس سے ظاہر ہو اس کا کوئی وجود اصلی و حقیقی نہیں ہے بلکہ صرف وجود وہمی و خیالی ہے ۔

اسی قسم کی تاثیرات نفسانی کے ظہور کو جب کہ اُن کا برانگیختہ کرنا ایسے مجاہدات سے کیا گیا ہے جو خدا کے سوا اور اشیا یا اشخاص کے تصور و تذکر سے تعلق رکھتے ہیں سحر سے تعبیر کیا گیا ہے اگرچہ صاحب تفسیر کبیر نے بھی سحر کی نسبت بہت لمبی بحث لکھی ہے ۔ مگر ابن خلدون نے اس بحث کو نہایت خوب سے صاف صاف مختصر طور پر لکھا ہے ۔ جس کو ہم مجنسہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے لکھا ہے ۔

حقیقۃ السحر ۔ وذلک	کہ سحر کی حقیقت یہ ہے کہ
ان النفوس البریۃ وان کانت	نفوس انسانی اگرچہ نوعیت کے
واحدة بالنوع فہی مختلفة	لحاظ سے متحد ہیں مگر خاصیتوں
بالخواص وہی اصناف کل	کے اعتبار سے مختلف ہیں ۔ اور
صنف مختص بخاصیۃ واحدة	وہ چند قسم کے ہیں ۔ ہر ایک
بالنوع لا توجد فی الصنف	قسم ایک نوع خاص کی خاصیت



الآخر وصارت تلك الخواص  
 فطرة و جبلة لصفها  
 فنفس الانبياء عليهم  
 الصلوة والسلام لها  
 خاصية تستعد بها  
 المعرفة الربانية و مخاطبة  
 الملائكة عليهم السلام  
 عن الله سبحانه و تعالى  
 كما رويما يتبع ذلك من  
 التأثير في الاكوان و استجلاب  
 روحانية الكواكب التصرف  
 فيها و التأثير بقوة نفسانية  
 او شيطانية فاما تأثير  
 الانبياء فمدد الهی و خاصية  
 ربانية و نفوس الكهنة  
 لها خاصية الاطلاع على  
 المغيبات بقوى شيطانية  
 و هكذا كل صنف مختص  
 بخاصية لا توجد في الآخر  
 و النفوس الساخرة على  
 مراتب ثلاثة ياتي شرحها  
 و لها الموثرة بالهمة  
 فقط من غير الة و لامعين  
 و هذا هو الذي تسمية  
 الفلاسفة السحر و الثاني

کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو  
 دوسری قسم میں نہیں پائی جاتی -  
 اور یہ خاصیتیں ان کی جبلت اور  
 سرشت ہیں - پس انبیا علیہم  
 اسلام کے نفوس کو ایک خاص  
 مناسبت ہوتی ہے جس کی وجہ  
 سے وہ خدا کی معرفت اور فرشتوں  
 سے (جو خدا کی طرف سے آتے  
 ہیں) بات چیت کی - اور اس قسم  
 کے اور کام کی یعنی موجودات  
 میں تاثیر کی - اور ستاروں کی  
 روحانیت کی تسخیر کی ان میں  
 تصرف کرنے کی غرض سے قائل  
 ہوتے ہیں - اور تاثیر قوت  
 نفسانیہ سے ہوتی ہے یا شیطانیہ  
 سے - لیکن انبیاء کی تاثیر تو وہ  
 امداد الہی اور خاصیت ربانی ہے  
 اور جادوگروں کے نفوس کو  
 غائب چیزوں پر اطلاع حاصل  
 کرنے کی خاصیت قوائے شیطانیہ  
 کے ذریعہ سے ہے اور اسی طرح  
 ہر ایک قسم ایک خاصیت کے  
 ساتھ مخصوص ہے جو کہ دوسری  
 میں نہیں پائی جاتی اور جادوگروں  
 کے نفوس کے مختلف درجے ہیں

بمعین من مزاج الافلاک  
 او العناصر او خواص  
 الاعداد و یسمونها الطلسمات  
 و هی اضعف رتبة من الاول  
 و الثالث تاثیر فی القوی  
 المتخیلة یعمد صاحب  
 هذا التأثير الی القوی  
 المتخیله - فیتصرف  
 فیها بنوع من التصرف  
 ویلقی فیها انواعا من  
 الخیالات و المحاکات و صورا  
 مما یقصد من ذلک ثم  
 ینزلها الی الحس من  
 الرائین بقوة نفسه الموثرة  
 فیه فینظر الراؤن کانها  
 فی الخارج ولیس هناك  
 شیئا من ذلک کما یحکی  
 عن بعضهم انه یری  
 البساتین و الانهار و القصور  
 ولیس هناك شی من ذلک  
 ویسمى هذا عند الفلاسفة  
 الشعودة او الشعبة هذا  
 تفصیل مراتبه ثم هذه  
 الخاصیة تكون فی الساهر  
 بالقوة شان القوی لبشریة

جن کی تفصیل آتی ہے - قسم  
 اول تو صرف ہمت کے ذریعہ سے  
 بغیر کسی آلہ اور مددگار کے  
 تاثیر کرنے والی ہیں اور فلاسفہ  
 اسی کو سحر کہتے ہیں - دوسری  
 قسم بذریعہ کسی معین کی تاثیر  
 کے ہے یعنی افلاک یا عناصر  
 کے مزاج یا عددوں کی خاصیتوں  
 سے اور اُس کو طلسمات کہتے  
 ہیں اور یہ قسم اول سے رتبہ  
 میں کم ہے - تیسری قسم خیالی  
 قوتوں میں تاثیر کرنا ہے - اس  
 تاثیر والا آدمی قوائے متخیلہ کی  
 طرف توجہ کرتا ہے پس اُن میں  
 ایک خاص قسم کا تصرف کرتا ہے  
 اور میں طرح طرح کے خیالات اور  
 گفتگو اور صورتیں جو کچھ اُس  
 کو مقصود ہوتی ہیں ڈالتا ہے  
 پھر اُن کو دیکھنے والوں کی  
 حس پر ڈھالتا ہے اپنے نفس موثرہ  
 کی قوت کے ذریعہ سے - سو  
 دیکھنے والے ایسا دیکھتے ہیں  
 کہ گویا وہ خارج میں موجود  
 ہیں اور حالاں کہ وہاں کچھ  
 نہیں ہوتا - جیسا کہ بعض

کلہا و انما تخرج الی لوگوں کا قصہ بیان کیا جاتا ہے  
 الفعل بالریاضۃ - وہ باغ ، نہریں ، مکانات دیکھتے  
 (مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۵۸) ہیں اور وہاں کچھ نہیں ہوتا -  
 فلاسفہ کے نزدیک یہ شعودہ یا شعبدہ ہے - یہ اُس کے مراتب کی  
 تفصیل ہے - پھر یہ خاصیت ساحر میں اور قوائے بشریہ کی طرح  
 بالقوہ موجود ہوتی ہے مگر ریاضت کرنے سے بالفعل موجود  
 ہو جاتی ہے -

ابن خلدون نے جو سحر کے تین درجے قرار دیے ہیں حقیقت  
 میں وہ تینوں سے واحد ہیں پہلا درجہ صرف ہمت کی تاثیر قرار دیا  
 ہے اور تیسرا درجہ متخیلہ میں چیزوں کا جمع کر کے دوسرے کے  
 متخیلہ میں اُس کا القاء کرنا قرار دیا ہے - یہ قسم درحقیقت صرف  
 ہمت ہی سے متعلق ہے کوئی شے اُس سے علیحدہ نہیں ہے دوسرا  
 درجہ امداد کا مزاج افلاک و عناصر اور خواص اعداد سے قرار دیا  
 ہے حالانکہ اس بات کے لیے کہ افلاک و کواکب و اعداد سے  
 درحقیقت اس میں کچھ اعانت ہوتی ہے کچھ ثبوت نہیں ہے پس یہ  
 دوسری قسم محض فرضی ہے اور تینوں قسمیں قسم واحد ہیں - یعنی  
 صرف ہمت سے تاثیرات کا ظہور -

اسی قوت نفسی کے آثار جب انبیاء علیہم السلام سے ظاہر  
 و الفرق عندہم بین ہوتے ہیں تو اُس کو معجزہ سے  
 المعجزة والسحران المعجزة تعبیر کیا جاتا ہے ابن خلدون  
 قوت السہیۃ تبعث فی النفس نے معجزہ اور سحر میں یہ فرق  
 ذلک التاثر فہو مؤید بتلایا ہے کہ اُن کے نزدیک  
 بروح اللہ علی فعلہ ذلک (یعنی حکمائے الہین کے نزدیک)  
 و الساحر انما یفعل المعجزہ و سحر میں یہ فرق ہے  
 ذلک من عند نفسه وبقوتہ معجزہ ایک قوت الہی ہے

جو نفس میں اس تاثیر کو برانگیختہ کرتی ہے۔ پس وہ شخص (صاحب معجزہ) اس کام کے کرنے میں خدا کی روح سے تائید یافتہ ہوتا ہے اور ساحر اسی کام کو اپنی طرف سے اور قوت نفسانیہ کے ذریعہ سے اور بعض حالتوں میں شیاطین کی مدد سے کرتا ہے۔ پس ان دونوں میں معقولیت، حقیقت، ذات، کی رو سے ایک واقعی فرق ہے اور ہم اس تفرقہ پر ظاہری علامتوں سے استدلال کرتے ہیں اور وہ یہ کہ معجزہ اچھے شخص سے اچھے مقصدوں کے لیے ہوتا ہے اور نفوس متمحصہ سے اچھے کام کے لیے دعویٰ نبوت پر تحدی کے لئے ہوتا ہے اور سحر برے آدمی سے برے کام کے لیے۔ اکثر مرد و عورت میں جدائی ڈالنے کے لیے دشمنوں کو ضرر پہنچانے کے لیے اور اسی قسم کے کاموں کے لیے ہوتا ہے اور نفوس متمحصہ سے شر کے لیے ہوتا ہے۔ حکمائے الہیین کے

النفسانية و بامداد الشياطين في بعض الاحوال فبينهما الفرق في المعقولية و الحقيقة والذات في نفس الامر و انما استدل نحن على التفرقة بالعلامات الظاهرة وهى وجود المعجزة لصاحب الخير و في مقاصد الخير و للنفوس المتمحصة للخير والتحدى بها على دعوى النبوة و السحر انما يوجد لصاحب الشر في الغالب من التفريق بين الزوجين و ضرر الاعداء و امثال ذلك و للنفوس المتمحصة للشر هذا هو الفرق بينهما عند الحكماء الالهيين وقد يوجد لبعض المتصوفة و اصحاب الكرامات تاثير ايضا في احوال العالم و ليس معدودا من جنس السحر و انما هو بالامداد الالهى لان طريقهم و نحلتم من اثار النبوة و توابعها و لهم في

نزدیک تو معجزہ و سحر میں یہ فرق ہے اور کبھی بعض صوفیوں سے اور کرامت والوں سے عالم کے حالات میں تاثیر پائی جاتی ہے مگر اس کا شمار سحر کی جنس میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ تائید الہی سے ہوتا ہے کیوں کہ اُن کا طور طریق نبوت کے آثار اور توابع میں سے ہے اور تائید الہی میں۔ علی قدر مراتب اور خدا سے تقرب کے لحاظ سے اُن کو بھی حصہ ملا ہوا ہے اور جب اُن میں کا کوئی شخص افعال شر پر قادر ہوتا ہے تو اُس کو کر نہیں سکتا ہے کیوں کہ وہ اپنے کام میں پابند ہے اور اُس کو خدا کے حکم پر چھوڑ رکھا ہے اور جس میں خدا کا حکم نہیں ہوتا ہے اُس کو وہ کسی طرح نہیں کرتا اور اگر کسی نے کیا تو وہ راہ حق سے منحرف ہو گیا اور اکثر اُس کی کرامت مسلوب ہو جاتی ہے اور اُن کی معجزہ خدا کی مدد اور انی قوتوں کی وجہ سے ہوتا

الالہی حظ علی قدر حالہم وایمانہم وتمسکہم بکلمۃ اللہ واذ اقتدراحدمنہم علی افعال الشر فلا یاتییہا لانہ مستقید فیما یاتییہ ویذره للہ امر الالہی فمالا یقع لہم فیہ الاذن لا یاتونہ بوجہ ومن اتاہ منہم فقد عدل عن طریق الحق و ربما سلب حالہ ولما کانت المعجزۃ بامداد روح اللہ والقوی الالہیۃ فلذلک لا یعارضہا شی من السحر۔ (مقدمہ ابن خلدون۔ صفحہ ۱۹۴)

واما الفرق عندہم بین المعجزۃ والسحر فالذی ذکرہ المتکلمون انہ راجع الی التحدی و هو دعوی وقوعہا علی وفق ما ادعاه قالوا والساحر مصروف عن مثل هذا التحدی فلا یتبع منہ و وقوع المعجزۃ علی وفق دعوی الکاذب غیر۔ مقدرو لان دلالة المعجزۃ

علی الصدق عقلیة لان  
 صفة نفسها التصديق  
 فلو وقعت مع الکذب  
 لاستحال الصادق کاذبا وهو  
 محال فاذا لا تقع المعجزة  
 مع الکاذب بالاخلاق واما  
 الحكماء فالفرق بينهما  
 عندهم کما ذکرناه فرق  
 بین الخیر و الشر فی نہایت  
 الطرفین فالساحر لا یصدر  
 منه الخیر ولا یستعمل فی  
 اسباب الخیر وصاحب المعجزة  
 لا یصدر منه الشر ولا یستعمل  
 فی اسباب الشر وکأنهما علی طرفی  
 النقص فی اصل فطرتهما  
 (مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۴۲۰)  
 صفت ہے تو وہ اگر جھوٹ کے ساتھ واقع ہو تو سچی چیز جھوٹی  
 ٹھہر جائے۔ پس معجزہ مطلقاً جھوٹے سے نہیں سرزد ہو سکتا۔  
 لیکن حکما کے نزدیک تو جیسا ہم نے ذکر کیا معجزہ و سحر میں  
 خیر و شر کا فرق ہے اور وہ بھی انتہا کے کناروں کا۔ تو ساحر سے  
 اچھا کام نہیں ہوتا اور نہ وہ اس کو اچھے کام کے اسباب میں  
 صرف کرتا ہے اور صاحب معجزہ سے شر نہیں صادر ہوتا نہ وہ  
 اس کو اسباب شر میں استعمال کر سکتا ہے گویا وہ دونوں خلقت  
 ہی سے مخالفت کی اخیر سرحد پر ہیں۔

بو علی سینا نے معجزہ یا کرامات کی نسبت یہ لکھا ہے کہ۔  
 لا تستبعدن ان یکون

لبعض النفوس ملکہ  
 يتعدى تأثيرها بدنہا  
 او یکون لقوتہا کانہا  
 نفس ما للعالم وکما تاتر  
 بکیفیت مزاجیة یکون  
 قد اثرت لمبدأ جمیع ما  
 عددته اذ مبادیہا ہذہ  
 کیفیات لا سیما فی جرم  
 صارا ولی بد لمناسبة تخصه  
 مع بدنہ لا سیما و قد  
 علمت انه لم یس کل مسخن  
 بحارو لا کل مبرد بباردو  
 لا تستکرن ان یکون لبعض  
 انفسوس ہذہ القوۃ حتی  
 یفعل فی اجرام اخری یفعل  
 عنہا انفعال بدنہ و  
 لا یستکرن ان یتعدی من  
 قواہا الخاصة الی قوی  
 نفوس اخری یفعل فیہا  
 لا سیما اذا کانت شحذت  
 ملکتہا یقهر قواہا  
 البدنیۃ الی لہا فتقهر  
 شہوة او غضبا او خوفاسن  
 غیرہا - ہذہ القوۃ  
 ربما کانت للنفس یحسب

کہ بعض نفسوں کو ایسا ملکہ  
 ہو جس سے اُس کی تاثیر اُس کے  
 بدن تک پہنچے یا وہ اپنی قوت  
 کی وجہ سے گویا کہ عالم  
 کے لیے بمنزلہ نفس کے ہو اور  
 جیسا کہ وہ کیفیت مزاجیہ کی  
 وجہ سے اثر کرتی ہے تو وہ کسی  
 مبداء کی وجہ سے وہ سب پر اثر  
 کرے جن کو ہم نے گنایا ہے  
 کیوں کہ اُس کے مبادی بھی  
 کیفیتیں ہیں خصوصاً اس جرم  
 میں جس کے ساتھ وہ زیادہ مناسب  
 ہے بوجہ اُس مناسبت کے جو  
 کہ اُس کو اپنے بدن کے ساتھ ہے۔  
 بالخصوص جب تم یہ بات معلوم  
 کر چکے ہو کہ ہر مسخن گرم  
 نہیں ہے نہ ہر مبرد سرد ہے اور  
 اس بات کا انکار نہ کرو کہ  
 بعض نفسوں کو یہ قوت اس  
 درجہ تک ہو کہ دوسرے اجسام  
 میں اثر کرے اور وہ ایسا ہی  
 منفعل ہو جیسا کہ اُس نفس کا  
 بدن اور اس بات کا انکار نہ کرو  
 کہ وہ اپنی خاص قوت سے تجاوز  
 کر کے دوسرے نفسوں پر اثر

کرے خصوصاً جب کہ اس نے اپنے ملکہ کو قوائے بدنہ کے زیر کر لینے سے تیز کر لیا ہو۔ پس وہ دبا لیتا ہے شہوت کو یا غصہ کو یا دوسرے سے خوف کو۔ یہ قوت اکثر نفس کو اصلی سرشت کے اعتبار سے ہوتی ہے جو کہ اس کو ہیئت نفسانیہ سے پہنچتی ہے اور نفس شخصیت کے لیے بذاتہا ہوتی ہے اور کبھی کسی مزاج کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور کبھی کسی قسم کی کوشش کی وجہ سے ہوتی ہے جو کہ نفس کو نہایت تیزی کی وجہ سے مجرد بنا دیتی ہے جیسا کہ اولیا اور نیک لوگوں کو حاصل ہوتا ہے اور جس شخص کی سرشت میں یہ قوت ہو پھر وہ شخص نیک ہدایت یافتہ ہو اور اس کا نفس پاک ہو تو وہ نبی اور صاحب معجزہ ہوتا ہے یا ولی صاحب کرامت ہوتا ہے اور جب وہ نفس کا تزکیہ کرتا ہے تو اصل خلقت سے اور زیادہ ترقی کر جاتا ہے اور نہایت اونچے درجے تک پہنچ جاتا ہے اور جس کو یہ قوت ہے

المزاج الا ضلی لما یفیدہ من ہیئة نفسانیة تصیر للنفس الشخوصیة لتشخصها وقد تحصل لمزاج يحصل وقد يحصل بضرب من الکسب بجعل النفس کالمجردة لشدة الذکاء کما یحصل الاولیاء وللایرار۔ والذی یقع له هذا فی جبلة النفس ثم یکون خیر ارشیداً مرکباً لنفسه فهو ذو معجزة من الانبیاء او کرامة من الالیاء و تزیدہ تزکیة لنفسه من هذا المعنی زیادة علی مقتضی جبلة فیبلغ المبلغ الاقصی و الذی یقع له هذا ثم یکون شریراً و يستعمله فی الشر فهو الساحر الخبیث و قد یکسر قدر نفسه من غلوئه فی هذا المعنی فلا یلحق شیئاً من الازکیاء فیہ۔ (اشارات بوعلی سینا)۔



اور وہ شریعہ اور اس قوت کو برے کام میں صرف کرتا ہے تو وہ خبیث ساحر ہے اور کبھی وہ اس کام میں زیادہ غلو کرنے کی وجہ سے اپنے نفس کی قدر کو اور بھی گھٹا دیتا ہے تو وہ اچھوں کی کسی بات کو نہیں پہنچتا۔

ہم کو اس مقام پر اس بات سے بحث کرنی کہ معجزہ و سحر میں کیا فرق ہے اور انبیاء علیہم السلام سے جو اثر نفسی ظاہر ہوتے ہیں وہ کس مبدء سے ہوتے ہیں اور اولیاء اللہ سے کس کی تائید سے اور کفار و مشرکین یا خبیث انسانوں سے کس کی مدد سے کچھ ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اور جس سے ہوتا ہے وہ خود اُس کے اثر نفسی سے ہوتا ہے جو حسب فطرت انسانی خدا نے اُس میں اور کسی نہ کسی قدر تمام انسانوں میں رکھا ہے۔ پس اگر یہ سچ ہے تو ہم اُس کو نہ معجزہ قرار دے سکتے ہیں نہ سحر نہ کرامت اور نہ استدراج۔ جیسے کہ ہم انسان کے دوسرے قوی کے اثر کو بھی معجزہ یا سحر یا کرامت یا استدراج قرار نہیں دیتے۔

علاوہ اس کے جب کہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اکثر اُن اثرات کا ظہور ایسا ہی خیالی و وہمی ہے جیسے کہ خواب میں اُن چیزوں کا ظہور جن کو دیکھنے والا صرف خواب ہی میں دیکھتا ہے اور اُن کا وجود درحقیقت اور فی الواقع کچھ نہیں ہوتا تو ہم کو جرأت نہیں پڑتی کہ ایسی بے اصل چیزوں کو فخریہ طور پر انبیاء علیہم السلام کے معجزے اور اولیاء اللہ کی کرامتیں اور بے اعتقادی سے کافروں کا سحر اور استدراج قرار دیں۔

ہم کو اور اسلام کو تو فخر اس بات پر ہے کہ ہمارے برحق پیغمبر خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے پاس تو کوئی معجزہ و عجزہ نہیں ہے اگر ہوگا

تو خدا کے پاس ہوگا میں تو مثل تمہارے ایک آدمی ہوں خدا نے مجھ کو وحی کی ہے میں تم کو بری باتوں سے ڈراتا ہوں اور اچھی باتوں کی خوش خبری دیتا ہوں -

ہم کو اور اسلام کو تو اس سچے ہادی پر فخر ہے جس نے نہ لکڑی کو سانپ کر دکھایا اور نہ اپنے دست مبارک کو چمکایا نہ سچی بات پر کچھ پردہ ڈالا - نہ خدا کی قدرت کے قانون کو توڑنے کا دعویٰ کیا اور سیدھی طرح لوگوں کو سچا رستہ بتایا اور فخر اولین اور آخرین اور خاتم النبیین ہونے کا درجہ پایا - یا ایہا الذین امنوا صلوٰۃ علیہ وسلموا تسلیما -

سوم - بیان تخیل تحرک جبل و عصائے سحرۃ فرعون

چہارم - بیان عصائے موسیٰ علیہ السلام

پنجم - بیان ید بیضاء

یہ تینوں امر ایسے ہیں جن کا ایک شامل بیان کرنا مناسب ہے - اس مقام پر ہم ان تمام آیتوں سے بحث کریں گے جن میں ان امور سے گانہ کا ذکر ہے -

### ثعبان

اس میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ مصر میں جس قدر آن لوگوں کی کثرت تھی جو ساحر کہلاتے تھے اور جو جو کرشمے وہ لوگوں کو دکھاتے تھے اس سے حضرت موسیٰ بخوبی واقف تھے - جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کی ہمدردی اور اپنی قوم کو فرعون سے ظلم سے رہائی دینے پر مائل یا مامور ہوئے تو یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ان کو اس بات کا خیال ہوا ہوگا کہ وہاں تو بڑے بڑے کرشمے دکھانے والے ہیں میں ان پر کیوں کر غالب و مالتک بیمینک ساؤلہ گا - ان کو خدا نے بتایا

یا موسیٰ قال ہئی عصای اتو کوکؤ علیہا و اہش بہا  
 علی غفی ولی فیہا مارب  
 اخری قال القہا یا موسیٰ  
 فالقا ہا فا ذاہی حیة  
 تسعی۔ قال خذہا ولا تخف  
 منعید ہا سیرتہا الا ولی۔  
 واضمم یدک الی جناحک  
 تخرج بیضاء من غیر سوء  
 آیة اخری (۲۰)۔ سورہ طہ  
 آیت (۱۸ - ۲۳)۔  
 کہ تو بھی ویسے ہی کام کر سکتا  
 ہے۔ خدا نے پوچھا کہ تیرے  
 ہاتھ میں کیا ہے موسیٰ نے  
 کہا میری لاٹھی ہے جس کو  
 میں ٹیک لیتا ہوں اور اس سے  
 بھیڑوں کو ہنکاتا ہوں اور  
 میرے اور کام میں بھی آتی ہے۔  
 خدا نے کہا اے موسیٰ اس کو  
 ڈال تو دے۔ پھر جب موسیٰ  
 نے اس لاٹھی کو ڈال دیا تو  
 وہ یکایک اڑدھا تھی چلتی

ہوئی۔ خدا نے کہا اس کو اٹھا لے اور مت ڈر ہم اس کو پہلی  
 ہی سیرت پر پھر کر دیں گے اور اپنے ہاتھ کو بغل میں رکھ کر  
 نکال چٹا بے عیب یہ دوسری نشانی ہے۔

یہی مضمون سورہ نمل میں بھی آیا ہے خدا نے موسیٰ سے  
 والی عصاک فلما را  
 ہا تہتز کا نہا جان ولی  
 سدبرا و لم یعقب یا  
 موسیٰ لا تخف انی لا یخاف  
 لدی المرسلون۔ و ادخل  
 یدک فی جیبک تخرج  
 بیضاء من غیر سوء فی تسع  
 آیات الی فرعون و قومہ  
 انہم کانوا قوما فسقین  
 (۲۷)۔ سورہ نمل (۱۰ و ۱۲)۔  
 کہنا کہ اپنی لاٹھی ڈال دے۔  
 جب موسیٰ نے دیکھا کہ وہ  
 تو ہلتی ہے گویا وہ اڑدھا ہے  
 تو پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹے اور  
 پھر پلٹ کر رخ نہ کیا۔ خدا نے  
 کہا اے موسیٰ مت ڈر میرے  
 پاس پیغمبر ڈرا نہیں کرتے اور  
 اپنے ہاتھ کو اپنی جیب میں  
 ڈال کر نکال چٹا بے عیب۔  
 (بجا) نو نشانیاں لے کر فرعون اور  
 اس کی قوم کے پاس بے شک وہ قوم ہے نافرمان۔

سورہ قصص میں یہ فرمایا ہے کہ اپنی لاٹھی ڈال پھر جب  
وان الق عصاک فما راھا تھتز کانھا جان  
موسٰی نے دیکھا کہ وہ ہلتی ہے گویا کہ وہ اڑدھا ہے پیٹھ  
پھیر کر پیچھے ہٹے اور پھر پلٹ  
موسٰی اقبل ولا تخف انک من الامنین اسلک  
اے موسٰی آگے آ اور مت ڈر  
بے شک تو ہے امن والوں میں  
بیضاء من غیر سوء و اضمم  
اپنے ہاتھ کو اپنی جیب  
الیک جناحک من الرھب  
میں ڈال کر چٹا بے عیب نکال  
فذلک برھانان من ربک  
اور اپنے دونوں بازوؤں کو خوف  
الی فرعون و ملائئہ انھم  
سے ملا پس یہ دونوں دو برھان  
کانوا قوما فاسقین (۳۸ -  
ہیں تیرے رب کی طرف فرعون  
سورہ قصص - ۳۱ و ۳۲) -  
کے اور آس کے سرداروں کے  
بے شک وہ لوگ نافرمان تھے -

ان آیتوں پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کیفیت جو  
حضرت موسٰی پر طاری ہوئی اسی قوت نفس انسان کا ظہور تھا  
جس کا اثر خود آن پر ہوا تھا - یہ کوئی معجزہ مافوق الفطرت نہ  
تھا اور نہ اس پہاڑ کی تلی میں جہاں یہ امر واقع ہوا کسی معجزہ  
کے دکھانے کا موقع تھا اور نہ یہ تصور ہو سکتا ہے کہ وہ پہاڑ کی  
تلی کوئی مکتب تھا جہاں پیغمبروں کو معجزے سکھائے جاتے  
ہوں اور معجزوں کی مشق کرائی جاتی ہو - حضرت موسٰی میں  
ازروے فطرت و جبلت کے وہ قوت نہایت قوی تھی جس سے اس  
قسم کے اثر ظاہر ہوتے ہیں - انہوں نے اس خیال سے کہ وہ  
لکڑی سانپ ہے اپنی لاٹھی پھینکی اور وہ آن کو سانپ یا اڑدھا  
دکھائی دی - یہ خود آن کا تصرف اپنے خیال میں تھا وہ لکڑی لکڑی

ہی تھی اُس میں فی الواقع کچھ تبدیلی نہیں ہوئی تھی - خدا تعالیٰ نے کسی جگہ یہ نہیں فرمایا کہ فانقلب العصا ثعبانا - یعنی وہ لائھی بدل کر اڑدھا ہوگئی بلکہ سورہ نمل میں فرمایا - کانھا جان - یعنی گویا وہ اڑدھا ہے - اس سے ظاہر ہے کہ درحقیقت وہ اڑدھا نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ لائھی کی لائھی ہی تھی - اس کے بعد جب حضرت موسیٰ فرعون کے پاس گئے تو فالقے عصا فاذا ہی فرعون نے کہا کہ اگر تم سچے ثعبان مبین (۷) - سورہ اعراف - ہو تو کوئی کرشمہ دکھاؤ - (۱۰۴) (۲۶ - سورہ شعرا - ۳۱) - حضرت موسیٰ نے اپنی لائھی کو اُس کے آگے ڈال دیا پھر وہ یکایک اڑدھا ظاہر ہوئی -

صاحب تفسیر کبیر نے باوجود کہ نہایت بے سرو پا قصے اعلم ان قولہ و لئو ان واقعات کی نسبت لکھے ہیں جئ تک بشئی مبین مگر اُن کے ساتھ یہ بھی لکھ بدل علی ان الله تعالیٰ قبل دیا ہے کہ وہ لائھی دیکھنے ان القی العصا عرفه بانہ والوں کو اڑدھا معلوم ہوئی نہ یہ کہ درحقیقت وہ اڑدھا ہو گئی یصیرھا ثعبانا و لو لا ذالک لما قال ما قال فلما القی عصاه ظہر ما وعد الله به فصار ثعبانا مبینا و المراد انہ مبین لناظرین انہ ثعبان بحر کاتہ وسائر العلامات (تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۵۲) - تو یہ کہنا اس بات پر دلیل ہے کہ لائھی کے ڈالنے سے پہلے خدا نے حضرت موسیٰ کو بتلا دیا تھا کہ وہ اڑدھا ہو جائے گی - کیوں کہ اگر یہ نہ ہوتا تو جو

بات حضرت موسیٰ نے کہی وہ نہ کہتے - پھر جب حضرت موسیٰ نے لٹھی پھینکی تو وہ چیز ظاہر ہوئی جس کا وعدہ اللہ نے کیا تھا پھر لٹھی علانیہ اڑدھا ہو گئی اور علانیہ اڑدہ ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ لٹھی دیکھنے والوں کو ہلنے سے اور اور تمام نشانیوں سے اڑدھا معلوم ہوئی -

اس کے بعد وہ واقعہ ہے جو حضرت موسیٰ اور سحرہ فرعون میں واقع ہوا اور جس کا ذکر ذکر مندرجہ حاشیہ آیتوں میں ہے آن آیتوں کا مضمون یہ ہے کہ جب فرعون کے ساحر جمع ہو گئے تو انہوں نے کہا اے موسیٰ یا تو تم ڈالو نہیں تو ہم پہلے ڈالتے ہیں - موسیٰ نے کہا کہ تم ہی ڈالو - پھر جب انہوں نے اپنی رسیاں اور لٹھیاں ڈالیں لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور آن کو ڈرا دیا اور ایک بڑا جادو کیا اور فرعون کی جڑے پکاری کہ ہم بے شک موسیٰ پر غالب ہوئے پس یکایک ان کی رسیاں اور لٹھیاں موسیٰ کے خیال میں ان کے جادو کے سبب سے معلوم ہوئیں کہ وہ چلتی ہیں - پھر موسیٰ کے دل میں

فلما جاء السحرة قال لهم موسیٰ القواما انتم ملقون فلما القوا قال موسیٰ ما جئتم بالسحر ان الله سیبطله ان الله لا یصلح عمل المفسدین (سورہ یونس آیت ۸۰ و ۸۱) -

قال لهم موسیٰ القواما انتم ملقون فالقوا حبالهم وعصیمهم و قالوا بعزة فرعون انا لنحن الغائبون فالتقى موسیٰ عصاء فاذا هی تلقف ما یافکون -

(سورہ شعرا آیت ۴۲ و ۴۳) -

قالوا یا موسیٰ اما ان تلقی واما نکون نحن الملقین قال القوا فلما القوا سحروا اعین الناس و استرهبوهم

و جاؤ ابسحر عظیم و اوحیٰ مینا الٰہی موسیٰ ان الق عصاک فاذا ہی تلقف ما یا فکون۔ (سورہ اعراف آیت ۱۱۰-۱۱۳)۔

قالو ای موسیٰ اما ان تلقی و اما ان نکون اول من القی قال بل القوا فاذ احبالہم و عصیہم یخیل الیہ من سحرہم انہا تسعی فاو حبس فی نفسہ خیفۃ موسیٰ قبلنا لا تخف انک انت الاعلیٰ والقد ما فی یمینک تلقف ما صنعوا انما صنعوا کید ما حر و لا یفیلح الساحر حیث اقی۔ (سورہ طہ آیت ۶۷-۷۲)۔

ڈر سا پیدا ہوا۔ ہم نے کہا کہ تو ست ڈر تو ہی آن پر غالب ہے۔ موسیٰ۔ فرعون کے ساحروں سے کہا کہ جو کرشمہ تم نے کیا وہ جادو ہے اللہ تعالیٰ ابھی اس کو مٹا دے گا بے شک اللہ مفسدوں کے کام کو نہیں سنوارتا۔ خدا موسیٰ سے کہا کہ ڈال دے جو تیرے دائیں ہاتھ میں ہے نگل جاوے گا جو کچھ آنہوں نے کیا ہے جو کچھ آنہوں نے کیا ہے جادو گروں کا مکر ہے اور جادو گر کو جہاں جاوے فلاح نہیں ہے پس موسیٰ نے اپنی لائھی ڈال دی پھر یکایک وہ سب کو نگلنے لگی۔

سورہ اعراف کی آیت میں جس پر باقی آیتیں محمول ہیں (لا نہا یفسر بعضہا بعضا) ایک جملہ آیا ہے کہ سحر و اعیان الناس یعنی لوگوں کو ڈھٹ بندی کر دی پس یہ جملہ صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ درحقیقت وہ لائھیاں یا رسیاں سانپ اور اژدھے نہیں ہو گئی تھیں بلکہ بہ سبب تاثیر قوت نفس انسانی کے جو ساحروں نے کسب سے حاصل کی تھیں وہ رسیاں اور لائھیاں لوگوں کو سانپ اور اژدھے معلوم ہوتی تھیں۔

حضرت موسیٰ نے جو کچھ کیا وہ بمقتضائے قوت نفس تھا انسانی کو، امر مافوق الفطرت نہ تھا مگر وہ قوت حضرت موسیٰ میں اور فطری جبلی تھی۔

اس امر کو علمائے متقدمین نے بھی تسلیم کیا ہے چنانچہ  
 ثم قال تعالیٰ فلم یأمنوا تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ  
 سحرُوا اعین الناس واحتج خدا تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے  
 به القائلون بان السحر محض کہ جب سحرہ فرعون نے اپنی  
 التمیویۃ قال القاضی لوکان رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں تو  
 انسحر حقاً لکانوا قد سحرُوا آنہوں نے لوگوں کی آنکھوں  
 قلوبہم لا اعینہم فثبت پر جادو کیا تو جادو کے لفظ  
 ان المراد انہم تخیلوا احوالا پر لوگوں نے دلیل پکڑی ہے  
 عجیبۃ مع ان الامر فی کہ سحر صرف دھوکا ہے۔ قاضی  
 الحقیقۃ ما کان علی وفق کا قول ہے کہ اگر جادو برحق  
 ما خیلوہ۔ ہوتا تو وہ لوگوں کے دلوں پر  
 (تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۶۸۲) جادو کرتے نہ کہ ان کی آنکھوں

سورہ اعراف)۔ پر۔ پس ثابت ہوا کہ اس سے

مراد یہ ہے کہ آنہوں نے لوگوں کے خیال میں عجیب باتیں ڈالی  
 تھیں با اینہم حقیقت میں وہ باتیں ایسی نہ تھیں جیسی کہ لوگوں  
 کے خیال میں پڑی تھیں۔ یعنی وہ لاٹھیاں اور رسیاں در حقیقت  
 سانپ اور اژدھے نہیں بنی تھیں بلکہ صرف لوگوں کے خیال میں  
 ایسی معلوم ہوتی تھیں اور یہ بات اسی تاثیر قوت نفس انسانی  
 کے سبب تھی جو ساحروں میں بذریعہ کسب اور موسیٰ میں  
 بحسب فطرت تھی مگر حقیقت میں نہ ساحروں کی رسیاں اور لاٹھیاں  
 سانپ اور اژدھا بنی تھیں اور نہ حضرت موسیٰ کی۔



## ید بیضا

جب کہ یہ بات تسلیم کی گئی کہ انسان میں ایک ایسی قوت ہے کہ انسان اس کے ذریعہ سے قوائے متخیلہ کی طرف توجہ کرتا ہے اور پھر اس میں ایک خاص قسم کا تصرف کرتا ہے اور ان میں طرح طرح کے خیالات اور گفتگو اور صورتیں جو کچھ اس کو مقصود ہوتی ہیں ڈالتا ہے پھر ان کو اپنے نفس مؤثرہ کی قوت سے دیکھنے والوں کی حس پر ڈالتا ہے۔ پھر دیکھنے والے ایسا ہی دیکھتے ہیں کہ گویا وہ خارج میں موجود ہے حالانکہ وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور قرآن مجید کے الفاظ سے جو آیات مذکورہ بالا میں گزرے ہیں اور جن سے پایا جاتا ہے کہ لاٹھیاں اور رسیاں اسی قوت متخیلہ کے سبب سانپ یا اژدھ دکھائی دیتی تھیں تو ید بیضا کا مسئلہ از خود حل ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کا بھی لوگوں کو اس طرح پر دکھائی دینا اسی قوت نفس انسانی اور تصرف قوت متخیلہ کا سبب تھا نہ یہ کہ وہ کوئی معجزہ مافوق الفطرت تھا۔ اور درحقیقت حضرت موسیٰ کے ہاتھ کی ماہیت بدل جاتی تھی۔ جہاں قرآن مجید میں ید بیضا کا ذکر آیا ہے وہاں یہ مضمون بھی موجود ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے اپنا ہاتھ و نزع یدہ فاذا ہی بیضاء نکالا تو وہ یکایک چٹا تھا دیکھنے والوں کے لیے۔ اور یہ مضمون (سورہ اعراف و سورہ شعراء) صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہ (۱۰۵، ۳۲) میں وہ چٹا دکھائی دیتا تھا جو اثر قوت نفس انسانی کا تھا نہ کوئی معجزہ مافوق الفطرت۔

اس مقام پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر عصائے موسیٰ کا اژدھا بننا اور ہاتھ کا چٹا ہو جانا اسی قسم کی قوت نفسی سے

لوگوں کو دکھائی دیتا تھا جس طرح کی قوت نفسی سے سحرہ فرعون کی رسیاں ولاٹھیاں سانپ دکھلائی دیتی تھیں اور کوئی معجزہ مافوق الفطرت نہ تھا تو خدا نے عصا و ید بیضا کی نسبت یہ کیوں فرمایا کہ ”فذا نک برهان من ربک“ یعنی اُن کو خدا کی طرف سے برهان کیوں تعبیر کیا ہے۔ مگر برهان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عصائے موسیٰ کا اڑدھا مرئی ہونا یا ہاتھ کا چٹا دکھائی دینا فرعون اور اُس کے سرداروں پر بطور حجت الزامی کے تھا وہ اس قسم کے امور کو دلیل اس بات کی سمجھتے تھے کہ جس شخص سے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں وہ کامل ہوتا ہے اور اسی لیے اُنہوں نے حضرت موسیٰ سے بھی کرشمہ دکھلانے کی خواہش کی تھی۔ پس اُن دونوں چیزوں پر بمقابلہ فرعون اور اُس کے سرداروں کے برهان سے تعبیر کرنا بالکل صحیح تھا اور اسی سبب سے اُنہوں نے کہا کہ اگر کوئی کرشمہ دکھلایا جاوے گا تو وہ موسیٰ کو سچا جانیں گے۔ خود اسی آیت میں بمقابل فرعون اوز اُس کے سرداروں کے اُن دونوں امر کو برهان قرار دینے کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ ”انہم کانوا قومًا فاسقین“ فاسق کا لفظ نہایت وسیع معنی رکھتا ہے۔ فرعون اور اُس کے سرداروں کا ساحروں پر بہ سبب اُن کے کرشموں کے اعتقاد رکھنا بھی فسق میں داخل تھا پس خدا نے فرمایا کہ یہ دونوں امر ایسی قوم کے لیے جو ساحروں کے کرشموں پر یقین رکھتے ہیں خدا کی طرف سے برهان ہیں۔ پس برهان کا لفظ اُن بیانات کے متافی نہیں ہے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔

سورہ نمل میں خدا تعالیٰ نے عصا کے ذکر کے بعد فرمایا کہ ”و ادخل یدک فی جیبک تخرج بیضاء من غیر سوء فی تسع ایات الی فرعون و اقومہ“ لفظ تسع ایات پر مفسرین نے بحث کی ہے کہ نو نشانیوں سے کیا مراد ہے۔

امام فخر الدین رازی نے اس آیت کی تفسیر میں عصا اور  
لقائل ان یقول کانت  
الایات احدی عشر ثنتان  
منها الید و العضا و  
التسع القلق و الطوفان  
والجرد والقمل والضفادع  
والدم والطمسۃ و الجذب  
فی بوادیهم و النقعان فی  
مزارعهم -  
(تفسیر کبیر، جلد پنجم، صفحہ

(۸۱) -

اور اسی مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ ”فی تسع آیات“  
جملہ مستانفہ ہے یعنی علیحدہ کلام ہے اور اُس کی تقریر یوں ہے کہ  
”اذہب فی تسع آیات الیٰ فرعون“ یعنی عصا اور ید بیضا کا  
ذکر علیحدہ ہو چکا اُس کے سوا نو نشانیاں اور دیں کہ وہ لے کر  
فرعون کے پاس جا -

مگر یہ بیان صحیح نہیں اس لیے کہ وہ نو چیزیں جن کا ذکر  
کیا ہے بطور نشانی کے نہیں دی گئی تھیں بلکہ فرعون اور اُس کی  
قوم پر بہ سبب نافرمانی کے بطور عذاب کے نازل ہوئی تھیں جن کو  
قرآن مجید نے بھی ”رجز“ سے تعبیر کیا ہے پس اُن واقعات کو  
تسع آیات قرار دینا صحیح نہیں ہو سکتا -

سورہ بنی اسرائیل میں بھی تسع آیات کا ذکر ہے اور اُس کی  
ولقد آتینا موسیٰ  
تسع آیات بیّنات فاستل  
بنی اسرائیل اذا جاءهم  
نسبت مفسرین نے یہ سمجھا ہے  
کہ اُس آیت میں تسع آیات سے  
وہ نو احکام مراد ہیں جو حضرت

فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَا ظَنِّکَ  
یا موسیٰ مَسْحُورًا قَالَ لَقَدْ  
عَلِمْتُ مَا اَنْتَ لِهٰؤُلَاءِ الْاَرَبِ  
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بِصٰئِرٍ وَاِنِّیْ  
لَا ظَنِّکَ یَا فِرْعَوْنُ مَشْبُورًا  
(سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۰۳)۔  
فرمایا کہ بنی اسرائیل سے  
دریافت کر جب موسیٰ اُن کے پاس آئے تو وہ نو احکام بتائے تھے۔  
اس خیال پر ہمارے راویوں نے ایک حدیث بھی بیان کر دی اور  
مفسرین نے قبول کر لی اور کہا کہ یہی قول سب سے اچھا ہے۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ تسع آیات کے بیان میں متعدد  
اقوال ہیں سب سے اچھا قول یہ  
ہے کہ جو صفوان ابن عسال نے  
کہا ہے کہ ایک یہودی نے  
اپنے دوست سے کہا کہ پیغمبر کے  
پاس چلو اُن سے پوچھیں کہ وہ  
نو احکام کیا تھے۔ وہ آئے اور  
پوچھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
نے فرمایا کہ وہ یہ تھے۔ خدا  
کے ساتھ کسی کو شریک مت  
کرو۔ چوری نہ کرو۔ زنا نہ  
کرو۔ قتل مت کرو۔ سحر مت  
کرو۔ سود نہ کھاؤ۔ عورتوں  
پر زنا کا اتہام مت کرو۔ لڑائی  
میں بھاگو نہیں اور بالتخصیص  
یہودیوں کے لیے یہ حکم ہیں

فی تفسیر قولہ تعالیٰ  
آیات بینات اقوال اجودھا  
ماروی صفوان ابن عسال  
انہ قال ان یہود یا قال  
لصاحبہ اذهب بنا الی  
هذا النبی نسالہ عن تسع  
آیات فذہبا الی النبی  
صلی اللہ علیہ وسلم و سالہ  
عنہا فقال ہن ان لا تشرکوا  
باللہ شیئا ولا تسرقوا۔ و  
لا تزنا۔ ولا تقتلوا۔ ولا  
تسحرنا۔ ولا تاكلوا الربا۔  
ولا تقذ فوالمحصنة ولا  
تولوا الفرار۔ یوم الزحف۔  
علیکم خاصۃ الیہودان

لا تعتدوا فی السبت فقام الیہودیون فقبلایہ و رجلیہ وقالوا اشہد انک نبی ولو لا نخاف القتل لا تبعنناک - (تفسیر کبیر جلد چہارم ، صفحہ ۲۸۵) گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ نبی ہیں اگر ہم کو مارے جانے کا ڈر نہ ہوتا تو ہم آپ کی پیروی کرتے -

مگر مفسرین کا یہ خیال کہ جن تسع آیات کا ذکر سورہ نمل کی آیت میں ہے وہ تو نو نشانیاں تھیں جو حضرت موسیٰ فرعون کے پاس لے گئے تھے اور جن تسع آیات کا ذکر سورہ بنی اسرائیل میں ہے وہ نو احکام بنی اسرائیل کے لیے تھے صحیح نہیں معلوم ہوتا - کیوں کہ اسی آیت میں ذکر ہے کہ تسع آیات کے جواب میں فرعون نے کہا کہ اے موسیٰ میں تو تجھ کو سحر زدہ سمجھتا ہوں اور اس سے ثابت ہے کہ وہ احکام فرعون اور اس کی قوم کے لیے تھے نہ بنی اسرائیل کے لیے اور ”فاسئل بنی اسرائیل اذ جاء ہم“ بطور جملہ معترضہ کے آیا ہے اس سے یہ استدلال کرنا کہ وہ احکام بنی اسرائیل کے لیے تھے صحیح نہیں ہے -

غرض کہ ہماری تحقیق میں دونوں آیتوں میں تسع آیات سے وہ احکام مراد ہیں جو حضرت موسیٰ فرعون اور اس کی قوم کے پاس لے گئے تھے - یہ بات قابل تسلیم کے ہے کہ قرآن مجید میں ان نو احکام کا ایک جگہ شمار نہیں کیا گیا ہے بلکہ جا بجا متعدد احکام کا ذکر آیا ہے اگر ان سب پر غور کیا جاوے تو وہ احکام ہماری سمجھ میں مندرجہ ذیل معلوم ہوتے ہیں -

۱- توحید - کہ قال اللہ تعالیٰ انی انا اللہ لا الہ الا انا -

- ۲۔ اقرار بالرسالة - کہا قال انا رسولا ربک -
- ۳۔ منع شرک سے - کہا قال فاعبدنی -
- ۴۔ اقامت صلوة - کہا قال اقم الصلوة لذكری -
- ۵۔ جزا و سزا - کہا قال تجزی کل نفس بما تسعی -
- ۶۔ اعتقاد آخرت - کہا قال ان الساعة آتیة -
- ۷۔ نزول عذاب منکرین پر - کہا ان العذاب علی من کذب و تولی -
- ۸۔ منع تعدی سے بنی اسرائیل پر - کہا قال لا تعذبهم -
- ۹۔ رہا کرنا بنی اسرائیل کا - کہا قال - ارسل معنا بنی اسرائیل -

یہ تمام آیتیں جن کا اشارہ ہم نے کیا عام آیتیں نہیں ہیں بلکہ خاص آیتیں ہیں جو حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے قصہ میں وارد ہوئی ہیں اور اسی سبب سے ہم نے خیال کیا ہے کہ یہ وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ خدا کی طرف سے فرعون کے پاس لے گئے تھے -

### ششم قتل اولاد

بنی اسرائیل کے لڑکوں یا مردوں کا قتل کوئی ایسا امر نہیں و اذ نجینا کم من آل فرعون یسومونکم سوء العذاب بذبحون ابناءکم و یستحیون نساءکم و فی ذالکم بلاء من ربکم عظیم - ۲۔ سورہ بقرہ - ۴۶ -

کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کو

برباد کر دے گا۔ پس اُس تاریخ میں جو کاهنوں نے مقرر کی تھی جس قدر لڑکے پیدا ہوئے اُن کو فرعون نے مروا ڈالا۔ اور بعضوں نے یہ کہا کہ یہ قتل صرف اُس تاریخ پر منحصر نہیں رہا بلکہ یہ قتل برسوں تک جاری رہا اور نوے ہزار لڑکے قتل ہوئے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ آئی اور اُس آگ نے مصر کو گھیر لیا اور تمام قبطیوں کو جلا دیا اور صرف بنی اسرائیل بچ رہے۔ لوگوں نے اُس کی تعبیر دی کہ اُس شہر سے جہاں سے بنی اسرائیل آئے ہیں ایک شخص آوے گا اُس کے ہاتھ سے مصر کی سلطنت برباد ہوگی اس پر فرعون نے بنی اسرائیل کے مردوں کے قتل کرنے کا حکم دیا۔

مگر قرآن مجید میں ان دونوں باتوں میں سے کسی کا کچھ اشارہ نہیں ہے اور نہ بنی

سوء العذاب يقتلون أبناءکم و يستحيون نساءکم و فی ذالکم بلاء من ربکم عظیم۔

(۷۔ سورہ عراف - ۱۳۷)

اذ قال موسى لقومه اذكروا نعمة الله عليكم اذ انجاكم من آل فرعون يسومونكم سوء العذاب و يذبحون أبناءكم و يستحيون نساءكم و فی ذالکم بلاء من ربکم عظیم۔

(۱۴۔ سورہ ابراہیم - ۶)

ان فرعون علا فی الارض و جعل اهلها شیعا يستضعف طائفة منهم یذبحون ابناءهم و يستحيون نساءهم انه کان من المفسدين۔ و زیدان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلهم ائمة و نجعلهم الوارثین۔ و نمکن لهم فی الارض و نری فرعون و هامان و جنودهما منهم ما کانوا یحذرون۔

(۲۸۔ سورہ قصص ۳ - ۵)

اسرائیل کے قتل کی بنا کسی  
اور کرشمہ پر بیان ہوئی ہے۔  
قرآن مجید میں جو بات پائی جاتی  
ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ  
بنی اسرائیل کی کثرت سے فرعون  
اور اس کے سرداروں کو اندیشہ  
ہو گیا تھا کہ یہ لوگ فساد  
کر کے مصر کی سلطنت کو برباد  
کر دیں گے اور اس کے انسداد  
فی الارض الفساد۔

(۴۔ سورہ مومن - ۲۶ و ۲۷) کے لیے یہ تدبیر کی تھی کہ جو  
لڑکے پیدا ہوتے تھے ان کو قتل کروا ڈالتا تھا تاکہ مرد جن سے  
لڑنے کا اور فساد ہونے کا اندیشہ تھا زیادہ نہ ہونے پاویں۔  
چنانچہ سورہ قصص میں صاف لکھا ہے کہ فرعون کی سلطنت ملک  
میں بہت زبردست ہو گئی تھی اور اس کے لوگوں کو گروہ گروہ کر دیا  
تھا اور ایک گروہ کو یعنی بنی اسرائیل کو ان میں سے ضعیف  
کر دیا تھا ان کے لڑکوں کو مار ڈالتا تھا اور عورتوں کو زندہ  
رکھتا تھا خدا نے چاہا کہ اس ضعیف گروہ پر مہربانی کرے اور  
انہیں کو سردار بنا دے اور انہیں کو وارث کرے اور ملک میں  
انہیں کو قدرت دے اور دکھلا دے فرعون اور اس کے لشکر کو  
اس ضعیف گروہ سے وہ چیز جس سے وہ ڈرتے تھے۔ اس سے صاف  
ثابت ہوتا ہے کہ پہلی دفعہ یعنی قبل از ولادت حضرت موسیٰ جو  
فرعون نے قتل اولاد بنی اسرائیل کا حکم دیا تھا وہ صرف اس  
خوف سے تھا کہ وہ بہ سبب انہیں ہونے کے فساد کر کے ملک کو  
نہ چھین لیں۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ قتل کسی مدت تک رہا ہو  
اور پھر موقوف ہو گیا ہو۔



یہ پہلا حکم قتل اولاد بنی اسرائیل کا تھا مگر جب حضرت موسیٰ فرعون کے پاس آئے اور خدا کے حکم پہنچائے اور کہا کہ بنی اسرائیل کو چھوڑ دو آس وقت پر فرعون کو بنی اسرائیل کے فساد کرنے کا اور اپنی سلطنت کے زوال کا خوف ہوا اور دوبارہ آس نے تدبیر کی کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو مار ڈالنا چاہیے۔ چنانچہ سورہ مومن میں خدا نے صاف بیان کیا ہے کہ جب ہمارے پاس سے سچی بات فرعون اور آس کے سرداروں کے پاس پہنچی تو انہوں نے کہا کہ مار ڈالو ان کے لڑکوں کو جو موسیٰ پر ایمان لائے ہیں اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھو اور فرعون نے کہا کہ ٹھہرو میں موسیٰ کو مار ڈالوں گا مجھ کو خوف ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے گا اور ملک میں فساد پھیلا دے گا۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اسی خوف سے دونوں دفعہ فرعون نے بنی اسرائیل کے لڑکوں یا مردوں کے قتل کا حکم دیا تھا کوئی اور غیبی کرشمہ آس کی بنیاد نہ تھا۔

ہفتم قحط ، ہشتم طوفان ، وجراد ، وقمل و صفادع ،

ودم

یہ تمام امور ایسے ہیں جو ہمیشہ دنیا میں موافق قانون قدرت واقع ہوتے رہتے ہیں حضرت موسیٰ کے زمانہ میں بھی واقع ہوئے تھے۔ ایسے واقعات کو انسانوں کے گناہوں سے منسوب کرنا بھی قانون فطرت کے تابع ہے جس پر انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے ہیں اس کی بحث قوم عاد کے قصہ میں بالتفصیل لکھ چکے ہیں اس طرح ان واقعات ارضی و سماوی کو بھلی خدا تعالیٰ نے فرعون اور آس کی قوم کے گناہوں سے منسوب کیا ہے۔

قحط کوئی نئی بات نہیں تھی حضرت یوسف کے زمانے میں بھی سخت قحط پڑا تھا حضرت موسیٰ کے زمانہ میں بھی قحط ہوا

جو حضرت موسیٰ کے قصہ میں مذکور ہے -

طوفان - دریائے نیل کی زیادہ طغیانی سے ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی مینہ اور اولونکا طوفان بھی آ جاتا ہے شام کے پہاڑوں سے اولے برستے ہوئے کبھی کبھی مصر تک پہنچ جاتے ہیں بجلی کی چمک اور گرج بھی ہوتی ہے (دیکھو کیٹوکی بیپکل سیکلوپیڈیا ، صفحہ ۶۰۰) جن ملکوں میں بارش قلیل ہوتی ہے اور اولے اتفاقیہ پڑتے ہیں ان ملکوں میں اس قدر بارش بھی جو اور ملکوں میں معمولی خیال کی جاتی ہے نہایت سخت طوفان کا اثر دکھاتی ہے خصوصاً اُس حالت میں جب کہ دریا کی طغیانی بھی اور خصوصاً نیل جیسے دریا کی طغیانی اُس کے ساتھ ہو تو پھر قیامت ہی ہوتی ہے - پس موسیٰ کے عہد میں طوفان کا واقعہ ایک معمولی واقعہ سے زیادہ کچھ نہیں تھا - جو بزرگی اُس میں تھی وہ صرف یہی تھی کہ اُس زمانہ میں واقع ہوا جب کہ حضرت موسیٰ وہاں تشریف لے گئے تھے -

جراد و قمل و ضفادع - یعنی ٹڈیوں پسوؤں یا اسی قسم کے کسی جانوروں اور مینڈکوں کا کثرت سے پیدا ہو جانا خصوصاً طوفان اور دریائے نیل کے چڑھاؤ کے اترنے کے بعد ایک ایسی بات ہے جو قدرتی طور پر واقع ہوتی ہے حشرات الارض دفعۃً اس کثرت سے پیدا ہو جاتے ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے - پس حضرت موسیٰ کے عہد میں اُن حشرات الارض کا پیدا ہو جانا جس قدر کثرت سے وہ پیدا ہو گئے ہوں اور کیسی ہی سخت مصیبت اُن کے سبب سے مصریوں پر پڑی ہو کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں ہے جس کو ایک لمحہ کے لیے بھی واقعہ ما فوق الفطرت تصور کیا جاوے -

دم کا لفظ البتہ لوگوں کو حیرت میں ڈالتا ہوگا - بعض مفسرین نے اس بات کو کہ تمام دریا اور حوض اور تمام پانی جو

برتنوں میں تھا خون ہو گیا غیر قابل یقین خیال کر کے یہ لکھا کہ فرعون اور اس کی تمام قوم کو نکسیر بہنے یعنی ناک سے خون جاری ہونے کی بیماری ہو گئی تھی۔ گو کہ کسی وباء کا پھیل جانا خصوصاً قحط و طوفان کے بعد کوئی امر بعید از عقل نہیں ہے۔ لیکن اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ دریاؤں نیل کا پانی اگرچہ عموماً نیلے رنگ کا رہتا ہے مگر کبھی طغیانی کے زمانہ میں اس کا رنگ سرخ لال اینٹ کے گہرے رنگ کی مانند ہو جاتا ہے (دیکھو کیٹو بیکل سیکلوپیڈیا صفحہ ۵۹۹) اور (جیمبرز انسیکلوپیڈیا جلد سوم، صفحہ ۷۸۶) اور جب کبھی بقیاتی مادہ کثرت سے آ جاتا ہے تو سبز ہو جاتا ہے (دیکھو انسیکلوپیڈیا برطانیکا، صفحہ ۴۲۲) پس اسی قسم کے واقعات کے سبب سے اس کا پانی سرخ ہو گیا جس کو دم سے تعبیر کیا ہے۔

بعض اوقات پانی میں نہایت باریک کیڑے سرخ رنگ کے اس قدر کثرت سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ تمام پانی کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے بحر احمر میں بھی اس قسم کی حالت پائی جاتی ہے۔ بحر احمر کے حال میں سالٹ نے لکھا ہے کہ فروری کے مہینہ میں ایک دفعہ جہاز کے گرد کچھ دور تک سمندر نہایت سرخ ہو گیا چون کہ اس عجیب تبدیلی کا باعث ہم دریافت کرنا چاہتے تھے ہم نے ایک برتن کو پانی میں ڈالا اور اس میں بہت سی وہ چیزیں نکالیں جو پانی پر تیر رہی تھیں وہ جیلی کے مشابہ ایک چیز تھی جس میں بے انتہا چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے اور ہر ایک کے اوپر ایک سرخ دھبہ تھا یہ جانور ایک جگہ جمع ہونے سے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے پانی میں کوئی سرخ چیز گھول دی ہو۔ ارن برگ کو بھی جو ایک بہت بڑا نیچرل فلاسفی کا عالم تھا ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا اور اس نے بھی بحر احمر کی ایسی حالت ہو جانے کی

تصدیق کی ہے -

پس یہی حالت دریائے نیل کی بھی ہوگی اور جب کہ ثابت ہوا ہے کہ آس کا پانی بھی کبھی سرخ ہو جاتا ہے تو آس کی ایسی حالت ہو جانے پر زیادہ یقین ہوتا ہے - ان کیڑوں کا بہت کثرت سے پانی میں جمع ہو جانا بلا شبہ لوگوں کو استعمال سے باز رکھتا ہوگا اور وہ پانی ناقابل استعمال ہو جاتا ہوگا - فرعون کے زمانہ میں بھی دریائے نیل سے گھروں میں اور کنوؤں اور حوضوں میں نلوں کے ذریعہ سے پانی لے گئے تھے پس جہاں جہاں آس کا پانی جانا ہوگا سب جگہ یہی حال ہو گیا ہوگا - آس پانی کو لوگوں نے بلا خیال برتنوں میں بھر لیا ہوگا اور تھوڑی دیر بعد دیکھا ہوگا کہ وہ سرخ مثل خون کے ہے - اونچے مقاموں میں جہاں دریائے نیل کا پانی نہ جاتا ہوگا وہاں یہ کیفیت نہ ہوئی ہوگی اور ممکن ہے کہ بنی اسرائیل اونچی زمین پر رہتے ہوں جہاں نیل کا پانی نہ جاتا ہو یا ان کے گھروں میں پانی جانے کے نل نہ ہوں اور ان کے گھروں میں یہ کیفیت نہ ہوئی ہو -

### نہم - غرق فی البحر

فرعون کا بنی اسرائیل کے تعاقب میں جانا اور بنی اسرائیل کا دریا کے پار آکر جانا اور فرعون کا دریا میں ڈوب جانا ایک تاریخی واقعہ ہے اور ہم اس کو نہایت تفصیل سے ایک دوسرے مضمون میں بیان کریں گے -

### دہم - اعتکاف حضرت موسیٰ کا پہاڑ میں

اعتکاف کا واقعہ آس زمانہ کا ہے جب کہ حضرت موسیٰ وواعدنا موسیٰ ثلاثین بنی اسرائیل کو فرعون کی قید لیلۃ واطمننہا بسیم فتم سے چھوڑا کر اور فرعون کو

مہینات ربہ اربعین لیلۃ - اور اُس کے لشکر کو دریا میں  
(۷- سورہ اعراف - ۱۳۸) ڈبو کر اُس جنگل میں نکال لائے  
جو بحر احمر کی دونوں شاخوں کے درمیان میں ہے اور جس کا نقشہ  
ہم پہلے ایک مضمون میں دے چکے ہیں -

یہ کوئی امر زیادہ بحث کے قابل نہیں حضرت موسیٰ تیس دن  
و اذ وعدنا موسیٰ کا اعتکاف کرنے کے لیے پہاڑ  
اربعین لیلۃ ثم اتخذ تم العجل گئے تاکہ خدا کی عبادت میں  
من بعده و انتم ظالمون - مصروف ہوں مگر وہاں چالیس  
(۲- سورہ بقرہ - ۴۸) دن لگ گئے - توریت میں لکھا

ہے کہ چالیس دن اور چالیس رات موسیٰ پہاڑ پر رہے اور نہ روٹی  
کھائی نہ پانی پیا (سفر تور یہ مثنیٰ باب ۹ ورس ۹) زیادہ تر مقصود  
اس اعتکاف سے یہ تھا کہ خدا کی ہدایت اس بات میں چاہیں  
کہ اُس جم غفیر کی ہدایت و انتظام اور خدا کی عبادت کے لیے  
کیا قواعد یا احکام قرار دیے جاویں -

بنی اسرائیل کو چار سو برس سے زیادہ ہو گئے تھے کہ مصر  
میں رہتے تھے اور گو وہ خدا کو مانتے تھے مگر وہاں کی بت پرستی  
اور اُس کی شان و شوکت کے عادی ہو گئے تھے اور ظاہر میں بھی  
معبود کے وجود کے موجود ہونے کی خواہش مثل بت پرستوں کے  
آن کے دل میں سما گئی تھی اس لیے نہایت مشکل بات تھی کہ آن  
کو ایک ایسے خدائے واحد کی پرستش پر متوجہ کیا جاوے جس کا  
نہ ظاہر میں کوئی وجود ہے ، نہ ظاہری وجود میں اور نہ کسی  
ظاہری شکل میں آسکتا ہے بلکہ محض بیچون و بیچگون و بے رنگ و  
نمون ہے - غالباً یہی بات سب سے زیادہ حضرت موسیٰ کو بھی  
مشکل تھی اور وہ ضرور اس خیال میں تھے کہ حصید کو ظاہری  
صورتوں سے اس طرح بنایا جاوے جن کی عبادت تو نہ کی جاوے

مگر بنی اسرائیل کی دل بستگی کا ذریعہ ہوں۔ اور اسی وجہ سے  
 انہوں نے بعد میں کروہین کی مجسم شکنیں چاندی و سونے کی  
 بنائیں۔ ہم قبول کرتے ہیں کہ انہوں نے خدا کے حکم سے  
 بنائی ہوں گی، مگر بنائیں۔ جس کا سبب بجز مذکورہ بالا اس کے  
 اور کچھ نہ تھا۔ اور اسی لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو سچی  
 اور ٹھیٹ خدا پرستی اسی طرح بیچون و بیچگون و بے رنگ و نمون  
 طریقہ پر جیسا کہ وہ معبود حقیقی ہے ہمد رسول اللہ صلی اللہ  
 علیہ وسلم نے قائم کی موسیٰ سے باوجود اس شان و شوکت کے  
 قائم نہیں ہو سکی، نہ ہم کو کروہین کی حاجت ہے، نہ ہائی  
 پریسٹ کی، نہ کسی معبد کی، نہ قربانی سوختنی کی، نہ نجور کی،  
 اور نہ آتش دان کی، نہ خاص پوشاک اور سینہ بند کی، ہم سچے  
 خدا کی پرستش، جنگل میں، دریا میں، پہاڑ میں، گھر میں، بازار  
 میں، اندھیرے میں، آجائے میں، کپڑا پہنے، بن کپڑا پہنے  
 کر سکتے ہیں ہمارا دل ہی خدا کا معبد ہے ہمارا خدا ہر جگہ ہمارے  
 ساتھ ہے اور ہم خدا کے ساتھ اور یہ ایسا ساتھ ہے کہ نہ کبھی  
 ہم اس سے چھوٹ سکتے ہیں اور نہ وہ ہم کو چھوڑ سکتا ہے۔  
 سبحانہ و تعالیٰ شانہ والحمد للہ رب العالمین۔

### یازدھم۔ حقیقت کلام خدا با موسیٰ

کلام خدا کا جب تک نہ سنیں یہ تو معلوم نہیں ہو سکتا  
 کہ کیسا ہوتا ہے۔ مگر انسانوں کا کلام جو سننے میں آتا ہے وہ  
 تو یہ ہے کہ زبان اور ہونٹ ہلتے ہیں اس سے ہمد ہوائے محیط  
 کے ایک آواز کان تک پہنچتی ہے ہر ایک لفظ کے بعد دوسرا لفظ  
 بلکہ ہر لفظ کے پہلے حرف کے بعد دوسرا حرف نکلتا ہے اور حرفوں  
 سے مل کر لفظ اور لفظوں سے مل کر جملہ ہو جاتا ہے۔ پھر کیا  
 کا کلام بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟

علمائے اسلام نے کہا ہے کہ تمام انبیائے علیہم السلام - خدا کو متکلم کہا ہے اور اس کے کلام کو ثبوت کیا ہے پس اس کا متکلم ہونا اور خدا کے لیے کلام کا ہونا تو ثابت ہو گیا - مگر انہوں نے یہ نہ بتایا کہ ایسا ہی کلام جیسا ہمارا تمہارا ہے یا کسی اور طرح کا لیکن انہوں نے اس پر دوسری بحث قدیم اور حادث ہونے کی چھیڑ دی یعنی اس بات کی کہ خدا کا کلام قدیم ہے یا حادث - ہم اس بحث کو اس مقام پر لکھتے ہیں اور امید ہے کہ اسی سے پتہ لگ جاوے گا کہ اس کا کلام کیسا ہوتا ہے -

قاضی عضد اور علامہ سید شریف شرح مواقف میں تحریر فرماتے ہیں کہ خدا کے کلام کے قدیم و حادث ہونے پر دو متناقض قیاس ہیں - ایک قیاس یہ ہے کہ - خدا تعالیٰ کا کلام خدا تعالیٰ کی ایک صفت ہے اور جو صفت خدا کی ہے وہ قدیم ہے - پس خدا کا کلام قدیم ہے -

دوسرا قیاس جو اس کے برخلاف ہے وہ یہ ہے کہ - خدا کا کلام حرفوں و لفظوں کی ترتیب سے مل کر بنا ہے جو ایک بعد دوسرے کے وجود میں آئے ہیں اور جو چیز اس طرح پر بنتی ہے وہ حادث ہوتی ہے - پس خدا کا کلام بھی حادث ہے -

حنبل پہلے قیاس کو ٹھیک بتاتے ہیں اور اس بات کے قایل ہیں کہ خدا کے کلام میں حرف بھی ہیں اور آواز بھی ہے اور وہ دونوں اپنے آپ قائم ہیں اور قدیم ہیں پس کلام خدا کا بھی قدیم ہے - پس گویا حنبلی دوسرے قیاس کے دوسرے جملہ کو کہ ”جو چیز اس طرح پر بنتی ہے وہ حادث ہوتی ہے“ نہیں مانتے -

قاضی عضد اور علامہ سید شریف دونوں بالاتفاق کہتے ہیں کہ حنبلیوں کا دوسرے قیاس کے دوسرے جملے کو نہ ماننا قطعاً

غلط ہے کیوں کہ ہر ایک حرف آن حرفوں میں سے جن سے اُن کے نزدیک کلام خدا کا مرکب ہے ایک حرف کے ختم ہونے پر دوسرے حرف کا شروع ہونا موقوف ہے تو وہ دوسرا حرف قدیم نہ ہوا اور جو کہ پہلے حرف کے لیے بھی ختم ہونا ہے تو وہ بھی قدیم نہ رہا اور جو کلام کہ ان سے مرکب ہو کر بنا ہے وہ بھی قدیم نہ رہا۔

کرامیہ فرقہ اس بات میں کہ خدا کے کلام میں حرف اور آواز ہے حنبلیوں کے ساتھ متفق ہیں مگر وہ اس کو حاوٹ مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ خدا کی ذات میں قائم ہے کیوں کہ اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ خدا کی ذات میں حوادث کا قائم ہونا جائز ہے۔ پس گویا کرامیہ دوسرے قیاس کو تو صحیح مانتے ہیں اور پہلے قیاس کے دوسرے جملہ کو کہ ”جو صفت خدا کی ہے وہ قدیم ہے“ نہیں مانتے۔

معتزلے خدا کے کلام میں آواز اور حرف کو اسی طرح پر مانتے ہیں جس طرح کہ حنبلی اور کرامیہ مانتے ہیں مگر وہ کہتے ہیں کہ آواز اور حرف خدا کی ذات میں قائم نہیں ہے بلکہ خدا اُس کو دوسری چیز میں پیدا کر دیتا ہے مثلاً لوح محفوظ میں یا جبرئیل میں یا نبی میں اس لیے خدا کا کلام حادث ہے۔ پس معتزلے دوسرے قیاس کو صحیح سمجھتے ہیں اور پہلے قیاس کے پہلے جملہ کو کہ ”خدا تعالیٰ کا کلام خدا تعالیٰ کی ایک صفت ہے“ نہیں مانتے۔

اس پر قاضی عضد اور علامہ سید شریف فرماتے ہیں کہ جو کچھ معتزلے کہتے ہیں ہم اُس سے انکار نہیں کرتے بلکہ ہم بھی وہی کہتے ہیں مگر اُس کا نام کلام لفظی رکھتے ہیں اور اُس کو حادث مانتے ہیں اور ذات خدا تعالیٰ میں قائم نہیں کہتے۔ اُس کے سوا ہم



ایک اور امر ثابت کرتے ہیں اور وہ معنی ہیں قائم بالنفس جس کو کہ لفظوں سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہی حقیقت میں کلام ہے اور وہی قدیم ہے اور وہی خدا تعالیٰ کی ذات میں قائم ہے۔ پس دوسرے قیاس کا جو دوسرا جملہ ہے کہ ”خدا کا کلام حرفوں و لفظوں کی ترتیب سے مل کر بنا ہے“ اس کو نہیں مانتے اور ہم یقین کرتے ہیں کہ معنی اور عبارت ایک نہیں ہیں کیوں کہ عبارت تو زمانہ میں اور ملک میں اور قوموں میں مختلف ہو جاتی ہے اور معنی جو قائم بالنفس ہیں وہ مختلف نہیں ہوتے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ان معنوں پر دلالت کرنا بھی لفظوں ہی میں منحصر نہیں ہے کیوں کہ ان معنوں پر کبھی اشارہ سے اور کبھی کنایہ سے اسی طرح پر دلالت کی جاتی ہے جیسے کہ عبارت سے اور مطلب جو کہ ایک معنی ہے قائم بالنفس وہ ایک ہی ہوتا ہے اور کچھ متغیر نہیں ہوتا باوجودیکہ عبارتیں بدل جاتی ہیں اور دلائل مختلف ہو جاتی ہیں اور جو چیز متغیر نہیں ہوتی وہ اس چیز کے سوا ہے جو متغیر ہو جاتی ہے۔ یعنی جو چیز کہ متغیر نہیں ہوتی وہ تو معنی قائم بالنفس ہیں اور وہ اس چیز سے جو متغیر ہو جاتی ہے یعنی عبارت سے علیحدہ ہیں۔ (انتہی ملخصاً)۔

جو کچھ کہ قاضی عضد اور علامہ سید شریف نے فرمایا ہے مذہب اہل سنت و جماعت کا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی تحقیق بیان کریں مناسب ہے کہ جو باتیں ان بزرگوں نے چھپا رکھی ہیں ان کو کھول دیں تاکہ لوگوں کو صاف معلوم ہو جاوے کہ ان اصول کے ماننے سے جو ان بزرگوں نے قرار دیے ہیں کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔

معتزلیوں نے کہا تھا کہ آواز اور حرف دونوں خدا کی ذات میں قائم ہیں بلکہ وہ ان کو دوسری چیز میں پیدا کر دیتا ہے ،

قاضی صاحب اور علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہاں یہ صحیح ہے مگر ہم اس کا نام کلام لفظی رکھتے ہیں۔ مگر یہ نہیں فرماتے کہ کس کا کلام لفظی۔ خدا کا یا اس کا جس میں خدا نے اس کو پیدا کر دیا تھا۔

پھر اس پر زیادہ تحقیق یہ کرتے ہیں کہ صرف معانی قائم بالنفس اور غیر متغیر ہیں اور درحقیقت وہی کلام ہے اور وہی قدیم ہے اور اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ خدا کا کلام حروف و لفظوں کی ترکیب سے بنا ہے۔

اس بیان میں صریح نقص یہ ہے کہ اگر اس کو تسلیم کر لیا جاوے تو جو الفاظ قرآن مجید کے ہیں وہ خدا کے لفظ نہیں رہتے بلکہ اس کے لفظ ہوتے ہیں جس میں وہ پیدا کیے ہیں خواہ وہ جبرئیل ہوں یا نبی اور جو کہ وہ کلام آنہی لفظوں سے مرکب ہوا ہے تو وہ کلام بھی اسی شخص کا ہوا نہ خدا کا۔

میری تحقیق میں پہلا قیاس صحیح ہے اور میں خدا کے کلام کو اس کی صفت سمجھتا ہوں اور تمام صفات خدا کو قدیم مانتا ہوں اور اسی لیے خدا کے کلام کو بھی قدیم یقین کرتا ہوں۔ مگر حنبلیوں اور کرامیوں سے اس بات میں مختلف ہوں کہ خدا کے کلام میں آواز ہے اور اہل سنت و جماعت کے اس مسئلہ سے مختلف ہوں کہ صرف معانی قائم بالنفس ہیں اور وہی درحقیقت کلام ہے اور وہی غیر متغیر ہے بلکہ میرے نزدیک معانی اور لفظ دونوں قائم بالنفس ہیں اور دونوں قدیم و غیر متغیر ہیں۔

لفظ بھی حقیقت میں ایک مفید یا مختص معانی ہیں جن پر بولے جانے کے بعد ہم لفظ کا اطلاق کرتے ہیں۔ انسان جو گفتگو کرتا ہے اس وقت بھی الفاظ اس کے نفس میں اُن کے بولے جانے کے قبل موجود ہوتے ہیں۔ مگر صرف معانی کو قائم فی الذات مانتے

اور معانی اور الفاظ دونوں کو قائم فی الذات مانتے ہیں یہ فرق ہے کہ پہلی صورت میں اُن معانی کو الفاظ مختصہ میں تعبیر کرنا لازم نہیں آتا اور دوسری صورت میں بجز الفاظ معینہ مختصہ کے اور کسی الفاظ سے تعبیر نہیں ہو سکتے۔ مثلاً الحمد لله کلام خدا ہے یہ ذات باری میں مع معانی و الفاظ کے اس طرح پر قائم ہے کہ جب تلفظ میں آوے گا تو الحمد لله ہی اُس کا تلفظ ہوگا۔ الحمد لله اُس کا تلفظ نہیں ہونے کا۔ نہ ثناء الله اُس کا تلفظ ہوگا اور ہم قرآن مجید کو اسی معنی کر مع معانی اور الفاظ کلام خدا کہتے ہیں اور قدیم تسلیم کرتے ہیں۔

لفظوں کے قائم بالنفس ہونے میں تقدم و تاخر نہیں ہوتا۔ اس کو مثال دے کر سمجھانا بلا شبہ مشکل ہے مگر اس طرح پر سمجھ میں یا خیال میں آ سکتا ہے کہ اگر جس طرح اُن الفاظ کے نقوش کو آئینہ کے سامنے رکھنے سے وہ سب معاً بلا تقدم و تاخر آئینہ میں منقش معلوم ہوتے ہیں اسی طرح الفاظ کے بھی بمعنی مذکورہ قائم فی الذات ہونے میں تقدم و تاخر لازم نہیں آتا۔ ذات باری کی نسبت ہم ثابت کر چکے ہیں کہ وہ علة العلل تمام چیزوں کی ہے جو ہو چکیں اور ہوتی ہیں اور ہونے والی ہیں۔ اس لیے ضرور ہے کہ وہ تمام چیزیں ذات باری میں قائم ہوں اُن کے ظہور کے زمانہ کے مختلف ہونے اور تبدیل کیفیت و کمیت سے اُس چیز میں جو قائم فی الذات ہے حدوث لازم نہیں آتا۔

اس صورت میں قاضی عضد اور علامہ سید شریف کا یہ کہنا کہ ہر ایک حرف اُن حرفوں میں سے جن سے کلام خدا مرکب ہو ایک حرف کے ختم ہونے پر دوسرے حرف کا شروع ہونا موقوف ہے تو وہ دوسرا حرف قدیم نہ ہوا (الٰہی آخرہ) صحیح نہیں رہتا اس لیے کہ اس امر کا وقوع اُس وقت ہوتا جب کہ ہم کلام خدا

میں حرف اور آواز دونوں مانتے مگر جب ہم کلام خدا میں آواز کو تسلیم نہیں کرے تو نقص مذکورہ لازم نہیں آتا ۔

آواز کی کوئی دوسری حقیقت بجز اس کے کہ ہوا کی مدد اور زبان اور ہونٹوں کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے ہم نہیں جانتے۔ پس اس کو بجنسہ خدا کی صفت قرار دینا اور یہ خیال کرنا کہ خدا کے منہ سے بھی مثل ہمارے منہ کے ایک حرف دوسرے حرف کے بعد نکلتا ہے بناءً فسد علی الفاسد ہے ۔ پہلے ایک غلط امر کو تسلیم کیا ہے پھر اس کی بنا پر دوسری غلطی قائم کی ہے ۔

جب کہ ہم کسی پر خواہ وہ جبرئیل ہو جو حسب اعتقاد جمہور مسلمین خدا اور انبیا میں مثل ایلچی کے واسطہ ہے ۔ اور خواہ وہ خود نبی مبعوث ہو جیسا کہ میرا خاص اعتقاد ہے خدا کے کلام کا نازل ہونا کہتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ خدا نے اس کے دل میں بجنسہ وہ الفاظ جن کو بعد اس کے وہ تلفظ کرے گا مع ان کے معنی کے جو مقصود ہیں پیدا کیا ہے یا القا کیا ہے اور وہی لفظ بجنسہ نبی نے تلفظ کیے ہیں پس گو اس نبی کا ان لفظوں کو تلفظ کرنا حادث ہو مگر وہ الفاظ مع ان کے معنی کے یا وہ معنی مقید جن کا تلفظ بجز انہی الفاظ کے نہیں ہو سکتا تھا قدیم اور کلام خدا ہیں اور یہی میرا اعتقاد قرآن مجید کی نسبت ہے کہ وہ بلفظہ مع معانیہا قدیم و کلام خدا ہے اور خود خدا نے اپنا کلام پیغمبر خدا میں بلا واسطہ پیدا کیا ہے جیسا کہ میں نے کسی مقام پر کہا ہے :

ز جبرئیل آمین قرآن بہ پیغامے نئے خواہم

ہمہ گفتار معشوق است قرآن کہ من درام

مگر پیغمبر خدا کا یا ہمارا ان لفظوں کو تلفظ کرنا حادث ہے ۔

اس مضمون کو بذریعہ کسی مثال کے سمجھانا بلاشبہ نہایت

مشکل ہے مگر ہم ایک قریب ترین مثال سے اس کو سمجھاتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کسی سبب سے بول نہیں سکتا مگر ایک اپنی تحریر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس کو ہم پڑھتے ہیں پس گو اس تحریر میں آواز نہیں ہے مگر جو لفظ مطابق اس تحریر کے ہماری زبان سے نکلتے ہیں وہ لفظ بلا شبہ اسی کے ہیں جس نے اس کو لکھا ہے اور ہم صرف ان لفظوں کا تلفظ کرتے ہیں مگر درحقیقت وہ ہمارے لفظ نہیں ہیں اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ لفظ ہر وقت ہمارے تلفظ کے پیدا ہوئے ہیں۔

ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ انبیاء اور اولیاء کوئی غیبی آواز نہیں سنتے۔ سنتے ہوں گے مگر وہ خدا کی آواز نہیں ہے بلکہ وہ اس القا کا اثر ہے جو ان پر ہوا ہے اور وہ انہی کے نفس کی آواز ہے جو ان کے کان میں آئی ہے۔ وہ بیداری میں اسی طرح آواز کو سنتے ہیں جیسے کہ سوتے میں خواب دیکھنے والا سنتا ہے۔ یا جیسے کہ بعض دفعہ لوگوں کو جو کسی خیال میں مستغرق ہیں بغیر کسی بولنے والے کے کان میں آواز آتی ہے۔

کلام الہی کی نسبت جو کچھ خدا نے ہمارے دل میں ڈالا ہے بعینہ وہ وہی ہے جو حضرت مولانا و مرشدنا حضرت شیخ احمد سرہندی نقشبندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو القا ہوا تھا چنانچہ اس باب میں جو حضرت ممدوح نے لکھا ہے۔ ذیل میں مندرج ہے۔

حضرت ممدوح نے مکتوب نود و دوم جلد سوم میں جو بنام فقیر ہاشم کشمی تحریر فرمایا ہے اس طرح پر لکھا ہے۔ ”پرسیدہ بودند آن کہ بعض عرفا فرمودہ اند کہ ما کلام حق را می شیم دیا ما را با او تعالیٰ مکالمہ سے شود چنانچہ از امام ہام جعفر صدق رضی اللہ تعالیٰ عنہ منقول است کہ گفت ما زلت آردد الایۃ حتی

سمعتها من المتكلم بها - و نیز از رساله غوثیه که منسوب  
 بمحضرت شیخ عبدالقادر جیلی است قدس سره، مفهوم می گردد چه  
 معنی است و تحقیق آن نزد تو چیست ؟ بدان ارشدک الله تعالی که  
 کلام حق جل و علا در رنگ ذات و سائر صفات حق جل شانہ ،  
 بیچون بیچگون است و سماع آن کلام بیچون نیز بیچون است زیرا که  
 چون را به بیچون راه نیست پس این سماع مربوط بحاسه سمع نہ باشد  
 کہ سراسر چون است آنجا اگر از بنده استماع است بتلقی روحانیت کہ  
 نصیبی از بیچونی دارد و بے واسطه حروف و کلمات است و نیز اگر  
 از بنده کلام است ہم بالقای روحانی است بے حروف و کلمه و این  
 کلام نصیبی از بیچونی دارد کہ مسموع بیچون می گردد یا آن کہ  
 گوئم کہ کلام لفظی کہ از بنده صادر می شود حضرت حق  
 سبحان تعالی آن را نیز به سماع بیچونی استماع می فرماید و بے توسط  
 حروف و کلمات و بے تقدیم و تاخیر آن را میشنود اذ لا یجری  
 علیہ تعالی زمان یسع فیہ التقدیم و التاخیر و ارا  
 موطن کہ از بنده سماع است بکلیت سامع و اگر کلام است دم بکلیه ،  
 متكلم تمام گوش و تمام زبان است روز میثاق ذرات مخرجه قول الست  
 بربکم را بے واسطه بکلیت خود شنیدند و بکلیت خود جواب بلے  
 گفتند تمام گوش بودند و تمام زبان زیرا کہ اگر گوش از زبان متمیز  
 بودے سماع کلام بیچون حاصل نیامدے و شایان ارتباط مرتبه  
 بیچون نہ گشتے لا یحمل عطا یا الملک الا مطایام  
 غایة ما فی الباب آن معنی متلقی از راه روحانیت اخذ نموده بود  
 ثانیاً در عالم خیال کہ آن در انسان تمثال عالم مثال است بصورت  
 حروف و کلمات مرتبه متمثل می گردد و آن تلقی و القا بصورت سماع و  
 کلام لفظی مرتسم می شود چه هر معنی را دران عالم صورته  
 است اگرچه آن معنی بیچون بود اما ارتسام بیچون هم آنجا بصورت

چون است کہ فہم و افہام ہاں مربوط است کہ مقصود ازاں ارتسام است و چون سالک متوسط در خود حروف و کلمات مرتبہ مے یابد و سماع و کلام لفظی احساس مے نماید خیال میکنند کہ این حروف و کلمات را از اصل شنیدہ است و بے تفاوت از انجا اخذ کردہ نمے داند کہ این حروف و کلمات صور خیالیہ آن معنی متلقی است و این سماع و کلام لفظی تمثال سماع و کلام بیچونی ، عارف تام المعرفت را باید کہ حکم ہر مرتبہ را جدا سازد و یکے را بدیگرے ملتبس نہ گرداند پس سماع و کلام این اکابر کہ بہ مرتبہ بیچونی مربوط است از قبیل تلقی و القاء روحانی است و این کلمات و حروف یکہ تعبیر ازاں معنی متلقی ہاں مے نماید از عالم صور مثالیہ ، و گروہ کہ گمان بردہ اند کہ ما حروف و کلمات را ازاں حضرت جل سلطانہ استماع مے نمایم دو فریق اند یکے ازاں دو فریق کہ احسن حال اند مے گویند کہ این حروف و کلمات حادثہ مسموعہ دال اند براں کلام نفسے قدیم و فریق دیگر اطلاق قول بسماع کلام حق جل شانہ مے نماید و ہمیں حروف و کلمات مرتبہ را کلام حق میدانند جل و علا و فرق نمے کنند درمیان آن کہ لایق بشان او تعالیٰ کدام است ، و کدام است کہ شایان جناب قدس او نیست سبحانہ و ہم الجہال البیطال لم یعرفوا ما یجوز علی اللہ سبحانہ عما لا یجوز علیہ تعالیٰ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت السميع العليم الحکیم والصلوة والسلام علی خیر البشر و الہ واصحابہ الاطہر“۔

حضرت موسیٰ اپنے مقام سے مع اپنے گھر والوں کے مصر کو روانہ ہوئے ۔ جو جو خیالات حضرت موسیٰ کو نسبت آن مشکلات کے ہوں گے جو مصر میں پیش آنے والی تھیں اور اپنی قوم کو فرعون کے ظلم سے نجات دینے کی مشکلات نے آن کے دل کو

کس قدر غمگین اور متفکر کیا ہوگا اور ان تمام حالتوں کے سبب اُن کو ذات باری میں کس قدر استغراق رہا ہوگا - کیوں کہ ایسی مشکلات لا ینحل کے حل کرنے میں بجز ذات باری پر بھروسہ کے دوسرا کوئی بھروسہ نہ تھا - یہ تمام اسباب تھے حضرت موسیٰ کو ذات باری میں کامل طور پر مستغرق ہو جانے کے اور فطرت نبوت جو خدا نے اُن میں پیدا کی تھی سب سے زیادہ اس استغراق کا باعث تھی -

اتفاق سے وہ رستہ بھولے ہوئے تھے جب اُنہوں نے ایک طرف آگ دیکھی تو اُس طرف گئے - جب اُس کے قریب پہنچے تو اُنہوں نے اُس جنگل کو پہچانا کہ وہ وادی ایمن یا طویٰ ہے جو پہلے سے نہایت مقدس اور متبرک اور خدا کی جگہ سمجھا جاتا تھا - دفعۃً اس بات کے معلوم ہونے سے خدا کی طرف طبیعت کا ذوق اور خدا کا شوق بھڑک اُٹھا اور اُن کے کان میں آواز آئی - یا موسیٰ انی انا ربک - انا الله العزیز الحکیم - انی انا الله رب العالمین - فاخرج نعلیک انک بالوادی المقدس طویٰ - یہ آواز کسی بولنے والے کی نہ تھی نہ خدا کی آواز تھی کیوں کہ جیسا ہم نے ابھی بیان کیا خدا کے کلام میں آواز نہیں ہوتی - بے شک خدا نے یہ الفاظ جو کلام خدا تھے موسیٰ کے دل میں ڈالے اور خود موسیٰ کے دل کی آواز اُس کے کان میں آئی جو خدا کے پکارنے سے تعبیر کی گئی -

اُسی جوش دلی اور استغراق قلبی کا سبب تھا جس سے حضرت موسیٰ کو اپنی حیثیت کا ذہول ہوا اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر کہنے لگے - رب ارنی النظر الیک - خدا نے جواب دیا نہ اپنی آواز سے اور نہ کسی فانی جسم میں آواز ڈالنے سے بلکہ خود موسیٰ کے دل میں اپنا کلام ڈالنے سے کہ - لن ترانی - جہاں جہاں



خدا اور موسیٰ میں کلام ہونے کا ذکر ہے اس کی یہی ماہیت ہے اور وکلام اللہ موسیٰ تکلیما۔ کی یہی حقیقت ہے ہذا ما افہمینی اللہ حقیقۃ کلامہ العظیم وهو الہادی الی الصراط المستقیم۔

### دواز دھم - حقیقت تجلی للجبل

پھاڑ پر خدا کی تجلی ہونے اور آگ کی صورت میں نزول فرمانے  
وہل اتیک حدیث کی نسبت تفسیروں میں بہت کچھ  
موسیٰ - اذرای ناراً فقال بھرا ہوا ہے مگر قرآن مجید میں  
لاہلہ اسکشوا انی انست یہ واقعہ نہایت صاف صاف اور  
ناراً لعلی آتیکم منها سیدھے لفظوں میں بیان ہوا ہے  
بقبس اواجدا علی النار جس میں کچھ بھی پیچیدہ بات  
ہدی۔ فلما اتاہا نودی نہیں ہے چنانچہ سورہ طہ  
یا موسیٰ - انی انا ربک میں خدا نے فرمایا کہ کیا تجھ  
فما خلع نعلیک انک تک موسیٰ کا قصہ پہنچا ہے۔  
بالوادی المقدس طوی۔ جب کہ اس نے آگ کو دیکھا  
(۳۰۔ طہ - ۸ - ۱۲)

ٹھہر جاؤ مجھ کو آگ دکھائی دی ہے شاید میں تمہارے لیے اس  
میں سے جلتی ہوئی لکڑی لے آؤں یا اس آگ پر کسی راہ بتانے  
والے کو پاؤں۔ پھر جب موسیٰ آگ کے پاس پہنچے اس کو پکارا  
گیا یعنی آواز آئی کہ اے موسیٰ بے شک میں تیرا خدا ہوں اپنی  
جوتی پاؤں سے آثار بے شک تو پاک میدان میں ہے۔

یہی مضمون کسی قدر الفاظ کی تبدیل سے سورہ نمل میں آیا  
اذ قال موسیٰ لاہلہ انی ہے کہ جب موسیٰ نے اپنے  
انست نار اساتیکم منها گھر والوں سے کہا کہ مجھ کو  
بخبروا واتیکم بشہاب قبس آگ دکھائی دی ہے میں اب

لعلکم تصطلون - فلما جاءها نودی ان بورک من فی النار ومن حولها و سبحان الله رب العالمین - یا موسیٰ انه انا الله العزیز الحکیم -

وہاں سے تمہارے لیے کوئی خبر لاتا ہوں یا تمہارے لیے جلتی لکڑی لاتا ہوں تاکہ تم تاپو۔ پھر جب موسیٰ آگ کے پاس آیا تو آواز دی گئی کہ برکت دی گئی اُس کو جو آگ کے

قریب ہے (یعنی موسیٰ کو) (۲۷ - نمل - ۷ - ۹)

اور اُس کو جو اُس کے گرد ہے (یعنی ہارون کو جو موسیٰ کے گھر کے لوگوں کے ساتھ تھے) اور پاک ہے اللہ پروردگار عالموں کا اے موسیٰ ٹھیک بات یہ ہے کہ میں ہوں خدا زبردست حکمت والا -

اور سورہ قصص میں اس طرح فرمایا ہے کہ جب موسیٰ مدین سے اپنے گھر والوں کو لے کر غالباً

فلما قضیٰ موسیٰ الا جل و سار باہلہ انس من جانب الطور نارا قال لاہلہ امکثوا فی انست نارا لعلی آتیکم منها یخبروا جزوة من النار لعلکم تصطلون - فلما اتا ہانودی من شاطئ الواد الا یمن فی البقعة المبارکة من الشجرة ان یا موسیٰ انی انا الله رب العالمین -

مصر کے جانے کے قصد سے روانہ ہوا تو اُس نے طور کی جانب آگ دیکھی اُس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ ٹھہرو میں نے آگ کو دیکھا ہے شاید میں وہاں سے تمہاری کوئی خبر یا کچھ تھوڑی سی آگ لاؤں تاکہ تم تاپو۔ پھر جب موسیٰ آگ کے پاس آئے تو مبارک میدان کے کنارہ سے مبارک جگہ

(۲۷ - قصص - ۲۹ و ۳۰)

گئی کہ اے موسیٰ بے شک میں اللہ ہوں پروردگار عالموں کا -

اور سورہ اعراف میں یوں آیا ہے کہ - جب موسیٰ ہماری  
 و لما جاء موسیٰ مقرر کی ہوئی جگہ میں آیا اور  
 لم یقا تنا و کلمہ ربہ قال اس کے پروردگار نے اس سے  
 رب ارنی انظر الیک قال کلام کیا تو موسیٰ نے کہا  
 لن ترانی ولا کن انظر الی اے پروردگار اپنے تئیں مجھے  
 العجیل فان استقر مکانہ دکھلا دے - خدا نے کہا کہ  
 فسوف ترانی فلما تجلی تو مجھے نہ دیکھے گا مگر اس  
 ربہ للعجیل جعلہ دکا وخر پہاڑ کی طرف دیکھ پھر اگر وہ  
 موسیٰ صعقا - فلما افاق اپنی جگہ پر قائم رہے تو تو  
 قال سبحانک تبت الیک مجھ کو بھی دیکھ لے گا - پھر  
 وانا اول المؤمنون - جب اس کے پروردگار نے پہاڑ  
 (۲- سورہ اعراف - ۱۳۹ و ۱۴۰) کے لیے تجلی کی تو اس کو  
 ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گر پڑے موسیٰ بے ہوش ہو کر - پھر  
 جب ہوش آیا تو کہا کہ پاک ہے تو معافی مانگتا ہوں تجھ سے اور  
 میں پہلا ایمان والوں میں ہوں -

اگر ان قصوں اور کہانیوں سے قطع نظر کی جاوے جو  
 یہودیوں نے اس کی نسبت بنا لی ہیں اور ان کی کتابوں میں مندرج  
 ہیں اور جن کی پیروی کر کے ہمارے ہاں کے مفسروں نے انھی  
 قصوں کو مختلف طرح پر اپنی تفسیروں میں بھر دیا ہے اور صرف  
 قرآن مجید کی آیتوں پر غور کیا جاوے تو ان آیتوں سے مندرجہ ذیل  
 امور پائے جاتے ہیں -

۱- موسیٰ نے جو آگ دیکھی تھی حقیقت میں وہ آگ ہی  
 تھی نہ خدا تھا اور نہ خدا کا نور اور نہ ہرے سبز درخت میں سے وہ  
 آگ روشن ہوئی تھی اور درخت نہیں جلتا تھا جیسا کہ لوگ خیال  
 کرتے ہیں بلکہ صرف بات اس قدر تھی کہ درحقیقت حضرت موسیٰ

نے پہاڑ کی جانب آگ جلتی ہوئی دیکھی رستہ پر آگ جلانا پرانی قوموں کا دستور تھا۔ رات کا وقت اور موسم سردی کا تھا اور جنگل میں حضرت موسیٰ رستہ بھی بھول گئے تھے انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم ٹھہرو میں وہاں جاتا ہوں یا وہاں کوئی شخص رستہ بتانے والا مل جاوے گا۔ یا میں تمہارے لیے وہاں سے کوئی جلتی ہوئی لکڑی لے آؤں گا جس سے تم تاپنا تاکہ سردی سے بچو۔

یہ واقعہ کود سینا یا کوہ طور کے قریب موسیٰ پر گزرا تھا جب کہ وہ مدین سے اپنے گھر کے لوگوں کو لے کر مصر کو جانے تھے۔ ہم نے سورہ بقرہ کی تفسیر میں اس بات کو کامل تحقیقات سے ثابت کر دیا ہے کہ طور سینا آتشیں پہاڑ تھا اس میں سے جو لونکلی ہوگی اس کو حضرت موسیٰ نے دیکھ کر یہ بات کہی کہ میں نے آگ دیکھی ہے وہاں سے کوئی خبر یا تھوڑی سی آگ لے کر آتا ہوں۔

۲۔ ان آیتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو آواز موسیٰ کو وہاں آئی یا جو کلام خدا نے موسیٰ سے کیا اس کو اس آگ سے کچھ تعلق نہ تھا۔ سورہ طہ اور سورہ نمل میں یہ بیان ہوا ہے کہ جب حضرت موسیٰ آگ کے پاس آئے تو ان کو آواز دی گئی۔ نہ وہاں یہ بیان ہوا ہے کہ آگ نے آواز دی نہ یہ بیان ہوا ہے کہ آگ میں سے آواز آئی بلکہ باوجودیکہ آگ کا ذکر وہاں موجود ہے اور پھر نودی صیغہ مجہول کا آیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آواز یا کلام کو آگ سے کچھ تعلق نہیں تھا۔ مثلاً ایک شخص دریا میں سے پانی بھرنے جاوے اور وہ کہے کہ جب میں دریا کے قریب پہنچا تو میں نے پکارنے کی آواز سنی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ خواہ مخواہ دریا میں سے وہ آواز آئی۔ اسی طرح جب حضرت موسیٰ آگ کے

قریب پہنچے تو اُن کے کان میں آواز آئی - پس اس بات کا قرار دینا کہ وہ آواز آگ میں سے آئی تھی کسی طرح قرآن مجید سے نہیں پایا جاتا -

علاوہ اس کے سورہ قصص میں بیان ہوا ہے کہ مبارک جنگل کے کنارے سے ایک درخت کی طرف سے وہ آواز آئی تھی اور یہ آیت نص صریح اس بات کی ہے کہ آگ میں سے آواز نہیں آئی تھی -

سورہ قصص کی آیت میں آواز کا آنا من الشجرة بیان ہوا ہے لفظ من سے خاص درخت میں سے آواز کا آنا نہیں ثابت ہوتا کیوں کہ اس آیت میں خود خدا نے جانب کے معنی کی تصریح کر دی ہے جہاں فرمایا ہے من جانب الطور اور اسی تصریح پر من شاطئی الوادی لا یمن - ای من جانب الشاطئی الوادی لا یمن - من الشجرة ای من جانب الشجرة محمول کیا جاتا ہے اور یہ خیال کرنا کہ یہ شجر وہ شجر تھا جس میں آگ روشن ہوئی تھی اور درخت سبز کا سبز تھا اور نہیں جلتا تھا اور حضرت موسیٰ نے اس سبز درخت میں آگ دیکھی تھی یہودیوں کی کتابوں کی کہانیاں اور بے ثبوت قصے ہیں - قرآن مجید سے مطلق ثابت نہیں ہے - سورہ یاسین میں جو آیا ہے کہ من الشجر الاخضر نارا - اُس کو حضرت موسیٰ کے قصہ سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے -

۳- تجلی للجبیل کی نسبت بہت تھوڑی گفتگو کرنی ہے - حضرت موسیٰ نے یہ کہا - رب ارنی انظر الیک - اس کی تفصیل سورہ بقرہ میں بیان ہو چکی ہے کہ کس حالت ذہول میں حضرت موسیٰ نے یہ ناممکن خواہش خدا سے کی تھی اُس کا جواب خدا کی طرف سے بجز - لن ترانی - کے اور کچھ نہیں ہو سکتا

تھا۔ مگر جو کہ خدا کا وجود اُس کی تمام مخلوقات سے اور خصوصاً ایسی مخلوق سے جو لوگوں کی آنکھ میں زیادہ تر عجیب ہیں ثابت ہوتا ہے اس لیے خدا نے حضرت موسیٰ کو اُس عجیب مخلوق کی طرف متوجہ کیا جو اُن کے قریب موجود تھی اور جس سے خدا کی شان و قدرت ظاہر ہوتی تھی۔ یعنی اُس آتشیں پہاڑ کی طرف جو روشن ہونا شروع ہوا تھا اور جس کی لو کو حضرت موسیٰ دیکھ کر آگ لینے دوڑے تھے مگر جب وہ پہاڑ بھڑکا اور گرجا اور اُس کے پتھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اڑے تو حضرت موسیٰ غش کھا کر گرے۔ پھر جب ہوش آیا تو اُس سوال سے توبہ کی اور کہا انا اول المؤمنون۔

تجلی خدا کی اُس کی تمام مخلوق میں موجود ہے جیسا کہ ہم نے سورہ بقرہ میں بیان کیا ہے پس فالما تجلی ربہ للجبل کے معنی یہ ہیں کہ۔ فلما ظہر شان ربہ و کمال قدرتہ علی الجبل استرہب موسیٰ و خرصعقا۔

### سیزدہم۔ بیان کتابت فی الالواح

یہ لوحیں پتھر کی تختیاں تھیں جن پر وہ احکام کھدے ہوئے  
 قال یا موسیٰ انی  
 اصطفتک علی الناس  
 برسا لانی و بکلامی فخذ  
 ما اتیتک و کن من  
 الشاکرین و کتبنا الہ فی ال  
 لوح من کل شی موعظۃ و  
 تفصیلا لکل شی فخذھا  
 بقوة و امر قومک یاخذوا  
 باحسانھا ساوریکم  
 تھے جو بنی اسرائیل کے لیے خدا  
 نے دئے تھے۔ توریت میں ایک  
 جگہ لکھا ہے کہ جب خدا نے  
 موسیٰ کو سب احکام بتا دئے  
 تو موسیٰ نے اُن تمام حکموں  
 کو جو خدا نے دئے تھے لکھ  
 لیا۔ (سفر خروج باب ۲۴  
 ورس ۴) اس سے اس قدر ثابت  
 ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو

دارالنفاسقین - لکھنا آتا تھا - دوسری جگہ لکھا

سورہ اعراف - ۴۱ و ۴۲ - ہے کہ - خدا نے موسیٰ سے

کہا کہ میرے پاس پہاڑ پر آ

تاکہ پتھر کی لوحیں اور توریت

اور اور احکام جو میں نے لکھے

ہیں تجھ کو دوں تاکہ بنی

اسرائیل کو تعلیم کرے (سفر

خروج باب ۲۴ ورس ۱۲) اور

ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ -

جب خدا موسیٰ سے بات چیت

کر چکا تو لوحیں شہادت کی

یعنی پتھر کی لوحیں جو خدا کی

آنگلی سے لکھی ہوئی تھیں

۷- سورہ اعراف - ۱۴۹ - ۱۵۳ - موسیٰ کو سپرد کیں - (سفر خروج باب ۳۱ ورس ۱۸) اور ایک

جگہ پھر لکھا ہے کہ چالیس دن رات پہاڑ پر رہنے کے بعد خدا نے

دو پتھر کی لوحیں جو خدا کی آنگلی سے لکھی گئی تھیں موسیٰ کو

دیں اور جو کچھ خدا نے پہاڑ میں بنی اسرائیل کے سرداروں سے

آگ کے بیج میں سے کہا تھا لکھا گیا تھا (سفر توریہ مشن باب ۴۴

ورس ۱۰ و ۱۱) بعد اس کے جب حضرت موسیٰ آن لوحوں کو

لے کر آئے اور ہارون پر خفگی ہونے کی حالت میں آن کو پھینک

دیا اور وہ ٹوٹ گئیں تو خدا نے موسیٰ کو حکم دیا کہ -

اپنے لیے پتھر کی دو لوحیں پہلی لوحوں کے برابر بنا دے اور میرے

پاس پہاڑ میں لے آ اور آن کے لیے لکڑی کا ایک صندوق بنا - جو

کلمات کہ پہلی لوحوں پر لکھے ہوئے تھے - وہ میں پھر آن لوحوں پر

لکھ دوں گا - موسیٰ نے ایسا ہی کیا اور خدا نے پہلی تحریر

کے موافق اُن دس کلموں کو جو خدا نے بنی اسرائیل پر پہاڑ پر آگ کے پیچ میں سے کہے تھے لکھ دئے اور لوحیں موسیٰ کو دے دیں موسیٰ نے احتیاط سے اُن کو صندوق میں رکھ چھوڑا (مفر توریتہ مشن باب ۲۰ ورس ۱ لغایت ۵) یہ بات ہر کوئی تسلیم کر سکتا ہے کہ خدا کی شان اور اُس کے تنزہ سے بعید ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھ یا اپنی انگلی سے مثل ایک سنگ تراش کے پتھر پر عبارت کندہ کرے۔ یہودی اور عیسائی اور وہ تمام لوگ بھی جو ایسے واقعات کو ہمیشہ ایک عجیب پیرایہ میں ظاہر کرنا چاہتے ہیں ان لفظوں کے جو توریت میں ہیں ظاہری معنی نہیں لیتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان لفظوں سے یہ مراد ہے کہ خدا کی قدرت سے وہ کلمات اُس پر کھد گئے تھے۔ تمام حالات سے اور اُس طرز بیان سے جو توریت میں آیا ہے بخوبی پایا جاتا ہے کہ وہ لوحیں خود حضرت موسیٰ نے بنائی تھیں اور جو احکام خدا نے اُن کو دئے تھے وہ خود حضرت موسیٰ نے اُن پر کندہ کیے تھے۔

ہمارے علمائے مفسرین نے اس بات پر بحث کی ہے کہ وہ وقال وھب کانت من لوحین کس چیز کی تھیں اور کے صخرة صماليہا اللہ لموسیٰ تھیں بعضوں نے کہا دس تھیں علیہ السلام (تفسیر کیوں)۔ بعضوں نے کہا سات تھیں کسی نے کہا زمرہ کی تھیں کسی نے کہا سبز زبرجد کی تھیں اور سرخ یاقوت کی تھیں۔ حسن نے کہا کہ لکڑی کی تھیں جو آسمان سے آتری تھیں اور وہب کا قول ہے کہ وہ سخت پتھر کی تھیں اُن کو خدا نے موسیٰ کے لیے نرم کر دیا تھا۔

بہر حال وہ لوحیں کسی چیز کی ہوں وہ چنداں بحث کے قابل واما کیفیۃ الکتابة نہیں ہیں جو امر بحث طلب ہے فقال ابن جریر کتبہا وہ یہ ہے کہ اُن پر لکھا کس



جبرئیل بالقلم الذی کتب بہ الذکر و استمد من نہر النور و اعلم انه لیس فی لفظ الایہ ما یدل علی کیفیۃ تلک الالواح و علی کیفیۃ تلک الکتابۃ فان ثبت ذلک التفصیل بدلیل منفصل قوی و جب القیون بہ والا و جب السکوت عنہ (تفسیر کہیں) -

کرنے چاہیے -

میں یہ بات کہنی چاہتا ہوں کہ آیت کے لفظوں سے یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ ان لوحوں کا کاتب نہ تھا کیوں کہ تمام قرآن مجید میں لفظ ”کتبنا“ کا جہاں آیا ہے اُس سے خدا کی نسبت فعل کتابت کی مراد نہیں لی گئی بلکہ مقرر کرنے فرض کرنے کے معنی لیے گئے ہیں چنانچہ ”کتبنا“ کے ہر جگہ سب علماء نے یہی معنی قرار دئے ہیں ”علی“ اور ”لہ“ جو کتابت کے صلہ میں آتا ہے اُس سے کچھ تغیر معنی میں نہیں ہوتا - بلکہ ”فی“ کے صلہ میں آنے سے بھی کچھ تغیر واقع نہیں ہوتا چنانچہ سورۃ انبیاء کی ایک سو پانچویں آیت میں یہ الفاظ آئے ہیں ”و لقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثہا عباد الصالحون“ یہ بات ظاہر ہے کہ زبور کا لکھنا یعنی فعل کتابت کسی نے بھی خدا کی طرف منسوب نہیں کیا پس اُس کے معنی یہی ہیں کہ ”فرضنا فی الزبور“ پس قرآن مجید کی کوئی آیت اس بات پر اشارہ بھی نہیں

کرتی کہ اُن لوحوں کا کاتب خدا تھا۔ بلکہ جس طرح خدا تعالیٰ کبھی بندوں کے اور اشیاء کے بعض افعال کو اپنی طرف نسبت کرتا ہے اس طرح بھی فعل کتابت الواح کا خدا نے اپنی طرف منسوب نہیں کیا۔

اب رہی یہ بات کہ پھر اُن پر کس نے لکھا تھا حضرت موسیٰ کے سوا وہاں اور کوئی لکھنے والا نہ تھا۔ وہب نے جو یہ کہا ہے کہ وہ سخت پتھر کی لوحیں تھیں خدا نے موسیٰ کے لیے اُن کو نرم کر دیا تھا۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہب کے نزدیک بھی حضرت موسیٰ ہی اُن کے لکھنے والے تھے۔

حضرت موسیٰ ایک مہینہ میں واپس آنے کا اقرار کر کے پہاڑ پر گئے تھے اُن کو جو مہینہ بھر عبادت میں مشغول رہنے کا حکم ہوا وہ اُسی کو ميعاد عطاء احکام سمجھے حالانکہ احکام اُس کے بعد ملنے کو تھے چنانچہ دس روز میں وہ احکام ملے یا اُن کے کھودنے میں دس دن لگ گئے۔ غرض کہ چالیس دن رات ہو گئے خدا نے جو احکام اُن کو وحی سے بتائے تھے اُنہوں نے چاہا کہ اُن کو پتھر کی لوحوں میں کندہ کر لیں اور بنی اسرائیل کو جا کر دکھائیں۔ وعدہ سے دس دن زیادہ لگ جانے سے بنی اسرائیل کو اُن کے واپس آنے کی توقع جاتی رہی اور انہوں نے اپنے لیے بطور دیوتا کے بچھڑا بنا لیا اور اُس کی پوجا کرنے لگے۔

### چہار دہم - اتخاز عجل

بچھڑا بنانے کا کچھ مختصر سا ذکر ہم نے سورہ بقرہ کی تفسیر و اتخذ قوم موسیٰ من میں لکھا ہے مگر اس مقام پر بعدہ من حلیہم عجلا اُس کے متعلق خاص باتوں سے جسدا له خوار الم یروا انه بحث کرنی چاہتے ہیں اور اول

اُن آیتوں کو لکھتے ہیں جن سے وہ بحث متعلق ہے۔

لَا يَكْفُرُ بِهِمْ وَاَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا۔

۲۔ سورہ اعراف - ۱۴۶۔

خدا نے سورہ اعراف میں فرمایا ہے، اور بنایا موسیٰ کی قوم نے موسیٰ کے پہاڑ پر جانے کے بعد اُن کے گھنوں سے بچھڑا مجسم کہ اُس کے لیے آواز تھی یعنی اُس میں سے آواز بھی نکلتی تھی۔

اور سورہ 'طہ' میں فرمایا ہے کہ اے موسیٰ کیا چین مجھ کو تیری قوم سے چھوڑا کر ایسی جلدی لے آئی۔ موسیٰ نے کہا کہ وہ لوگ میری پیروی پر ہیں اور میں جلد چلا آیا تیرے پاس تاکہ تو راضی ہو۔ خدا نے کہا کہ بے شک میں نے تیری قوم کو تیرے پیچھے آت میں ڈالا ہے اور سامری نے اُس کو گمراہ کیا ہے۔ پھر لوٹ آیا موسیٰ اپنی قوم کے پاس غصہ میں بھرا ہوا غمگین۔ کہا اے میری قوم کے لوگو کیا تمہارے پروردگار نے تم

وَمَا اَعْجَلَكُمْ عَنْ قَوْمِكُمْ يَا مُوسٰى قَالَ هُمْ اَوْلَاءُ عَلٰى اَثَرِى وَاَعَجَلْتِى الْيَوْمَ رَبِّ لِمَ تَرْضٰى قَالَ فَاَنَا قَدْ فُتِنَا قَوْمُكَ مِنْ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِى فَرَجَعَ مُوسٰى اِلٰى قَوْمِهِ غَضْبَانَ اَسْفًا قَالَ يَقَوْمِ الْمَ يَعِدُكُمْ رَبِّكُمْ وَعَدَا حَسَنًا اَفَطَالَ عَلَيْكُمْ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِىْ قَالُوا مَا اَخْلَفْنَا مَّوْعِدَكَ بِمَلِكِنَا وَلٰكِنَّا حَمَلْنَا اَوْ زَارًا مِّنْ زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا فَذٰلِكَ الْبَقِى السَّامِرِى فَاَخْرَجَ لَهُمْ عَجَلًا جَسَدًا لِّهٖ خَوَارٌ فَقَالُوا هٰذَا اِنَّهٗكُمْ وَاِلٰهَ مُوسٰى فَنَسِىْ اَفْلَا يَرَوْنَ اَلَا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًا وَلَا نَفْعًا وَلَقَدْ

قال لہم ہارون من قبل  
یا قوم انما فتنتم بہ وان  
ربکم الرحمن فاتبعونی  
واطیعوا امری قالوا لن  
نبرح علیہ عاکفین حتی  
یرجع الینا موسیٰ قال یا  
ہرون ما منعک اذرایتم  
ضلوا الا تتبعن افعضیت  
امری قال یا بنوؤم لا تاخذ  
بلحییتی و لا براسی انی  
خشیت ان تقول فرقت  
بین بنی اسرائیل ولم  
ترقب قولی قال فما خطبک  
یا سامری قال بصرت بما  
لم یبصروا بہ فقبضت  
قبضۃ من اثر الرسول فنبذتھا  
وکذلک سولت لی نفسی -

۲۰ - سورہ طہ ۸۵ لغایت ۹۶ - کہ یہ تمہارا پروردگار اور  
موسٰی کا پروردگار ہے پھر موسٰی بھول گیا ہے - کیا انہوں نے نہیں  
دیکھا کہ وہ پھر کر ان کی بات کا جواب نہیں دیتا اور نہ اس کے  
اختیار میں ان کے لیے ضرر پہنچانا ہے نہ فائدہ - بے شک اس سے  
پہلے ہارون نے ان سے کہا تھا کہ اے میری قوم تم اس کے  
سبب سے آفت میں پڑے ہو اور بے شک تمہارا پروردگار خداے  
مہربان ہے پھر تم میری پیروی کرو اور میرے حکم کو بجا لاؤ  
نہوں نے کہا کہ ہم تو اسی کے گرد بیٹھے رہیں گے جب تک

پھر ہمارے پاس موسیٰ آئے۔ جب موسیٰ آئے تو انہوں نے کہا اے ہارون کس چیز نے تجھ کو اس بات سے روکا کہ جب تو نے ان کو گمراہی میں دیکھا تو تو میری پیروی کرے کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی۔ ہارون نے کہا کہ اے میرے ماں جائے (بھائی) تم میری ڈاڑھی اور میرے سر کے بال مت پکڑو بے شک میں اس بات سے ڈرا کہ تم یہ نہ کہو تو نے تفرقہ ڈال دیا بنی اسرائیل میں اور میری بات کو نگاہ نہ رکھا۔ موسیٰ نے کہا اے سامری تیرا کیا حال ہے اس نے کہا مجھے ایسی بات سوجھی جو کسی کو وہ نہ سوجھی تھی پھر میں۔ رسول کے نقش قدم سے (یعنی حضرت موسیٰ کے نقش قدم سے جب کہ وہ پہاڑ کو جاتے تھے) مٹی کی مٹھی بھر لی پھر اس کو پھوٹے میں میں نے ڈال دیا اور اس طرح میرے نفس نے مجھ کو دھوکا دیا۔

قرآن کے لفظ ہم نے اس مقام پر لکھے ہیں اور ان کا مطلب بھی جو صاف صاف قرآن کے لفظوں سے نکلتا ہے لکھ دیا یا اب ہمارے عجائب پرست مفسروں نے اس پر لغو و بے ہودہ قصوں پر قصے باندھ دئے ہیں۔ پہلے تو یہ قرار دیا کہ اس پھوٹے میں اسی طرح کی آواز تھی جس طرح کہ سچ مچ کی اور خدا کی پیدا کی ہوئی پھوٹے میں آواز ہوتی ہے پھر ضرور ہوا کہ اس کا کوئی سبب بھی قرار دیں اس لیے ”الرسال“ کے لفظ سے تو جبرئیل مراد لیے۔ ”بصرت“ سے یہ معنی لیے کہ سامری نے جبرئیل کو دیکھا تھا اور اور کسی نے نہیں دیکھا تھا اور وہ کہاں عین اس وقت جب کہ بحر احمر سے بنی اسرائیل گذر رہے تھے اور فرعون تعاقب میں تھا اور فرعون کے لشکر اور بنی اسرائیل کے لشکر کے درمیان میں جبرئیل آگئے تھے اس وقت سامری نے ان کو دیکھا اور

پہچان لیا اور نہایت دور اندیشی سے اُن کی یا اُن کے گھوڑے کے (کیوں کہ بعض مفسرین کے نزدیک اُس وقت گھوڑے پر چڑھے ہوئے تھے) پاؤں تلے کی مٹی اُٹھا لی کہ کسی وقت کام آوے گی اور یہاں اُس کو کام میں لایا اور بچھڑے کے منہ میں ڈال دی وہ سچ سچ خدا کے پیدا کئے ہوئے بچھڑے کی مانند بولنے لگا۔

ان خرافات و لغویات کا کچھ ٹھکانا ہے؟ کیسے جبرئیل؟ وہ کہاں تھے؟ کجا سمندر؟ کہاں کی بات کہاں لے دوڑے سمندر میں جبرئیل کا آنا کیسا اُن کا گھوڑے پر سوار ہونا کیسا اللہ کے رسول یعنی موسیٰ وہاں موجود تھے جن کی طرف صاف اشارہ ہے ہمارے مفسرین خدا اُن کو بخشے اُن کو چھوڑ کر سمندر میں جا ڈوبے۔

ایک لفظ بھی قرآن مجید کا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ اُس بچھڑے میں سچ سچ کی اور خدا کے پیدا کیے ہوئے بچھڑے کی مانند آواز تھی بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سامری نے اُس بچھڑے کو اس طرح بنایا تھا کہ اُس میں سے آواز بھی نکلتی تھی ہزاروں جانور اب بھی کاریگر اس طرح سے بناتے ہیں کہ وہ اُڑتے ہیں ہلتے ہیں حرکت کرتے ہیں بولتے ہیں۔ سامری نے بھی اُس بچھڑے کو ایسی کاریگری سے بنایا تھا کہ اُس میں سے آواز بھی نکلتی تھی میدھے مطلب کو ٹیڑھا کرنا ہمارے مفسروں کی عجائب پرستی اور یہودیوں کی تقلید کے سوا کچھ نہیں ہے مذہب اسلام اور خدا کا کلام یعنی قرآن مجید ان سب لغویات سے پاک ہے۔

یہی قول معتزلی عالموں کا بھی ہے چنانچہ تفسیر کبیر میں وقال اکثر المفسرین لکھا ہے کہ۔ اکثر معتزلی من المعتزلة انه كان قد جعل ذاك المعجل مجوفاً سامری نے وہ بچھڑا اندر سے

کھوکھلا بنایا تھا اور اُس کے اندر نلیاں لگائی تھیں اُن سے آواز بچھڑے کی آواز کے مشابہ نکلتی تھی اور اور مفسروں نے یہ کہا کہ وہ مورت کھوکھلی تھی اور جہاں وہ بچھڑا کھڑا کیا گیا تھا اُس کے نیچے ایک ایسا مقام تھا جہاں ایک شخص کھڑا ہو کر اُس میں پھونکتا تھا اور لوگ اُس کو نہیں جانتے تھے اُس کے پیٹ میں سے بچھڑے کی مانند آواز سنتے تھے۔ اس قول کے قائل نے کہا کہ اب بھی لوگ اُن مورتوں میں جن میں پانی کے فوارے چھوٹتے معلوم ہوتے ہیں اور اسی قسم کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں ایسا ہی کرتے ہیں۔ پس اسی طرح اُس بچھڑے کی مورت سے آواز نکلتی تھی پھر لوگوں کو بتایا کہ یہ بچھڑا اُن کا خدا اور موسیٰ کا خدا ہے۔

تفسیر مجمع البیان میں لکھا ہے کہ جبائی نے بچھڑے کی آواز کی نسبت بیان کیا ہے

ووضع فی جوفہ الانابیب ویظہر منه صوت مخصوص یشبہ خوار العجل و قال آخرون انه جعل ذلک التمثال اجوف وجعل تحتہ فی الموضع الذی نصب فیہ العجل من ینفخ فیہ من حیث لا یشعریہ الناس فسمعوا الصوت من جوفہ الخوار۔ قال صاحب هذا القول والناس قد یفعلون الان فی هذه التصاویر التی یجرون فیہ السماء علی سبیل الفوارات و ما یشبہ ذلک فیہذا الطريق وغیرہ اظہر الصوت من ذلک التمثال ثم التقی لی الناس ان هذه العجل الهمم والہ موسیٰ۔

(تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ

۳۰۱)۔

تاول الخوار علی ان

السامری صاغ عجلا وجعل فیہ خروقا یدخله الریح فیخرج منها صوت الخوار

و دعا ہم الی عبادتہ کہ سامری نے بچھڑا بنایا اُس  
فاجابوہ و عبدوہ - عن کو اندر سے خالی رکھا اس میں  
الجبائی - ہوا جاتی تھی پھر اُس سے

و قیل انہ اخنال بچھڑے کی آواز کی مانند آواز  
با دخال التریح کما یعمل نکلتی تھی اور اُس نے لوگوں  
ہذہ الالات التی تصوف سے اُس کی پوجا کرنے کو کہا  
بالجبیل عن الزجاج و الجبائی اُن لوگوں نے مان لیا اور اُس  
و البلخی (تفسیر مجمع البیان) - کی پوجا کی -

اور اُسی تفسیر میں زجاج اور جبائی اور بلخی کا قول ہے کہ  
سامری نے بچھڑے میں ہوا کے بھر دینے سے فریب کیا تھا جس  
طرح اس قسم کی چیزیں دھوکا دینے کے لیے بنائی جاتی ہیں -

بات صرف اس قدر ہے کہ مصر میں رہنے سے بنی اسرائیل  
کے دل میں بت پرستی کا خیال جا ہوا تھا وہ چاہتے تھے کہ اُن  
کے لیے کوئی دیوتا بنایا جاوے حضرت موسیٰ سے بھی اُنہوں نے  
چاہا تھا کہ اُن کے لیے ایک دیوتا بناویں اُنہوں نے اُن کو  
دھمکا دیا جب وہ پہاڑ پر چلے گئے تو حضرت ہارون کا اتنا خوف  
اُن کو نہ تھا اُن کے منع کرنے سے اُنہوں نے نہ مانا - مصر میں  
ایک دیوتا تھا جس کا نام ”نیوس“ تھا اور اُس کی  
صورت بچھڑے جیسی تھی اُسی صورت کا اُنہوں نے بچھڑا بنایا اور  
بنانے والے نے اُس میں ایسی ترکیب رکھی کہ اُس ترکیب سے  
بچھڑے میں آواز نکلتی تھی اور لوگوں کو دھوکا و فریب دینے  
کے لیے حضرت موسیٰ کے پاؤں تلے کی مٹی حقیقہ یا صرف دھوکا  
دینے کو اُس مٹی کو حضرت موسیٰ کے پاؤں تلے مٹی کی بیان  
کر کے بچھڑے میں ڈال دی - خود قرآن مجید میں سامری کا قول  
منقول ہے کہ - کذلک سولت لی نفسی - یعنی اس طرح اُس کے



نفس نے دھوکا دیا ۔

اس مقام پر قابل غور یہ بحث ہے کہ بچھڑا بنانے والا کون تھا توریت میں لکھا ہے کہ خود حضرت ہارون بچھڑا بنانے والے تھے اور خود انہوں نے ہی بچھڑے کی پرستش کروائی ۔ مگر جب ہم خود توریت کے مضامین پر خیال کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے ہارون کو بھی برکت دی تھی اور تمام احکام جو خدا نے موسیٰ کو دئے تھے ان کی حضرت ہارون ہی تعمیل کرتے تھے بلکہ حضرت موسیٰ تو صرف نام ہی کے تھے خدا کے تمام احکام بذریعہ حضرت ہارون پورے ہوتے تھے تو ہم اس بات کو کہ حضرت ہارون اس بچھڑے کے بنانے والے اور بت پرستی کی اجازت دینے والے تھے جیسا کہ توریت میں لکھا ہے صحیح تسلیم نہیں کر سکتے ۔ یہ بات ممکن ہے کہ یہ بچھڑا اس زمانہ میں بنایا گیا جب کہ حضرت موسیٰ پہاڑ پر تھے اور حضرت ہارون کو تمام بنی اسرائیل پر سردار کر گئے تھے اور ان کے عہد سرداری میں یہ بچھڑا بنا اس لیے حضرت ہارون کی طرف منسوب کیا گیا ۔ مگر یہ بات کہ خود حضرت ہارون اس کے بنانے والے تھے یہ بات کسی طرح صحیح متصور نہیں ہو سکتی ۔

قرآن مجید نے صاف صاف بتا دیا کہ حضرت ہارون نہیں بلکہ سامری اس کا بنانے والا تھا ۔ ہمارے مفسرین کی جیسی عادت ہے کہ تفسیروں میں رطب و یابس صحیح و غلط روایتیں بھر دیتے ہیں اسی طرح سامری کی نسبت بھی روایتیں بھر دی ہیں جن میں سے بعض کی کچھ اصلیت بھی ہے مگر ٹھیک طور پر بیان نہیں کیں اور بعضوں نے نہایت غلطی سے سامری خاص نام بنانے والے کا سمجھا ہے جو صریح غلط ہے ۔

عیسائی علما نے یہ بات چاہی ہے کہ قرآن مجید کی غلطی

ثابت کریں مسٹر سلیڈن نے کہا کہ دراصل ہارون اور سامری ایک ہی شخص ہے نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلطی سے ان کو دو سمجھا ہے۔ سمر یا شامر عبری لفظ ہے اور اس کے معنی محافظ کے ہیں اور جب کہ موسیٰ پہاڑ پر گئے تھے تو ہارون بنی اسرائیل کے محافظ ہوئے تھے اور اس لیے وہی شامر تھے۔

مگر مسٹر سلیڈن کا یہ قیاس محض غلط ہے اس لیے کہ اگر یہ لفظ قرآن مجید میں اخذ کیا جاتا تو اس کے ساتھ یا ئے نسبت کسی طرح نہیں آ سکتی تھی اور اگر وہ علم یعنی خاص شخص کا نام متصور ہوتا تو اس پر الف لام لازم نہیں آ سکتا تھا حالاں کہ قرآن مجید میں یا ئے نسبت اور الف لام دونوں موجود ہیں یعنی ”السامری“ آیا ہے پس یہ دونوں خیال محض غلط ہیں۔

صحیح امر جس کو ہمارے مفسرین نے بھی بیان کیا ہے یہ ہے کہ بچھڑے کا بنانے والا سمارتن والوں کا ایک شخص تھا جس کا نام بیان نہیں ہوا پس ”السامری“ کے معنی یہ ہیں کہ ”رجل من الذین ہم السامرة“ مسٹر سیل نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس زمانہ میں سمارتن قوم موجود نہ تھی بلکہ اس کے بہت زمانہ بعد وہ قوم بنی تھی۔

مگر اس اعتراض میں غلطی ہے قرآن مجید کے الفاظ سے اس وقت یہی نام ہونا لازم نہیں آتا۔ بنی اسرائیل کے بارہ سبط تھے اور سب ایک سلطنت کے ماتحت تھے۔ مگر جب ”رجعام“ حضرت سلیمان کا بادشاہ ہوا تو بنی اسرائیل کے دس سبط نے اس سے بغاوت کی۔ ”یا ربعام“ پسرنباط کو اپنا بادشاہ بنایا اس نے اپنے ملک میں بمقام بیت ایل اور دان کے سونے کے بچھڑے بنائے (دیکھو اول سلاطین باب ۱۲ ورس ۲۸ و ۲۹) اور ان کی پرستش شروع کی۔

جب کہ ”عمری“ اُن لوگوں پر بادشاہ ہوا تو اُس نے کوہ شومون کو اُس کے مالک سے جس کا نام ”شمر“ تھا خرید لیا اور وہاں شہر بنایا جو دارالخلافہ ہو گیا (دیکھو اول سلاطین باب ۱۶ ورس ۲۳ لغایت ۲۵) اور اسی سبب سے وہ لوگ سہارتن یا شامری یا سامری مشہور ہوئے اور وہ قوم جس میں کے شخص نے بنی اسرائیل کے لیے بچھڑا بنایا تھا قرآن مجید کے بہت پہلے سے سامری کے نام سے کہلاتی تھی۔ قرآن مجید میں السامری کہنے سے صرف یہ اشارہ ہے کہ اُس کا بنانے والا اُس قوم میں سے تھا جنہوں نے آخرکار یا ربحام کی اطاعت کر کے سونے کے بچھڑوں کی پرستش کی تھی اور جو لوگ سامری یعنی سہارتن کے لقب سے مشہور ہیں۔

جو لوگ کہ توریت کے اُن مقامات کو جو قرآن مجید کے بیان کے مخالف ہیں قرآن مجید کی غلطی ثابت کرنے کو پیش کرتے ہیں اُن کو ایسی جرأت کرنے سے پہلے توریت کے تمام مضامین مندرجہ کی صحت ثابت کرنی چاہیے اور اُن کو اس بات کا بھولنا نہیں چاہیے کہ اب تک یہ بھی تحقیق نہیں ہوا ہے کہ موجودہ توریت کس نے لکھی اور کب لکھی گئی خود توریت سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے مضامین یاد سے اور کچھ تحریروں سے اخذ کیے گئے ہیں اور بہت سی باتیں جو اُس زمانہ میں جب کہ وہ لکھی گئی یہودیوں میں مشہور یا مروج تھیں وہ بھی اُس میں داخل کی گئی ہیں اور جو مضامین اس میں داخل ہیں وہ ایسے افسانہ آمیز ہیں کہ جب تک اُن افسانوں کو علیحدہ نہ کیا جاوے اصل واقعہ پر کسی طرح یقین نہیں ہو سکتا۔ بشپ نیٹال نے جو کچھ اس کی نسبت لکھا ہے اُس کو بھی بھولنا نہیں چاہیے پس یہ امر کہ کوئی واقعہ جو توریت کے برخلاف ہو وہ صحیح نہیں ہے اُس کو کوئی

ذی عقل تسلیم نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ توریت میں احکام الہی بھی مندرج ہیں اور وہ ”فیہا ہدی و نور“ کہنے کے مستحق ہیں اور تاریخی واقعات بھی ہیں جو غلطی سے پاک نہیں۔

### پانزدہم۔ ستر آدمیوں کا منتخب کرنا

قرآن مجید میں ایک جگہ یہ بیان ہوا ہے کہ موسیٰ کی قوم و اذ قلتہم یا موسیٰ نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ لن نومن لک حتی نری اللہ جہرۃ فاخذتکم الصاعقہ و انتہم تنظرون۔ خدا کو نہ دیکھ لیں اور سورہ

(سورۃ بقرہ آیت ۵۲) اعراف میں فرمایا ہے کہ موسیٰ واختار موسیٰ قومہ و سبعین رجلا لمیقاتنا۔ وعدہ کی جگہ لے جانے کے لیے (سورہ اعراف آیت ۱۵۴) منتخب کیا۔

حضرت موسیٰ نے بھی بحالت ذہول خدا سے کہا تھا کہ ”رب ارنی انظہر الیک“ خدا نے جواب دیا ”لن ترانی و لکن انظرالی الجبل“۔ بنی اسرائیل نے بھی حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہمیں خدا دکھلا دو حضرت موسیٰ پر یہ واقعہ خود گذر چکا تھا اور وہ جان چکے تھے کہ خدا کا دیکھنا محال ہے بلکہ صرف خدا کے وجود پر ایقان ہی خدا کا دیدار ہے اور خدا کے وجود پر ایقان اس کی عجائب مخلوقات پر غور و فکر کر۔ اس کے دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ خدا نے حضرت موسیٰ کو بھی اس عجیب ہیبت ناک آتشین پہاڑ کی طرف خدا پر ایقان لانے کے لیے متوجہ کیا تھا اسی طرح حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل میں سے ستر آدمیوں کو خدا کی اس قدرت کاملہ اور تجلی شان دکھانے کو منتخب کیا تاکہ ان کو بھی ایقان وجود باری

عزاسہ پر حاصل ہو ۔

خدا کا دیکھنا دنیا میں نہ ان آنکھوں سے ہو سکتا ہے اور نہ ان آنکھوں سے جو دل کی آنکھیں کہلاتی ہیں اور نہ قیامت میں کوئی شخص خدا کو دیکھ سکتا ہے وہ بیچون و بیچگون ہے کسی حیز و صورت میں آنے کے قابل ہی نہیں ہے پھر وہ کیوں کر دنیا میں یا عقبی میں دکھائی دے سکتا ہے ۔ بہت سے عابد و زاہد دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے آنکھوں سے دنیا ہی میں خدا کو دیکھا ہے ۔ بہت سے کہتے ہیں کہ ان آنکھوں سے نہیں بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے ۔ انہوں نے دیکھا دکھایا کچھ نہیں بلکہ خود انہی کا خیال یا ایقان ہے جو انہوں نے دیکھا ہوگا عقبی میں اگر خدا کا دیکھنا تسلیم کیا جاوے تو وہ بھی خدا کا دیکھنا نہ ہوگا بلکہ خود انہی کا ایقان ان کو دکھائی دے گا نہ خدائے بیچون و بیچگون و بے مثل و بے نمون ۔

علمائے ظاہر جو اس مسئلہ کی حقیقت نہیں سمجھتے صرف لفظوں پر بحث کیا کرتے ہیں وہ اس مسئلہ کی حقیقت کے سمجھنے کے لائق ہی نہیں ہیں ۔ ہاں علمائے ربانی جنہوں نے اپنے نفس پر اور انسان کے نیچر پر غور کی ہے ان کی سمجھ اس مسئلہ کی نسبت علمائے ظاہری کی سمجھ سے زیادہ اعتبار کے قابل ہے اور ان میں سے بھی بالخصوص ان کے جو باوجود علم باطنی کے علم ظاہری میں بھی بہت بڑا درجہ کمال کا رکھتے تھے ۔ اس مسئلہ کی تحقیق میں مرشدنا و مولانا عالم ربانی حضرت شیخ احمد سر ہندی نقش بندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ فرمایا ہے مجسہ اس مقام پر لکھا جاتا ہے ،

حضرت ممدوح قدس سرہ نے جلد سوم مکتوب نوزدہم جو بنام فقیر ہاشم کشمی لکھا ہے اور جس میں در باب کیفیت مشاہدہ

قلب عرفا حق جل و علا کو سوال کیا گیا تھا اس طرح ارقام فرمایا ہے ”پرسیدہ بودند کہ بعضی از محققان صوفیہ اثبات رویۃ و مشاہدہ او تعالیٰ بدیدہ دل در دنیا مے فرمایند کما قال الشیخ العارف فی کتابہ العوارف - موضع المشاہد بصر القلب الخ و شیخ ابو اسحاق کلاً بادی قدس سرہ کہ از قد مائے این طائفہ علیہ است و از رؤ سائے ایشان در کتاب تعرف آرومے اجمعوا علیٰ انہ تعالیٰ لا یرى فی الدنیا بالابصار ولا بالقلوب الا من جهة الایقان توفیق میان این دو تحقیق چیست و رائے تو بر کدام و اجاع باوجود اختلاف بچہ معنی است - بدان ارشدک اللہ تعالیٰ کہ مختار این فقیر درین مسئلہ قول صاحب تعرف است قدس سرہ و میداند کہ قلوب را درین نشا ازاں حضرت جل سلطانہ غیر از ایقان نصیب نیست آن را رویۃ انگارند یا مشاہدہ و چون قلب را رویۃ نبود ابصار را چہ بود کہ او درین نشا در این معاملہ بیکار و معطل است غایۃ ما فی الباب معنی ایقان کہ قلب را حاصل شدہ است در عالم مثال بصورت رویۃ ظاہر مے شود و موقن بہ صورت مرئی چہ در عالم مثال ہر معنی را صورتیست مناسب و چون در عالم شہادت کمال یقین در رویۃ است آن ایقان نیز بصورت رویۃ در مثال ظاہر مے گردد و چون ایقان بصورت رویۃ ظاہر شود متعلق آنکہ موقن بہ است ناچار بصورت مرئی آنجا ظاہر گردد و چون سالک آن را در مرأت مثال مشاہدہ مے نماید از توسط مرأت ذاہل گشتہ و صورت را حقیقت دانستہ مے انگارد کہ حقیقت رویتے او را حاصل گشتہ است و مرئی پیدا آمدہ نمے داند کہ آن رویت صورت ایقان اوست و آن مرئی صورت موقن بہ او - این از اغلاط صوفیہ است و از تلبسات صور بمقائق - و ہمیں دید چون غالب می آید و از باطن بظاہر مے تراود سالک را در ہم مے اندازد کہ رویۃ بصری نیز حاصل

گشت و مطلوب از گوش به آغوش آمد نمیداند که حصول این معنی چون دراصل که بصیرت است نیز مبنی بر تو هم و تلبس است به بصر که درین نشا فرع او است چه رسد و رویت او را از کجا حاصل شود در رویت قلبی جم غفیر از صوفیه در تو هم افتاد افتاده اند و حکم بو قوع آن کرده و در رویت بصری مگر نا قصه ازین طائفه در تو هم وقوع آن افتاده باشد که مخالف اجاع اهل سنت و جماعت است شکر الله سعیم -

سوال موقن به را چون صورت در مثال پیدا شد لازم آمد که حق را سبحانه آنجا صورت بود -

جواب تجویز نموده اند که حق را سبحانه هر چند مثل نیست اما مثال است و روا داشته اند که در مثال بصورتی ظهور فرماید چنانچه صاحب فصوص قدس سره رویت اخروی را نیز بصورت جامعه لطیفه مثالبه مقرر ساخته است و تحقیق این جواب آنست که آن صورت موقن به صورت حق نیست سبحانه در مثال بلکه صورت مکشوف صاحب ایقان است که ایقان او بآن تعلق گرفته است و آن مکشوف بعضی وجوه و اعتبارات ذات حق است سبحانه نه ذات حق جل و علا لهذا چون معامله عارف بذات میرسد جل سلطانه این قسم تخیلات پیدا نمی شود و هیچ رویت و مرئی متخیل نمی گردد و چه ذات اقدس سبحانه را در مثال صورتی کائن نیست تا آنرا بصورتی مرئی و نماید و ایقان آنرا بصورت و نماید یا آنکه گوئیم در عالم مثال صور معانی است نه صورت ذات و چون عالم بتامه مظاهر اسماء و صفات است و از ذاتیه بهره ندارد و چنانچه تحقیق آن را در مواضع متعدد نموده ایم پس ناچار بتامه از قسم معانی باشد و در مثال آنرا صورتی کائن بود و در کمالات و جوی هر جا صفت و شان است که قیام بذات وارد از قبیل معانی است که اگر آن را در مثال صورتی

بود و او بالنقض گنجایش دارد اما ذات او را سبحانه حاشا که در مرتبه از مراتب صورت بود چه صورت مستلزم تهدید و تقیید است در هر مرتبه که باشد مجوز نیست مراتب همه که مخلوق اویند سبحانه کجا گنجایش دارند که خالق را محدود و مقید سازند هر که تجویز مثال در آن حضرت جل شانه نموده است باعتبار وجوه و اعتبارات است نه باعتبار عین ذات تعالی و هر چند تجویز مثل در وجوه و اعتبارات حضرت ذات تعالی هم برین فقیر گران است مگر آنکه در ظلّی از اظلال بعیده آن تجویز نموده آید ازین بیان واضح گشت که در عالم مثال ارتسام صور معانی و صفات را کائن است نه ذات تعالی را پس آن چه صاحب فصوص تجویز رویت اخروی بصورت مثالیّه نموده است چنان چه گذشت آن رویت حق نیست تعالی بلکه رویت صورت حق هم نیست سبحانه چه او را سبحانه صورته نیست تا رویت بآن تعلق پیدا کند و اگر در مثال صورته هست ظلّی از اظلال بعیده او را کائن است پس رویت آن رویت حق چرا باشد سبحانه شیخ قدس سره در نفی رویت حق جل و علا از معتزله و فلاسفه هیچ کم پائی نمی کند بلکه اثبات رویت بر نهجی می نماید که مستلزم نفی رویت است و آن ابلغ در نفی است از صریح نفی لان الکنایة ابلغ من التصریح قضیه مقرر است این قدر فرق است که مقتدائے آن جماعت عقل شان است و مقتدائے شیخ کشف بعید از صحت مانا که اوله غیر تا مه مخالفان که در متخیله شیخ نشسته بود کشف او را نیز درین مسئله از صواب منحرف گردانیده است و مائل بمذهب شان ساخته چون از اهل سنت بود صورت اثبات نموده است و بآن اکتفا کرده و آن را رویت انکاشته ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا و تحقیق این مسئله ذقیقه که در حل بعض از مواضع کتاب عوارف نوشته است نیز تحریر یافته است و آن چه



از اجاع پرسیدہ بودند تواند بود کہ تا آن وقت خلافہ کہ شایان  
اعتداد باشد بظہور نیامدہ باشد یا اجاع مشائخ عصر خود خواستہ  
باشد واللہ سبحانہ اعلم بحقیقہ الحال - انتہی -

شانزدہم - ذکر استسقائے قوم موسیٰ - ہفدہم -  
سایہ کرنا ابرکا - ہیزدہم - من وسلوی کا آترنا  
نوزدہم - دخول باب

یہ چاروں موضوع سرسید نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے  
متعلق اپنے ایک دوسرے مضمون میں جو اس کے بعد نقل کیا  
جا رہا ہے - درج کر دیے ہیں - لہذا یہ آخر کی چاروں بحثیں اگلے  
مضمون میں ملاحظہ فرمائیں - اختصار کے لحاظ سے یہ چاروں باتیں  
یہاں چھوڑ دی گئی ہیں - (محمد اسماعیل پانی پتی)

## قصہ موسیٰ علیہ السلام کا

حضرت موسیٰ کے جو واقعات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں وہ سورہ بقرہ، نسا، مائدہ، انعام، اعراف، یونس، ہود، بنی اسرائیل، کہف، مریم، طہ، مومنین، شعرا، نمل، قصص، صافات، مومن، زخرف، دخان، نازعات، یس سورتوں میں آئے ہیں۔ ان میں مکرر بھی مضامین بیان ہوئے ہیں اور کسی میں کسی جگہ کا واقعہ بیان ہوا ہے کسی میں کسی جگہ کا۔ ہم ان تمام آیات اور الفاظ کو منتخب کر کر بہ ترتیب موسیٰ کے قصہ کو مع ترجمہ حاشیہ میں لکھ دیتے ہیں تاکہ تمام قصہ جس قدر قرآن مجید میں ہے بلفظہ بہ ترتیب معلوم ہو جاوے اور پھر ایک آیت کے مطلب کو اس کے مناسب مقام پر بیان کریں گے۔

ہم ٹھیک تجھ کو سنا دیں ایمان والوں کے لیے موسیٰ و فرعون کی کچھ خبریں فرعون دنیا میں بہت بڑھ گیا تھا اور مصر کے رہنے والوں کو گروہ گروہ بتا دیتا تھا اور ان میں سے ایک گروہ کو زبوں حالت میں پہنچا دیتا تھا۔ ذبح کر ڈالتا تھا ان کے بیٹوں کو اور جیتا رہنے دیتا تھا ان کی بیٹیوں کو اور وہ مفسدوں میں سے تھا۔ فرعون والے بنی اسرائیل کو بری طرح کے عذاب پہنچاتے تھے۔ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو مار ڈالتے تھے

(۱) نلتوا علیک من نباء موسیٰ و فرعون بالحق لبقوم یومنون ان فرعون علی فی الارض وجعل اهلها شیعاً یتضعف طائفۃ منہم یدبح ابناء ہم ویستحیی نساء ہم انه کان من المفسدین (قصص) یسومونکم (آل فرعون) سوء العذاب (بقرہ) یقتلون (اعراف) یدبحون ابناء کم و یتستحیون نساء کم و فی

سورہ بقرہ میں جو واقعات حضرت موسیٰ کے بیان ہوئے ہیں ان میں سے واقعہ عبور بحر اور غرق فرعون قابل غور کے ہے اول

(بقیہ حاشیہ)

ذبح کر ڈالتے تھے اور ان کی بیٹیوں کو جیتا رہنے دیتے تھے اور اس میں بنی اسرائیل پر ان کے پروردگار کی طرف سے بڑی بلا تھی۔ ہم نے ان پر جو دنیا میں کمزور ہو گئے تھے مہربانی کرنی چاہی اور ان کو سردار بنانا اور ان کو وارث بنانا اور زمین پر قدرت والا ٹھہرانا اور فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں کو جس بات سے وہ ڈرتے تھے ان کے ہاتھ سے دکھلانا چاہا۔ ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈالی کہ موسیٰ کو دودھ پلاوے جب اس کو موسیٰ کے مارے جانے کا خوف ہو تو اس کو ایک صندوق میں رکھ دے پھر اس کو ڈال دے پھینک دے دریا میں پھر دریا میں اس کو کنارہ پر ڈال دے گا۔ اس کو اٹھا لے گا میرا دشمن اور اس کا دشمن اور تو مت ڈر اور نہ غمگین ہو ہم اس کو پھر تیرے پاس لوٹا دیں گے اور اس کو رسولوں میں سے کریں گے۔ (جب موسیٰ کی ماں نے ان کو دریا میں ڈال دیا اور وہ صندوق کنارہ پر آ لگا) تو فرعون کے لوگوں میں سے کسی نے اس کو اٹھا لیا۔ موسیٰ کی بہن نے دور سے اس کو دیکھا اور فرعون

ذالکم بلاء من ربکم عظیم (بقرہ) نریدان تمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلہم الوارثین و نمکن لہم فی الارض و نری فرعون و ہامان و جنودہما منہم ما کانو یحذرون (قصص) - و اوحینا الی ام موسیٰ ان ارضیہ فاذا خفت علیہ (قصص) اقد فیہ فی التابوت (طہ) فالقیہ (قصص) فاقد فیہ فی الیم فلیلقہ الیم بالساحل یا خذہ عدوی و عدولہ (طہ) ولا تخافی و لا تحزنی انا رادوہ الیک و جاعلوہ من المرسلین فالتقطہ آل فرعون (قصص) فبصرت (ای اخت موسیٰ) بہ عن جنب و ہم لا یשמعون (قصص) قالت امراة فرعون قرة عین لی و لک لا تقتلوہ عسی ان ینفعنا او نتخذہ ولدا (قصص) و حرمنا علیہ المراضع من قبل فقالت

تو بہت لوگوں نے یہ غلطی کی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ  
حضرت موسیٰ نے دریائے نیل سے عبور کیا تھا یہ بالکل غلط ہے

(بقیہ حاشیہ)

هل اذلكم على اهل بيت  
يكفلونہ لكم و ہم له

ناصرحون فزددنه الى امهلى تنقر عاينها ولا تحزن - (قصص)

ولما بلغ اشدہ واستوى  
(قصص) دخل المدينة على  
حين غفلة من اهلها فوجد  
فيها رجلين يقتتلان هذا  
من شيعته وهذا من عدوه  
فاستغاثه الذي من شيعته  
على الذي من عدوه فوكره  
موسىٰ ففضى عليه (قصص)  
فاصبح في المدينة خائفاً  
يتربص فاذا الذي استنصره  
بالاس يستصرخه قال له  
موسىٰ انك لغوى مبين  
فلما ان اراد ان يبطش بالذي  
هو عدولهما قال يا موسىٰ  
اتريد ان تقتلني كما قتلت  
نفسا بالاس - (قصص)

وجاء رجل من اقصى  
المدينة يسعى قال يا  
موسىٰ ان الملاء يا تمررون  
بك ليقتلوك فاخرج اني  
لك من الناصحين فخرج  
منها خائفاً يتربص قال  
رب نجني من القوم الظالمين  
(قصص) -

والے نہیں جانتے تھے -  
فرعون کی عورت بولی کہ یہ تو  
میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک  
ہے اس کو مت مارو شاید اس سے  
ہم کو نفع ہو اور ہم اس کو بیٹا  
بنا لیں ہم نے پہلے ہی پلائیوں کا  
دودھ اس پر حرام کر دیا تھا -  
موسیٰ کی بہن بولی کہ کیا میں تم  
کو ایسی گھر والی بتا دوں جو  
تمہارے لئے اس کو پالے اور اس کو  
اچھی طرح رکھیں (اس نے موسیٰ  
کی ماں ہی کو بتایا) پھر ہم نے  
موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس ہی  
لوٹا دیا تاکہ اس کی آنکھوں کو  
ٹھنڈک رہے اور غمگین نہ ہو - جب  
موسیٰ چاق چوبند ہوا تو شہر  
والوں کی بے خبری میں شہر میں  
گیا وہاں اس نے دو آدمیوں کو  
مارتے مارتے پایا - ایک تو موسیٰ کی  
قوم کا تھا اور ایک اس کے دشمنوں  
میں سے تھا موسیٰ کی قوم والے نے اس  
کے دشمنوں کی فریاد کی موسیٰ نے  
اس کو گھونسا مارا کہ وہ مر گیا -  
پھر شہر ہی میں ڈرتے ہوئے اور  
کسی خرابی کے آنے کی توقع میں

بلکہ انہوں نے بحر احمر کی ایک سے عبور کیا تھا۔ تمام مفسرین حضرت موسیٰ کے عبور اور فرعون کے غرق ہونے کو بطور ایک ایسے معجزے

(بقیہ حاشیہ)

صبح کی جس مدد موسیٰ نے کل کی تھی اور اس نے موسیٰ کو پکارا موسیٰ نے اسے کہا تو ہی علانیہ جھگڑالو ہے پھر موسیٰ نے اس کے جو اس کا اور موسیٰ کا بھی دشمن تھا پکڑنے کا ارادہ کیا (جو چلایا تھا وہ یہ سمجھا کہ موسیٰ مجھی کو پکڑے گا) کہا اے موسیٰ کیا تو میرے مار ڈالنے کا بھی ارادہ کرتا ہے جس طرح کہ کل تو نے ایک آدمی کو مار ڈالا ہے۔ اتنے میں ایک آدمی شہر کے پرلے کنارے سے دوڑنا آیا کہا اے موسیٰ فرعون کے درباری تیری نسبت مشورہ کرتے ہیں کہ تجھ کو مار ڈالیں پس یہاں سے نکل جا میں تیرا خیر خواہ ہوں۔ پھر موسیٰ ڈرتا ہوا اور کسی آفت کی توقع کرتا ہوا وہاں سے نکلا اور کہا اے پروردگار اس ظالم قوم سے مجھے بچا۔ موسیٰ نے اپنے ساتھی جوان سے (غالباً اسی شخص سے جس نے آ کر قتل کے مشورہ کی خبر دی تھی) کہا کہ میں ٹھہرنے کا ہی نہیں جب تک دو دریاؤں کے ملنے کے مقام تک نہ پہنچ جاؤں یا چلا جاؤں گا بہت دنوں تک (یعنی اس

قال موسیٰ لفتاہ لا ابرح حتی ابلغ مجمع البحرين او امضی حقبا فلما بلغ مجمع بینہما نسیا حوتہما فاتخذ سبیلہ فی البحر سربا فلما جاوزا قال لفتاہ اتیناہ غدائنا لقد لقینا من سفرنا هذا نصیبا قال ارایت اذا وینا الی الصخرۃ فانی نسیت الحوت وما انسانیہ الا الشیطن ان اذکرہ واتخذ سبیلہ فی البحر عجبا قال ذالک ما کننا نبغ فارتد علی آثارہما قصصا فوجدا عبدا من عبادنا اتیناہ رحمۃ من عندنا وعلمنہا من لدنا علیا قال لہ موسیٰ هل اتبعک علی ان تعلمن مما علمت رشدا قال انک لن تستطیع معی صبرا وکیف تنصیر علی ما لم تحط بہ خبرا قال ستجدنی ان شاء اللہ صابرا ولا اعصی لک امرًا قال فان اتبعنی لا تسألنی عن شیء حتی

کے قرار دیتے جو خلاف قدرت واقع ہوا ہو جس کو انگریزی میں سپر نیچرل کہتے ہیں کہ اور یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے سمندر

(بقیہ حاشیہ)

سے بھی پرے) - پھر وہ جب دونوں دریاؤں کے ملنے کے مقام تک پہنچے تو اپنی مچھلی وہاں رکھ کر بھول گئے پھر مچھلی نے خشک جگہ میں سے دریا کا رستہ لیا پھر جب وہ اس سے آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے ساتھی جوان سے کہا کہ ہمارا صبح کا کھانا لاؤ ہم نے تو اس سفر میں بڑی مصیبت اٹھائی اس جوان نے کہا کہ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب ہم اس پتھر سے تکیہ لگا کر بیٹھے تو میں اس مچھلی کو بھول گیا (یعنی اس کا خیال نہ رہا) اور اس قصہ کا ذکر کرنا (یعنی موسیٰ سے) بجز شیطان کے کسی نے مجھ کو نہیں بھلایا اور مچھلی نے عجب طرح سے دریا میں اپنا رستہ لیا موسیٰ نے کہا یہی ہے جو ہم چاہتے تھے (یعنی دونوں دریاؤں کے ملنے ہی تک ہم آنا چاہتے تھے اب آگے کیوں جاویں) پھر وہ دونوں اپنے قدموں کا نشان دیکھتے ہوئے آٹے پھرے پھر آن دونوں بندوں کو میرے بندوں میں سے ایک بندہ ملا جس پر میں نے اپنی مہربانی کی تھی اور اس کو میں نے دانش مندی سکھا دی تھی

احدث لکب منہ ذکرنا فانطلقا حتی اذا رکبنا فی السفینۃ خرقہا قال اخرقتها لتغرق اهلها لقد جئت شیئاً امرا قال الم اقل انک لن تستطیع معی صبرا قال لا تو اخذنی بما نسیت ولا ترهقنی من امری عمرا فانطلقا حتی اذ لقیانا غلاما فقتله قال اقلت نفسا زکیۃ بغیر نفس لقد جئت شیئاً نکرا قال الم اقل لک انک لن تستطیع معی صبرا قال ان سالتک عن شیء بعدھا فلا تصبا جننی قد بلغت من لدنی عذرا فنا نطلقا حتی اذا اتینا اهل قرية استطعنا اهلها فابو ان یضیفو لہما فوجدا فیہا جدار یریدان ینقض فاقامہ قال لوشئت لتخذت علیہ اجرا قال ہذا فراق بینی و بینک مائیکہ بتاویل مالم تستطیع علیہ صبرا اما السفینۃ فکانت

پر اپنی لالھی ماری وہ پھٹ گیا اور پانی مثل دیوار کے یا پہاڑ کے ادھر ادھر کھڑا ہو گیا اور پانی نے بیچ میں خشک رستہ چھوڑ دیا

(بقیہ حاشیہ)

موسیٰ نے اس سے کہا کہ کیا میں تمہارے ساتھ ہو لوں اگر مجھ کو بھی ان دانشمندیوں میں سے جو تم نے سیکھی ہیں سکھلا دو اس بندے نے کہا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور تم کس طرح پر اس بات پر صبر کرو گے جو تمہارے دانش کے احاطہ میں نہیں ہے۔ موسیٰ نے کہا انشاء اللہ تم مجھ کو صبر کرنے والا پاؤ گے اور میں تمہارے کسی کام میں ہر خلائی نہ کروں گا اُس بندے نے کہا کہ اگر تم میری تابعداری کرنا چاہتے ہو تو جب تک میں خود ہی نہ کہہ دوں مجھ سے کسی بات کو مت پوچھنا پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک کشتی پر سوار ہوئے تو اس بندے نے کشتی میں سوراخ کر دیا موسیٰ نے کہا

لَمَسَاكَيْنِ يَعْصُونَ فِي الْبَحْرِ  
فَارَدَتْ اَنْ اَعْيِيَهَا وَكَانَ وِرَاءَهُمْ  
مَلِكٌ يَّاخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ  
غَضَبًا وَاَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ  
اَبْوَاهُ مُوسِيْنِ فَخَشِيْنَا اَنْ  
يَرْهَقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا  
فَاَرَدْنَا اَنْ يَبْدُلَهُمَا رَبُّهٖمَا  
خَيْرًا مِنْهُ زَكٰوَةً وَّ اَقْرَبَ  
رَحْمًا وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ  
لِلْغُلَامِيْنِ يَتَمَيَّنُ فِي الْمَدِيْنَةِ  
وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزُ لَهُمَا وَكَانَ  
اَبُوهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّكَ  
اَنْ يَبْلُغَا اَشَدَّ هَمًا وَّ يَسْتَخِرَ  
جَا كَنْزُ لَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ  
وَمَا فَعَلْتَهُ عَنْ اَمْرِ ذٰلِكَ  
تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَلَيْهِ  
صَبْرًا (كهف)۔

کہ کیا تم نے کشتی کے لوگوں کے ڈبوں کے لیے اس میں شگاف کیا ہے اُس بندے نے کہا کہ دیکھو تم نے یہ بری بات کی اس بندے نے کہا کہ میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے موسیٰ نے کہا کہ جو بات میں نے بھول کر کہی اس پر مواخذہ مت کرو اور میرے کام میں سختی مت ڈالو پھر دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک نوجوان سے ملے تو اس بندے نے اس نوجوان کو مار ڈالا موسیٰ نے کہا کہ تم نے ایک شخص بے گناہ کو بغیر جان کے بدلے مار ڈالا۔ دیکھو تم نے برا کام کیا اس بندے نے کہا میں نے تم سے نہ کہا

اور حضرت موسیٰ اور تمام بنی اسرائیل اس رستہ سے پار آ کر گئے۔  
فرعون بھی اسی رستہ میں دوڑ پڑا اور پھر سمندر مل گیا اور سب

(بقیہ حاشیہ)

تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے موسیٰ نے کہا کہ اگر اس کے بعد میں تم سے کوئی بات پوچھوں تو پھر مجھ کو اپنے ساتھ مت رکھنا میں اپنا عذر تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ ایک گاؤں کے لوگوں کے پاس پہنچے تو ان سے کھانا مانگا انہوں نے ان کو کھانا کھلانے سے انکار کیا وہاں ان دونوں نے ایک دیوار دیکھی کہ گر پڑنا چاہتی ہے ان دونوں نے اس کو سیدھا بنا دیا حضرت موسیٰ کو بھوک لگی ہوئی تھی کسی نے کھانے کو دیا نہ تھا ٹکا پیسہ پاس نہ تھا انہوں نے اس بندے سے کہا کہ اگر تم چاہتے ہو اس پر مزدوری لے لیتے اس بندے نے کہا کہ بس اب مجھ میں اور تجھ میں جدائی ہے میں ان باتوں کی تاویل جن پر تم صبر نہ کر سکتے بتا دیتا ہوں وہ کشتی تو غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں کھیوا اکھیا کرتے تھے۔ میں نے اس کو عیب دار کر دینا چاہا ان کے پرے ایک بادشاہ ہے جو زبردستی سے ہر ایک کشتی کو پکڑ لیتا ہے اور وہ نوجوان اس کے ماں باپ ایمان والے ہیں مجھ کو خوف ہوا کہ یہ ان کو سرکشی و کفر میں تنگ کرے گا پس میں نے چاہا کہ ان کا پروردگار اس کا نعم البدل پاکیزگی اور محبت میں ان کو دے گا اور وہ دیوار شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کے لئے خزانہ تھا اور ان کا باپ اچھا آدمی تھا پس میرے پروردگار نے چاہا کہ جب وہ دونوں جوانی میں بھر پور ہوں وہ اپنا خزانہ نکال لیں تیرے پروردگار کی مہربانی سے اور میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیے یہ بیان ان باتوں کا ہے جن پر تو صبر نہ کر سکا۔

اور جب موسیٰ شہر مدین کی	ولما توجه تلقاء
طرف چلے تو کہا کہ امید ہے کہ	مدین قال عسی ربی ان
میرا پروردگار مجھ کو سیدھا رستہ بتا	یہدنی سواء السبیل ولما
دے اور جبکہ شہر مدین کے پانی کے	ورد ماء مدین وجد علیہ
پاس پہنچے تو وہاں لوگوں کے گروہ	آمة من الناس یسقون و
کو (موشی کو) پانی پلاتے پایا اور	وجد من دنہم امراتین



ڈوب گئے۔ اگر درحقیقت یہ واقعہ خلاف قانون قدرت واقع ہوا تھا تو خدا تعالیٰ نے سمندر کے پانی ہی کو ایسا سخت کر دیتا کہ

(بقیہ حاشیہ)

اس کے پرے دو عورتوں کو پایا کہ اپنے مویشی روکے کھڑی ہیں موسیٰ نے کہا کہ تمہارا کیا حال ہے انہوں نے کہا کہ جب تک چرواہے پانی پلا کر نہ لے جاویں ہم نہیں پلا سکتیں اور ہمارا باپ بڈھا ہے پھر موسیٰ نے ان دونوں کے مویشی کو پانی پلا دیا پھر چھاؤں میں جا کھڑے ہوئے پھر کہا کہ اے میرے پروردگار تو نے میری ایسی حالت کر دی ہے کہ تھوڑی سی بھلائی کا بھی محتاج ہوں پھر ان دونوں میں سے ایک شرمیلی چلتی ہوئی موسیٰ کے پاس آئی کہا میرے باپ نے تجھ کو بلایا ہے تاکہ ہمارے (مویشی کو) جو پانی تو نے پلایا ہے اس کی اجرت دے پھر جب موسیٰ اس کے پاس (یعنی اس عورت کے باپ کے پاس) آئے اور اپنا قصہ اس سے کہا تو اس نے کہا کہ مت ڈرو تم نے ظالم قوم سے نجات پائی اس کی بیٹیوں میں سے ایک نے کہا کہ اے باپ اس کو مزدوری پر رکھ لے۔ اچھا مزدور جس کو مزدوری پر لگا دے طاقت ور اور دیانت دار ہونا چاہیے اس شخص نے موسیٰ سے کہا کہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنی دو

تذودان قال ما خطبکما قالتا لا نسقی حتی یصدر الرعاء و ابونا شیخ کبیر فسقی لہما ثم تولی الی الظل قال رب انی لما انزلت الی من خیر فقییر فجاءتہ احدا ہما تمشی علی استحياء قالت ان ابی یدعوک لیجیزیک اجر ماسقیت لنا فلما جاءہ وقص علیہ القصص قال لا تخف نجوت من القوم الظالمین قالت احدا ہما یابیت استاجرہ ان خیر من استاجرت القوی الامین قال انی ارید ان انکحک احدی انبتی ہا تین علی ان تاجرنی ثمنی ججج فان اتیمت عشرا فمن عندک ما اریدان اشق علیک ستجدنی انشاء اللہ من الصالحین قال ذالک بینی و بینک ای الاجلین قضیت فلا عدوان علی و اللہ علی مانقول وکیل -

(قصص)

کہ مثل زمین کے اس پر سے چلے جاتے - خشک رستہ نکالنے ہی سے یہ بات پائی جاتی ہے کہ یہ واقعہ یا معجزہ جو اس کو تعبیر کرو

(بقیہ حاشیہ)

بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تجھ سے کر دوں اس بات پر کہ تو آٹھ برس تک میرے ہاں مزدوری کرے پھر اگر تو دس برس پورے کرے دے تو تیری طرف سے ہوگا میں تجھ پر مشقت ڈالنا نہیں چاہتا تو مجھ کو انشاء اللہ اقرار پورا کرنے والوں میں پاوے گا موسیٰ نے کہا کہ مجھ میں اور تجھ میں یہ اقرار ہو چکا ان دونوں میں سے جو کسی میں پوری کر دوں تو پھر مجھ پر زیادتی نہ ہو اور جو میں کہتا ہوں -

خدا اس مددگار ہے - بھر موسیٰ اہل مدین میں چند سال رہا پھر تو اے موسیٰ وقت پر آگیا -

پھر جب موسیٰ نے میعاد مقررہ پوری کی اور اپنی بی بی کو لیکر چلا تو اس کو پہاڑ کی جانب سے آگ معلوم ہوئی موسیٰ نے اپنی بیوی سے کہا کہ ٹھہرو مجھے آگ معلوم ہوئی شاید میں وہاں سے کچھ خبر لے آؤں یا ایک بھڑکتی ہوئی لکڑی اٹھا لاؤں یا آگ کا انگارہ لے آؤں تاکہ تم تاپو یا آگ کے پاس کوئی راہ بتانے والا پاؤں پھر جب موسیٰ آگ کے پاس آیا تو جنگل کے دائیں کنارے سے پہاڑ کی دائیں طرف سے اس مبارک جگہ میں درخت میں سے کسی نے اس کو آواز دی کہ جو آگ میں ہے اور جو اس کے گرد ہے اس کو برکت دی گئی ہے اور اللہ پاک ہے اور تمام عالموں کا پالنے والا ہے اے موسیٰ بیشک میں ہی خدا ہوں سب پر غالب اور بڑی حکمت والا بیشک میں

فلبثت سنین فی اہل مدین ثم جئت علی قدر یا موسیٰ - (طہ)

فلما قضیٰ موسیٰ الا جان وسار باہلہ انس من جانب الطور نارا قال لاہلہ امکشوا انی انست نارا علی آیتکم منہا بخیر (قصص) او آتیکم بشاب قیس (نمل) جذوة من النار لعلکم تصطلون (قصص) او اجد علی النار ہدی (طہ) فلما اتا ہانودی من شاطی الوادی الا یمن (قصص) من جانب الطور الا یمن (مریم) فی البقعة المبارکة من الشجرة (قصص) ان بورک من فی النار ومن حولہا و سبحان اللہ رب العالمین یا موسیٰ انہ انا اللہ العزیز

مطابق قانون قدرت کے واقع ہوا تھا جو مطلب مفسرین نے بیان کیا ہے وہ مطلب قرآن مجید کے لفظوں سے بھی نہیں نکلتا۔ سمندر میں

(بقیہ حاشیہ)

ہی خدا ہوں تمام عالموں کا پالنے والا  
بیشک میں تیرا خدا ہوں پھر جوتیاں  
آتا رہ ڈال بے شبہ تو پاک جنگل میں  
بھرتا ہے۔ اے موسیٰ یہ کیا تیرے  
دائیں ہاتھ میں ہے موسیٰ نے کہا  
کہ یہ میری لائھی ہے اس کو میں  
ٹیک لیتا ہوں اور اس سے اپنے ربوڑ  
پر پتے جھاڑ لیتا ہوں اور وہ میرے  
کام میں بھی آتی ہے خدا نے کہا کہ  
اپنی لائھی ڈال دے (جب ڈال دی)  
تو لائھی کو ہلتے ہوئے دیکھا گویا  
کہ وہ سانپ ہے تو موسیٰ پیٹھ پھیر کر  
پلٹا اور پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا  
خدا نے کہا اے موسیٰ آگے بڑھ اس  
کو پکڑ لے اور مت ڈر وہ جیسی پہلی  
تھی ویسی ہی ہو جاوے گی ڈال اپنا  
ہاتھ اپنے گریباں میں اور اپنے ہاتھ  
کو اپنے بازو سے ملا دے تیرا ہاتھ  
بے عیب سفید نکلے گا بطور ایک دوسری  
نشانی کے جو ڈر تجھ کو ہوا ہے اس  
سے اپنے کو دونوں بازو ملا کر تھام۔  
پھر یہ دونوں نشانیاں ہیں تیرے  
پروردگار کی نو نشانیاں میں سے فرعون  
اور اس کے درباریوں کے لئے بیشک  
وہ بدکار قوم ہے اور ہم نے موسیٰ  
کو باتیں کرنے سے مقرب کیا۔

الحکیم (نمل) انا انا الله رب  
العالمین (قصص) انا  
ربک فاخلع نعلیک انک  
بالواد المقدس طوی (طہ)  
ما تملک بیمینک یا  
موسیٰ قال ہی عصای اتو  
کاء علیہا واهش بہا علی  
غنی ولی فیہا ما رب اخری  
(طہ) الق عصاک فلما راہا  
تہتر کانہا جان ولی مدبر  
ولم یعقب یا موسیٰ اقبل  
(قصص) خذھا ولا تخف سنعید  
ھا سیرتھا الاولى۔ (طہ)  
اسلک یدک فی جیبک  
(قصص) واضمم یدک الی  
جناحک تخرج بیضاء من  
غیر سوء آیۃ اخری (طہ)  
واضمم الیک جناحک  
من الذہب فذلک برہان  
من ربک (قصص) فی تسع  
آیات (نمل) الی فرعون و  
ملائتہ انہم کانوا قوماً  
فاسقین (قصص) و قربناہ  
نجیا۔ (مریم)

راستہ ہو جائے کی نسبت قرآن مجید میں تین جگہ ذکر آیا ہے اول سورہ بقرہ میں جہاں فرمایا ہے کہ ”اذ فرقنا بکم البحر“ دوم

(بقیہ حاشیہ)

پھر ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیوں اور علانیہ غلبہ کے ساتھ فرعون اور اس کے درباہوں ہامان اور قارون کے پاس بھیجا کہ اپنی قوم کو اندھیرے سے روشنی میں نکال لاوے۔ جاؤ ظالم قوم کے پاس جو فرعون کی قوم ہے جا فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہے موسیٰ نے کہا کہ اے پروردگار میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلا دینگے اے نے پروردگار میں نے ان میں کا ایک آدمی مار ڈالا ہے۔ میں ان کا قصور کیا ہے پھر میں ڈرتا ہوں کہ وہ مار ڈالیں گے میرے سینے میں دم گھٹ جاتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔ اے پروردگار میرے سینہ کو کھول دے اور میرا کام مجھ پر آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری بات سمجھیں اور میرے بھائی ہارون کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے میرے کنبہ میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر کر پھر ہارون کو میرے پاس بھیج پھر اس کو میرے ساتھ بطور مددگار کے بھیج خدا نے کہا میں تیرے بازو کو تیرے بھائی سے مضبوط کر دوں گا اور تم دونوں کو وہ غلبہ

ثم ارسلنا موسیٰ و اخاه ہارون یتاتنا و سلطان بین الی فرعون و ملائہ (ہود) ہامان و قارون (سومن) ان اخرج قومک من الظلمات الی النور (ہود) ان ایت القوم الظلمین قوم فرعون (شعراء) اذهب الی فرعون انه طفی (نازعات) قال رب انی اخاف ان یکذبون (شعراء) رب انی قتلت منہم نفسا (قصص) ولہم علی ذنب فاخاف ان یقتلوا (شعراء) ویضیق صدری ولا ینطلق لسانی (شعراء) رب الشرح لی صدری ویسر لی امری و احلل عقدہ من لسانی یفقهہوا قولی (طہ) و اخی ہارون ہو افصح منی لسانا (قصص) اجعل لی وزیرا من اہلی ہارون اخی (طہ) فارسل الی ہارون (شعراء) فارسلہ معی رداء (قصص) قال متشد عضدک با خیک و نجعل لک سلطانا (قصص) قال قد اوتیت سولک یا موسیٰ (طہ) اذهب انت و اخوک

سورہ الشعر میں فرمایا کہ ”او حینا الٰہی موسیٰ ان اضرب  
بِعَصَاكَ الْبَحْرَ فَاَنْفَلَقَ فَاَنَّ كُلَّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ

(بقیہ حاشیہ)

دو گ - خدا نے کہا اے موسیٰ جو  
تو نے مانگا تجھ کو دیا گیا جاتو اور  
تیرا بھائی میری نشانوں سمیت اور  
سستی نہ کرو میری نصیحت میں تم  
دونوں فرعون پاس جاؤ کہ وہ سرکش  
ہے خدا نے کہا کہ وہ ہرگز تم کو  
نہ مار سکیں گے پھر تم دونوں میری  
نشانوں سمیت جاؤ میں تمہارے ساتھ  
ہوں تمہاری بات سنوں گا پھر فرعون  
کے پاس جاؤ اور پھر اس سے کہو کہ  
ہم دونوں تمام عالموں کے پروردگار  
کے رسول ہیں۔ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل  
کو بھیج دے اور اس سے نرم بات کہو  
شاید کہ نصیحت مانے اور خوف کرے  
انہوں نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار  
بیشک ہم ڈرتے ہیں کہ ہم پر زیادتی  
کرے یا ہم سے سرکشی کرے خدا  
نے کہا کہ تم مت ڈرو میں تمہارے  
ساتھ ہوں تمہاری بات سنوں گا اور تم کو  
دیکھتا رہوں گا پھر اس کے پاس جاؤ  
موسیٰ گئے اور کہا کہ تجھ کو پاک  
ہونے کی کچھ خواہش ہے اور میں  
تجھ کو تیرے پروردگار کی راہ بتاؤں  
تاکہ تو خوف کرے خدا نے کہا  
کہ تم دونوں فرعون سے کہو کہ  
ہم دونوں تیرے پروردگار کے رسول

بایا قی لا وتنبیا فی ذکرہ  
اذہبا الیٰ فرعون انہ طفی  
(طہ) قال کلا فاذهبا  
با'یتنا انا معکم مستمعون  
فائتیا فرعون فقولوا انا  
رسول رب العالمین ان ارسل  
معنا بنی اسرائیل (شعرا)  
فقولوا لہ قولاً لینا لعلہ  
یتذکر او یخشی قالاً ربنا  
اننا نخاف ان یقرط علینا  
او ان یطغی قال لا تخافا اننی  
معکم اسمع واری فاتیاہ  
(ہـ) فقل هل لک الی  
ان تذکر واهدیک الی ربک  
فتخشی (نازعات) فقولوا انا  
رسولا ربک فارسل معنا  
بنی اسرائیل ولا تعذبہم  
قد جئناک بایۃ من ربک  
(طہ) قال فمن ربکم یا  
موسیٰ قال ربنا یا موسیٰ  
قال ربنا الذی اعطی کل  
شیء خلقہ ثم ھدی قال فما  
بال قرون الاولیٰ قال  
علمہا عند ربی (طہ) قال  
وما رب العالمین قال  
رب السموات والارض وما بینہما

تیسرے سورہ طہ میں جہاں فرمایا ہے کہ فَاوحِیْنَا اِلٰی مُوسٰی  
اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاَضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبْسَا الْا

(بقیہ حاشیہ)

ان کنتم موقنین قال لمن  
حولہ الا تستمعون قال ربکم  
و رب ابائکم الاولین -  
ہیں فرعون بولا اے موسیٰ تمہارا پروردگار کون ہے - موسیٰ نے کہا کہ ہمارا  
پروردگار وہ ہے جس نے تمام چیزوں کی خلقت ان کو عطا کی ہے پھر سیدھی  
راہ بتائی ہے فرعون نے کہا کہ پھر اگلے زمانے کے لوگوں کا کیا حال ہے -  
موسیٰ نے کہا کہ اس کی خبر خدا کو ہے - فرعون نے کہا کہ تمام  
عالموں کا خدا کون ہے موسیٰ نے کہا جو آسمانوں کا اور زمین اور جو کچھ  
ان میں ہے اس سب کا پروردگار ہے اگر تم یقین لاؤ - فرعون نے ان لوگوں  
سے جو اس کے ارد گرد تھے کہا کہ کیا تم نہیں سنتے ہو موسیٰ نے کہا  
کہ تمہارا پروردگار اور ہم سب کے باپ دادا کا -

قال ان رسولکم الذی  
ارسل علیکم لمجنون قال  
رب المشرق والمغرب و  
ما بینہما ان کنتم تعقلون  
قال لئن اتخذت الہا غیری  
لا جعلنک من المسجونین  
(شعرا) قال الم تربک فینا  
ولید او لبث فینا من عمرک  
سنین وفعلت فعلتک التی فعلت و  
انت من الکافرین قال فعلتہا  
اذا وانا من الضالین ففررت  
منکم لما خفتکم فوہب  
لی ربی حکما وجعلنی من  
المرسلین وتلک نعمۃ  
تمنہا علی ان عبدت بنی

فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا  
کہ تمہارے پاس جو رسول آیا ہے  
البتہ دیوانہ ہے موسیٰ نے کہا (کہ  
تمام عالموں کا خدا وہی ہے) جو مشرق  
و مغرب کا اور جو اس میں ہے اس  
سب کا پروردگار ہے اگر تم سمجھتے ہو  
فرعون نے کہا کہ اگر تو نے میرے  
سوا اور کسی کو خدا ٹھہرایا تو میں  
ضرور تجھ کو قید میں داخل کروں گا -  
فرعون نے کہا کہ کیا ہم نے تجھ کو  
نہیں پالا جب کہ تو ہم میں بچہ تھا  
اور کیا تو نے بسر نہیں کیے ہم میں  
اپنی عمر کے چند سال اور تو نے وہ  
کام کیا جو کیا اور تو ناشکروں میں  
ہے موسیٰ نے کہا کہ میں نے کیا تھا

تخاف وركاء لاتخشى فاتبعهم فرعون بحموده فغشى من  
اليم ساغشيم“ پہلی آیت میں تو کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے

(بقیہ حاشیہ)

جب کہ میں گمراہوں میں تھا - پھر  
میں تم سے ڈرا اور تم میں سے بھاگ  
گیا پھر خدا نے مجھ کو حکم دیا اور  
مجھ کو پیغمبروں میں سے کیا اور یہ بھلائی  
جس کا احسان تو مجھ پر رکھتا ہے اس  
بناء پر ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو  
غلام بنا رکھا ہے فرعون نے موسیٰ  
سے کہا کہ میں تجھ کو سحر زدہ  
سمجھتا ہوں - موسیٰ نے کہا کہ جب  
بھی اگر میں کوئی بڑی نشانی لاؤں -  
فرعون نے کہا کہ اگر تو کوئی نشانی  
لا سکتا ہے تو اس نشانی کو لا اگر تو  
سچا ہے - پھر موسیٰ نے اپنی لاثی  
ڈال دی پھر یکایک ہوہو سانپ تھی  
اور اپنا ہاتھ نکالا پھر یکایک دیکھنے  
والوں کو چمکتا معلوم ہوتا تھا -  
موسیٰ نے کہا اے فرعون میں  
پروردگار عالموں کا رسول ہوں مجھ کو  
لائق ہے کہ میں خدا پر سوائے سچ  
کے اور کچھ نہ کہوں میں لایا ہوں  
تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی  
پھر میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج  
دے پھر فرعون اور اس کے لشکروں  
نے بغیر کسی حق کے دنیا میں تکبر  
کیا اور گمان کیا کہ وہ ہمارے پاس  
نہ پھریں گے پھر انہوں نے تکبر کیا

اسرائیل (شعرا) فقال له  
فرعون انى لا ظنك بموسى  
مسحورا (بنى اسرائيل) قال  
اولو جئتكم بشئى مبين  
(شعرا) قال ان كنت  
جئت باية فات بها (اعراف)  
ان كنت من الصادقين  
فالى عصى فاذا هى  
ثعبان مبين ونزع يده  
فاذا هى بيضاء للناظرين  
(شعرا) قال موسى يا فرعون انى  
رسول من رب العالمين  
حقيق على ان لا اقول على  
الله الا الحق قد جئتكم  
بينة من ربكم فارسل معى  
بنى اسرائيل (اعراف)  
واستكبر هو و جنوده فى  
الارض بغير الحق وظنوا  
انهم المينا لا يرجعون  
(هود) فاستكبروا و كانوا  
قوما عالين (مؤمنون) مجرمين  
(يونس) قالوا انؤمن لبشرين  
مثلنا و قومهما لنا عابدون  
(مومن) فظلموا (اعراف)  
فكذبوا هما (مومن) فقالوا  
ساحر كذاب (مومن). قال

سمندر کے جدا ہو جانے یا پھٹ جانے کو خلاف قانون قدرت قرار دیا جا سکے۔ دوسری آیت میں جو الفاظ ہیں انہی پر تمام مفسرین

(بقیہ حاشیہ)

اور وہ ایک قوم بڑھی ہوئی تھی۔  
گنہگار تھی۔ بولی کہ کیا ہم ایسے دو  
شخصوں پر ایمان لائیں جو ہمارے  
سے ہیں اور ان کی قوم ہماری غلام  
ہے پھر انہوں نے ظلم کیا۔ اور ان  
دونوں کو جٹھلایا اور کہا کہ جھوٹے  
جادوگر ہیں۔ فرعون نے اپنے اردو  
گرد کے درباریوں سے کہا کہ یہ  
جادوگر بڑا جاننے والا ہے چاہتا ہے  
کہ تم کو تمہارے ملک سے اپنے  
جادو سے نکال دے پھر تم کیا کہتے  
ہو۔ وہ بولے کہ اس کو اور اس کے  
بھائی کو نہلت دے اور شہروں میں  
(جادوگروں کے) اکٹھا کرنے والوں  
کو بھیج تیرے پاس لے آویں ہر ایک  
بڑے علم والے جادوگر کو۔ فرعون  
کے کہا کہ اے موسیٰ کیا تو ہمارے  
پاس ہم کو ہمارے ملک سے اپنے  
جادو سے نکالنے کو آیا ہے پھر بے شبہ  
ہم بھی تیرے پاس ویسا ہی جادو  
لاویں گے پس کسی چوپٹ میدان میں  
ہم میں اور اپنے میں (مقابلہ کے لیے)  
کوئی وقت مقرر کر۔ نہ ہم اس کے  
برخلاف کریں اور نہ تو۔ موسیٰ نے  
کہا کہ جشن کا دن تمہارے وعدے  
کا سہی اور تھوڑے دن چڑھے سب

للملاء حوله ان هذا لساحر  
علیم بریدان یخرجکم من  
ارضکم بسحره فإذا تاملون  
قالوا ارجه و اياه وابعث  
(شعرا) و ارسل فی المدائن  
حاشرین یا توکب بکل  
ساحر علیم (اعراف) قال  
اجئتنا التخرجنا من ارضنا  
بسحرک یا موسیٰ فلما  
نیتک بسحر مثله  
فاجعل بیننا و بینک موعد  
الا نخلقه نحن ولا انت مکانا  
سوی قال موعدکم یوم  
الزنیة و ان یحشر الناس  
ضحیٰ فتوالیٰ فرعون فجمع  
کیدہ ثم اتی (طه) قال فرعون  
انتونی بکل ساحر علیم  
(یونس) فجمع السحرة لمیقات  
یوم معلوم وقیل للناس  
هل انتم مجتمعون لعلنا  
تتبع السحرة ان کانو هم  
الغالبین (شعراء) فلما جاء  
السحرة فرعون قالوا لئن  
لنا لاجرا ان کننا نحن  
الغالبین قال نعم و انکم  
اذا لمن المقربین (شعراء)



کا دار و مدار ہے۔ وہ ان اضرب بعصا ک البحر کے یہ معنی  
معنی لیتے ہیں کہ خدا نے موسیٰ سے کہا کہ سمندر کو اپنی لاٹھی

(بقیہ حاشیہ)

آدمی وہاں اکٹھے ہو جاویں پھر فرعون  
(اپنے محل میں) گیا اور اپنے جادوگروں  
کو جمع کیا۔ فرعون نے کہا کہ ہر  
ایک بڑے جادوگر کو بلاؤ پھر تمام  
جادوگر وقت معین پر جمع ہو گئے اور  
لوگوں سے کہا کہ کیا تم بھی اکٹھے  
ہو گے تاکہ اگر جادوگر غالب آجاویں  
تو ہم ان کا ساتھ دیں جب فرعون کے  
جادوگر فرعون کے پاس آئے تو انہوں  
نے کہا کہ اگر ہم غالب ہوں تو  
ہمارے لیے کچھ انعام ہے فرعون نے  
کہا کہ ہاں تب تو تم مقربوں میں  
سے ہو گے پھر ان کے باہم ان کے  
کام میں کچھ جھگڑا ہوا اور انہوں  
نے اپنے مشورہ کو چھپایا انہوں نے  
کہا کہ بے شبہ یہ دونوں جادوگر  
ہیں اور اپنے جادو کے زور سے تم کو  
تمہارے ملک نکالنا اور تمہارے عمدہ  
مذہب کو کھو دینا چاہتے ہیں پس  
اپنے جادوگروں کو جمع کر کے کہا  
کہ پھر اکٹھے ہو کر چلو اور آج کے  
دن جو غالب ہو گا وہی کامیاب ہو گا  
چنانچہ (یوم موعود کو سب جمع ہوئے)  
فرعون کے جادوگروں نے موسیٰ سے  
کہا کہ یا تو تو پہلے ڈال یا ہم پہلے  
ڈالتے ہیں۔ موسیٰ نے کیا تم ہی ڈالو

فتنازعوا امرهم بینہم و  
آسر و النجوى قالوا ان  
ہذان لساحران یریدان ان  
یخرجاکم من ارضکم بسحر  
ہما ویذہبا بطر یقتکم  
الدمشلی فاجمعوا کیدکم  
ثم ائتوا صفا و قد اقلح  
الیوم من استعلیٰ (طہ)  
قالوا یا موسیٰ اما ان  
تتقی واما ان اکون اول  
من القیٰ (طہ) و اما ان  
لکون نحن الملقین فلما  
القوا سحر و اعین الناس  
استرہبہم و جاؤ بسحر  
عظیم (اعراف) فالقوا حبالہم  
وعصیہم و قالوا بعزۃ  
فرعون انا لنحن الغلبون  
(شعرا) فاذا حبالہم وعصیہم  
یخیل الیہ من سحرہم  
انہا تسعی (طہ) فلما القوا  
قال موسیٰ ماجئتکم بہ  
السحران اللہ سیبطلہ  
(یونس) فاوجس فی نفسہ  
خیفۃ موسیٰ قلنا لا تخف  
انک انت الاعلیٰ (طہ) و  
اوحینا الی موسیٰ ان القا

سے مار سے مار چنانچہ حضرت موسیٰ نے لاٹھی ماری اور سمندر  
ھٹ گیا یا پھٹ گیا یا سمندر کی تہ زمین کھل گئی وہ اس جملہ

(بقیہ حاشیہ)

پھر جب انھوں نے ڈالا تو لوگوں  
کی آنکھوں پر ڈھٹ بند کر دی اور  
ان کو ڈرا دیا اور بہت بڑا جادوگر  
لائے۔ جب انھوں نے اپنی رسیاں اور  
لاٹھیاں ڈالیں اور کہا کہ فرعون کی  
عزت کی قسم ہم ہی غالب ہیں تب  
تو موسیٰ کے خیال میں ان کی رسیاں  
اور لاٹھیاں ان کے جادو سے چلتی  
ہوئی لگنے لگیں۔ موسیٰ نے کہا کہ  
یہ جو تم نے کیا یہ جادو ہے اس کو  
خدا باطل کر گیا مگر موسیٰ دل میں  
ڈر گیا خدا نے کہا مت ڈر تو ہی  
جیتے گا اور خدا نے موسیٰ کے دل  
میں ڈالا کہ اپنی لاٹھی ڈال کہ وہ  
اس سب بناوٹ کو نکل جاوے گی۔  
پھر موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈالی پھر  
اس سب بناوٹ کو جو انھوں نے کی  
تھی، نکلتی تھی۔ انھوں نے تو  
جادوگروں کا سا مکر کیا تھا اور حق  
کے سامنے جادوگر کامیاب نہیں ہو  
سکتا بس حق ثابت ہو گیا اور جو  
انھوں نے کیا تھا وہ باطل ہو گیا پھر  
وہاں ہار کر ذلت سے لوٹ گئے اور  
فرعون کے جادوگروں نے سجدہ کیا بولے  
ہم پروردگار عالموں پر ایمان لائے جو  
موسیٰ و ہارون کا پروردگار ہے۔ فرعون

عصا کا فاذا ہی تلقف ما  
یا فکون (اعراف) فالقٹی  
عصا فاذا ہی تلقف ما  
یا فکون (شعرا) ما صنعوا انما  
صنعوا کید لسا حرو لا یفاج  
الساحر حیث اتی (طہ)  
فوقع الحق و بطل ما کانوا  
یعملون فغلبوا هنالک  
و انقلبوا ساغرین والقی  
السحرة ساجدین (اعراف)  
سجدا (طہ) قالوا اسنا رب  
العالمین رب موسیٰ و  
ہرون قال فرعون آمنتم  
به قبل ان اذن نکم ان  
هذا لمکر مکر تموه فی  
المدينة لتخرجوا منها  
اعلها فسوف تعلمون  
(اعراف) انه لکبیر کم  
الذی علمکم السحر فلا  
قطعن ایدیکم و ارجلکم  
من خلاف ولا صلیبکم فی  
جذوع النخل ولتعلمن  
اینا اشد و عذابا و ابقی  
قالوا لن نوثرک علی ما  
جائنا من البینات والذی  
فطرنا فاقض ما انت قاض

کو اس طرح پر بطور شرط و جزا کے قرار دیتے ہیں کہ شرط گویا علت ہے اور جزا اس کا محلول یعنی لاثمی مارنے کے سبب سے

(بقیہ حاشیہ)

(طہ) وما تنقم منا الا ان  
آمننا بآیات ربنا لما جاء  
تنا ربنا افرغ علينا صبرا  
و توفنا مسلمین (اعراف)  
انجام جانو گے - موسیٰ ہی تمہارا گروہ جس نے تم کو جادو سکھایا ہے  
ضرور میں تمہارے ہاتھ ایک طرف کے اور تمہارے پاؤں دوسری طرف کے  
کاٹوں گا اور تم کو کھجوروں کے درختوں کے تنوں کی سولی پر چڑھا دوں  
گا اور بلاشبہ تم جانو گے کہ کون سب سے زیادہ عذاب دینے میں سخت  
ہے اور کس کا عذاب زیادہ پائدار ہے - وہ بولے کہ جو چیزیں علانیہ  
ہمارے سامنے ہوئی ہیں ان پر اور اس پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے تجھ  
کو ہم ترجیح نہیں دے سکتے پھر جو تو حکم دینا چاہتا ہے حکم دے  
تو ہم پر بجز اس کے کہ ہم اپنے پروردگار کی نشانیوں پر ایمان لائے ہیں  
اور کوئی گناہ نہیں ٹھہراتا - اے ہمارے پروردگار جب (یہ مصیبتیں) ہم پر  
آویں تو ہمارے (دل میں) صبر ڈال دے اور ہم کو مسلمان مار -

ولقد اخذنا آل فرعون  
بالسنین و نقص من الثمرات  
لعلہم یذکرون فاذا  
جاءتہم الحسنہ قالوا لنا  
ہذہ وان تصبہم سیئہ  
یطیروا موسیٰ ومن معہ  
الا انما طائرہم عند اللہ  
ولکن اکثرہم لا یعلمون  
وقالوا مہما تاتنا بہ من  
آیۃ تسحرنا بہا فما نحن  
لک بمومنین فارسلنا  
علیہم الطوفان والجراد

اور بلاشبہ ہم نے فرعون والوں  
کو قحطوں میں اور پھلوں کی کم پیداوار  
میں گرفتار کیا شاید کہ وہ نصیحت  
پکڑیں اور پھر جب ان کو فراخی ہوئی  
تھی تو کہتے تھے کہ یہ تو ہمارے  
لیے ہے - جب ان پر سختی پڑتی  
تھی تو موسیٰ کی اور اس کے ساتھ  
کے لوگوں کی غصہ بٹلاتے تھے -  
سمجھو کہ اس کے سوا کوئی بات  
نہیں کہ جو غصہ اس کے لیے تھی  
وہ خدا کے پاس سے تھی مگر ان میں  
بہت سے لوگ نہیں جانتے فرعون والوں

سمندر پھٹ گیا اور زمین نکل آئی مگر یہ امتدلال صحیح نہیں ہے۔  
 ”انفلق“ ماضی کا صیغہ ہے اور عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ

(بقیہ حاشیہ)

نے موسیٰ سے کہا کہ جو نشانیاں تم  
 لاؤ گے تاکہ ہم پر ان سے جادو کرو  
 تو بھی ہم تجھ پر ایمان نہیں لانے کے  
 پھر ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈی دل  
 اور جوئی اور مینڈک اور خون کا  
 (مینہ) نازل کیا۔ جدا جدا نشانیاں۔  
 پھر انہوں نے تکبر کیا اور وہ گنہگار قوم  
 تھی۔ جب ان کے پاس دکھائی دیتی  
 ہوئی ہماری نشانیاں آئیں تو بولے کہ  
 یہ تو کھلا ہوا جادو ہے اور ان  
 نشانیوں کا انکار کیا اور البتہ ہم نے  
 فرعون کو اپنی تمام نشانیاں دکھلائیں  
 پھر اس نے جھٹلایا اور انکار کیا اور  
 جب موسیٰ ان کے پاس ہماری نشانیاں  
 لے کر آیا تو بولے کہ یہ تو بجز بتنگڑ  
 بنائے ہوئے جادو کے اور کچھ نہیں  
 ہے اور ہم نے اپنے اگلے پرکھاؤں  
 سے ایسی بات نہیں سنی، موسیٰ نے کہا  
 کہ میرا پروردگار جانتا ہے کہ کون  
 اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا  
 ہے اور کس کے لیے پیچھے کو آس  
 گھر (یعنی عاقبت) کی بھلائی ہوگی۔  
 فرعون والے بولے کہ کیا تو ہمارے  
 پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم کو آس  
 بات سے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا  
 کو پایا ہے ہٹا دے اور تم دونوں کو۔

والقمل والضفادع والدم  
 آیات مفصلات فاستكبروا  
 كانوا قوما مجرمين (اعراف)  
 فلما جاءتهم بآياتنا مبصرة  
 قالوا هذا سحر مبين وحجودوا  
 بها (نمل) ولقد ارسلناه آياتنا  
 كلها فكذبوا ابى (طه)  
 فلما جاءهم موسى بآياتنا  
 قالوا ما هذا الا سحر  
 مفترى وما سمعنا بهذا  
 في آبائنا الاولين قال  
 موسى رب اعلم بمن جاء  
 بالهدى من عنده ومن  
 تكون له عاقبة الدار (قصص)  
 قالوا اجئتنا لتافكنا  
 عما وجدنا عليه آباءنا و  
 تكون لکم الکبریاء فی  
 الارض وما نحن لکم بمومنین  
 (یونس) قال فرعون یا ایها  
 الملاء ما علمت لکم من  
 اله غیرى فا و قدلی یا هامان  
 علی الطین فاجعل لی  
 (قصص) ابن لی (مومن) صرحاً  
 لعلی الطلع الی اله موسی  
 (قصص) لعلی ابلغ الاسباب  
 باب السموات (مومن) وانی لا

جب ماضی جزاء میں واقع ہوتی ہے تو اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں اگر ماضی اپنے معنوں پر نہیں رہتی بلکہ شرط کی معلول ہوتی ہے تو

(بقیہ حاشیہ)

دنیا میں بڑائی ہو اور ہم تم دونوں کو نہیں مانتے ہیں۔ فرعون نے کہا کہ اے درباریو میں تمہارے لیے اپنے سوا کوئی خدا نہیں جانتا پھر اے ہامان میرے لیے مٹی کی اینٹیں آگ میں پکا اور میرے لیے اونچا محل بنا تاکہ میں موسیٰ کے خدا کے پاس چڑھ جاؤں اور میں تو اس کو جھوٹوں میں سمجھتا ہوں اور آیا فرعون کی قوم کے پاس ایک بزرگ پیغمبر (یعنی موسیٰ) یہ کہتا ہوا کہ میرے حوالے کر دو خدا کے بندوں کو بے شک میں تمہارے لیے خدا کا بھیجا ہوا امانت دار پیغمبر ہوں اور تم خدا پر سرکشی مت کرو۔ میں ضرور تمہارے سامنے کھلی دلیلیں لاتا ہوں بے شبہ میں نے اپنے پروردگار اور تمہارے پروردگار کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگ مار کرو پناہ مانگی ہے اور اگر تم مجھ کو نہیں مانتے تو مجھ سے جدا ہو جاؤ۔ پھر جب موسیٰ ان کے پاس ہمارے پاس سے حق بات لے کر آیا تو بولے کہ آن لوگوں کے بیٹوں کو مار ڈالو جو اس پر ایمان لائے ہیں اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دو حالانکہ کافروں کی مکاری بہ جز گمراہی کے اور کچھ نہیں اور

ظنہ من الکذبین (قصص)  
وجاء ہم (ای قوم فرعون)  
رسول کریم ان ادوالی عباد  
الله انی لکم رسول آمین و ان  
لا تعلوا علی الله انی آتیکم  
بسلطان مبین و انی عدت  
بربی و ربکم ان ترجمون و  
ان لم تؤمنوا لی فاعزلون  
(دخان) فلما جاء هم الحق  
من عندنا قالوا اقتلوا  
بناء الذین امنوا معه  
واستحيوا نساء هم وما  
کید الکافرین الا فی ضل  
وقال فرعون ذرونی اقتل موسیٰ  
ولیدع ربہ انی اخاف ان یدل  
دینکم او ان یظہر فی الارض  
الفساد (مومن) وقال رجل  
مومن من آل فرعون یکتم  
ایمانہ اتقتلون رجلاً ان  
یقول ربی الله وقد جاء کم  
بالبینات من ربکم و ان  
یکم کاذبا فعلیہ کذبہ و  
ان یکم صادقاً یصبکم  
بعض الذی یعدکم ان الله  
لا یہدی ہو مسرف کذاب  
یقوم لکم الملک الیوم  
ظاہرین فی الارض فمن

اس وقت اس پر 'ف' نہیں لاتے اور جب کہ وہ اپنے معنوں پر باقی رہتی ہے اور جزا کی معلول نہیں تب اس پر 'ف' لاتے ہیں جیسے

(بقیہ حاشیہ)

فرعون نے کہا کہ مجھ کو چھوڑ دو (یعنی اجازت دو) کہ میں موسیٰ کو مار ڈالوں اور وہ اپنے پروردگار کو پکارا ہی کرے بلاشبہ مجھے خوف ہے کہ تمہارا دین بدل دے اور ملک میں فساد برپا کرے اور فرعون والوں میں سے ایک مسلمان شخص نے جو اپنے ایمان کو چھپاتا تھا کہا کہ کیا تم ایسے شخص کو مار ڈالو گے جو یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور تمہارے پاس تمہارے پروردگار سے نشانیاں لایا ہے اور اگر وہ جھوٹا ہو تو اس کا جھوٹ اس پر ہے۔ اور اگر وہ سچا ہے تو تم کو بعضی وہ مصیبتیں پہنچیں گی جن کا وہ وعدہ کرتا ہے ہرگز خدا اس شخص کو جو حد سے تجاوز کرنے والا دروغ گو ہو ہدایت نہیں کرتا۔ اے میری قوم آج کے دن تمہارے لیے بادشاہت ہے دنیا پر

ينصُرنا مِن باسِ اللّٰهِ اِنْ جِئْنَا  
قَالَ فِرْعَوْنُ مَا اُرِيكُمْ اِلَّا  
مَا اَرٰى وَمَا اَهْدِيْكُمْ اِلَّا  
سَبِيْلَ الرِّشَادِ (مومن) وَقَالَ  
الَّذِيْ اٰمَنَ يٰ اَقْوَمُ اِنِّىْ اَخَافُ  
عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ  
مِثْلَ دَابِ قَوْمِ نُوْحٍ وَعَادٍ  
وَتَمُوْدَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ وَمَا  
اللّٰهُ يَرْيَدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ يٰ اِ  
قْوَمُ اِنِّىْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ  
التَّنَادِ يَوْمَ تَوَلَوْا مُدْبِرِيْنَ  
مَّا لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ  
وَمَنْ يَضِلُّ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ  
هَادٍ (مومن) وَلَقَدْ جَاءَكُمْ  
يُوسُفُ مِنْ قَبْلِ الْبَلِيَّاتِ  
فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُمْ  
بِهَ حَتّٰى اِذْ اَهْلَكَ قُلُومُكُمْ  
يَبْعَثُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُوْلًا -  
(مومن)

غلب ہو پھر وہ خدا کے عذاب سے اگر وہ ہم پر آ جاوے کون ہم کو مدد دے گا۔ فرعون نے کہا کہ میں تم کو بہ جزاس کے جو میں دیکھتا یا سمجھتا ہوں اور کچھ نہیں سمجھاتا اور میں تم کو بہ جزا راست کے اور کچھ نہیں بتاتا اس شخص نے جو ایمان لے آیا تھا کہا کہ اے میری قوم بے شک میں تم پر ایسے دن کا جو اگلے گروہوں پر گذرا ہے خوف کرتا ہوں جسے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور ان کی جو اس کے بعد ہوئیں حالت ہوئی اور خدا بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ نہیں کرتا اے میری قوم بے شک میں تم پر چل چلاہٹ پڑنے کے دن کا خوف کرتا ہوں اس

کہ اس مثال میں ہے۔ ”ان اکرمستی فاکرمستیک اس“  
یعنی اگر تعظیم کرے گا تو میں تیری تعظیم کل کر چکا ہکا ہوں۔

(بقیہ حاشیہ)

دن کہ ہم اوندھے منہ پیٹھ پھیر کر پھرو گے کوئی تم کو خدا سے بچانے والا نہ ہوگا اور جس کو خدا گمراہ کرتا اس کو کوئی راہ بتانے والا نہیں ہوتا۔ البتہ تمہارے پاس اس سے پہلے کھلی ہوئی نشانیاں لے کر یوسف آیا تھا پھر تم ہمیشہ اس بات میں جو وہ تمہارے پاس لایا تھا شبہ میں رہے یہاں تک کہ جب وہ مر گیا تو تم نے کہا کہ ہرگز نہیں بھیجنے کا اللہ اس کے بعد کسی پیغمبر کو۔

فرعون نے کہا کہ اے ہامان میرے لیے ایک محل بنانا کہ میں رستوں تک آسانوں کے رستوں تک پہنچ جاؤں پھر موسیٰ کے خدا کے پاس چڑھ جاؤں اور میں تو اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں اور اسی طرح فرعون کے لیے اس کے بدعمل بھڑک دار کیے گئے اور میدھے راستے سے روک دیا گیا تھا اور فرعون کے مکر بجز تباہی کے اور کچھ نہ تھے۔

وقال فرعون یا هامان ابن لی صرحا لعلی ابلغ الاسباب اسباب السموات فاطلع الی الہ موسیٰ وانی لا ظنہ کاذبا و کذالک زین لفرعون سوء عملہ وصد عن السبیل وما کید فرعون الا فی تباب۔ (مومن)

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا پھر ان سے پھر گیا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دیے تھے کہ اس کی کنجیاں ایک قوی گروہ پر بھاری تھیں۔ جب اس کی قوم نے اس سے کہا کہ مت اترا کہ خدا اترانے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور جو کچھ خدا نے تجھ کو دیا ہے اس میں آخرت کو ڈھونڈ اور اپنے حصہ کو دنیا میں سے مت بھول اور احسان کر جس طرح کہ

ان قارون وکان من قوم موسیٰ فبغی علیہم و آیتناہ من الکنوز ما ان مفاعہ لتنشو بالعصبۃ اولی القوۃ اذ قال لہ قوم لا تفرح ان اللہ لا یحب الغرحن واتبع فیما اتاک اللہ الدار الاخرہ ولا تنس نعمیک من الدنیا و احسن کما احسن اللہ الیک ولا تبغ الفساد

اس مثال میں جزاء (یعنی کل میں تعظیم کرنا اور شرط کی مغلول نہیں ہے کیوں کہ داس سے پہلے ہو چکی تھی - اس طرح اس آیت

(بقیہ حاشیہ)

خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے اور دنیا میں فساد مت مچا کہ اللہ تعالیٰ مفسدوں کو دوست نہیں رکھتا - اس نے کہا کہ مجھ کو یہ دولت صرف میری دانائی کے سبب دی گئی ہے - کیا وہ یہ نہ سمجھا کہ بے شبہ خدا نے کسی زمانہ میں اس سے پہلے ان کو ہلاک کر دیا جو اس سے بھی زیادہ قوی اور زیادہ دولت والے تھے اور کیا گنہگار اپنے گناہوں پر پوچھے نہ جاویں گے پھر قارون اپنی قوم کے سامنے تجمل سے نکلا جو لوگ دنیا ہی کی زندگی چاہتے تھے انہوں نے کہا کہ کاش ہمارے پاس بھی وہ کچھ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے - بے شک وہی بڑا صاحب نصیب ہے اور جن لوگوں کو دانش دی گئی تھی انہوں نے کہا کہ افسوس تم پر، خدا کا ثواب ان کے لیے جو ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کیے ہیں بہت اچھا ہے اور وہ بجز صبر کرنے والوں کے اور کسی کو نہیں ملتا - پھر ہم نے قارون کو اس کے گھر سمیت زمین میں دھنسا دیا پھر کوئی گروہ خدا کے سوا نہ اس کے لیے تھے نہ جو اس کی مدد کرے اور نہ وہ اپنے آپ

فی الارض ان الله لا يحب المفسدين قال انما اوتيته على علم عندی اولم يعلم ان الله قد اهلك من قبله من القرون من هو اشد منه قوة واکثر جمعا ولا یسل عن ذنوبهم المجرمون فخرج علی قومہ فی زینة قال الذین یریدون الحیوة الدنیا یا لیت لنا مثل ما اوتی قارون انه لذوا حظ عظیم وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب الله خیر لمن آمن و عمل صالحاً ولا یلقاها الا الصابرون فخرسنا به و بداره الارض فما کان له من فئة یتصرونه من دون الله وما کان من المنتصرین و اصبح الذین تمنوا باسکانہ بالامس یقولون و یکان الله یبسط الرزق لمن یشاء من عباده و یقدر له لولا ان من الله علینا لخرسف بنا و یکانہ لا یغلب الکافرون - (قصص)



میں سمندر کا پھٹ جانا یا زمین کا کھل جانا حزب کا معلوم نہیں ہو سکتا ۔

(بقیہ حاشیہ)

مدد کر سکتا تھا اور جن لوگوں نے کل اس کے مرتبہ کی تمنا کی تھی انہوں نے یہ کہتے ہوئے صبح کی او ہو ، اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو فراخ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو ہم کو بھی دھنسا دیتا ، اوہو وہ نہیں فلاح پہونچاتا کافروں کو ۔

اور فرعون نے اپنے لوگوں میں پکار کر کہا کہ اے لوگو کیا میرے پاس مصر کا ملک نہیں ہے اور یہ نہیں جو میرے ملک کے نیچے ہتی ہیں پھر کیا تم نہیں دیکھتے ہو آیا میں اچھا ہوں اس شخص سے جو ذلیل ہے اور نہیں بیان کر سکتا کہ کیوں نہ اس پر ڈالے گئے سونے کے کنگن اور کیوں نہ اس کے ساتھ فرشتے رہنے کو آئے اور جب فرعون والوں کو آفت پڑی تو بولے اے موسیٰ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے جس طرح اس نے تجھ کو بتایا ہے دعا مانگ اگر ہم پر سے آفت جاتی رہے تو تجھ پر ضرور ایمان لاویں گے اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے پھر جب ہم نے ان پر سے ایک مدت تک آفت کو دور کر دیا جس آفت تک وہ پہنچنے کو تھے تو وہ پھر گئے اور ہم نے ان کو عذاب میں گرفتار کیا کہ شاید وہ (بد راہ سے) پھر جاویں ۔ فرعون والوں نے کہا کہ اے جادوگر ہمارے لیے اپنے پروردگار سے جس طرح

و نادای فرعون فی قومہ  
قال یقوم الیس لی ملک  
مصر و هذا الانهار و تجری  
من تحتی افلا تبصرون  
ام انا خیر من هذا الذی  
هو مہمین ولا یکاد یبین فلولاً  
القی علیہ اسورۃ من ذهب  
او جاء معہ الملائکۃ  
مقترنین (زخرف) ولما وقع  
علیہم الرجز قالوا یا  
موسیٰ ادع لنا ربک بما  
عہد عندک لئن کشفتم  
عنا الرجز المومنین  
ولترسلن معک بنی اسرائیل  
فلما کشفنا عنہم الرجز  
الی اجل ہم بالقوہ اداہم  
ینکثون (اعراف) و اخذنا  
ہم بالعذاب لعلہم یرجعون  
و قالوا یا ایہا الساحر ادع  
لنا ربک بما عہد عندک  
اننا لمہتدون ۔ (زخرف)

اصل یہ ہے کہ یہودی اس بات کے قائل تھے کہ حضرت موسیٰ کی لائھی مارنے سے سمندر پھٹ گیا تھا اور زمین نکل آئی تھی اور

(بقیہ حاشیہ)

کہ اس نے تجھ کو بتایا ہے دعا مانگ بے شک ہم ہدایت پا گئے ہیں ۔  
 قال موسیٰ ربنا انک آتیت فرعون و ملائکہ زینۃ و اسوالا فی الحیوۃ الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلک ربنا اطمس علی اسوالہم و اشدوا علی قلوبہم فلا یومنون حتی یرو العذاب الالیم قال قد اجبت دعو تکما فاستقیہا ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون (یونس) قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ و اصبروا ان الارض لله یورثها من یشاء من عبادہ والعاقبۃ المتقین قالوا او ذینا من قبل ان تاتینا و من بعد ما جئنا قال عیسیٰ ربکم ان یہلک عدوکم و یتخذکم فی الارض قیینظر کیف تعلمون ۔ (اعراف)

دشمن کو خدا ہلاک کرے گا اور عنقریب تم کو زمین پر خلیفہ کر دے گا پھر دیکھے گا کہ تم کس طرح کرو گے ۔

ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ رات کو اے چل میرے بندوں کو ان کے لیے سمندر کے سوکھے رستہ میں مت خوف کر پکڑ لیے جانے سے اور نہ کسی

ولقد اوحینا الی موسیٰ ان اسر بعبادی فاضرب لہم طریقا فی البحر یسا لاتخاف درکا ولا تخشی (طہ)

لاٹھی مارنے سے پتھر میں سے پانی بہہ نکلا تھا۔ علمائے اسلام سے تفسیروں میں اور خصوصاً بنی اسرائیل کے قصوں میں یہودیوں کی

(بقیہ حاشیہ)

طرح کا، ڈر کر لے چل میرے بندوں کو رات کو تم (دشمن سے) تعاقب کیے جاؤ گے اور چھوڑ چل سمندر کو ایسی حالت میں کہ اترا ہوا ہے بے شک فرعون کے لوگ ایک لشکر ہے کہ ڈبویا جاوے گا چل اپنی لاٹھی کے سہارے سے سمندر میں کہ وہ پھٹا ہوا ہے پھر تھا ہر ایک ٹکڑا بڑے پہاڑ کی مانند اور جب کہ ہم نے تمہارے سبب سے سمندر کو جدا کر دیا پھر ہم نے تم کو بچایا اور ہم نے فرعون والوں کو ڈبو دیا اور تم دیکھتے تھے۔ پھر سورج کے نکتے ہی فرعون والوں نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا پھر جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے لوگوں نے کہا کہ اب ہم پکڑے گئے موسیٰ نے کہا ہر گز نہیں بیشک میرے ساتھ میرا خدا ہے جو ٹھیک رستہ بتا دے گا پھر فرعون نے اپنے لشکر سمیت ان کا پیچھا کیا پھر ڈھانک دیا ان کو سمندر میں سے

فاسر بعبادی لیلا انکم متبعون و اترک البحر رھو انھم جند مغرقون (دخان) ان اضرب بعصاک البحر فانقلب فکان کل فوق کالطود العظیم (شعرا) و اذ فرقنا بکم البحر فانجینکم و اغرقنا آل فرعون و انتم تنظرون (بقر) فاتبعوھم مشرقین فاما تراء الجمعان قال اصحاب موسیٰ انا مدرکون قال کلا ان معی ربی سیہدین (شعرا) فاتبعھم فرعون یجنودہ فغشیھم من الیم ماغشیھم و اضل فرعون قومہ وما ہدی (طہ) و از لقنا ثم الاخرین و انجینا موسیٰ و من معہ اجمعین ثم اغرقنا الاخرین (شعرا) فانتقمنا منھم فاغرقناھم فی الیم بانھم کذبوا بایاتنا

۱۔ ”رہوا“ کا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب نے ”تھم“ کیا ہے اور شاہ رفیع الدین صاحب نے ”خشک“ کیا ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب نے ”ارمیدہ“ اور قاموس میں اس کے معنی لکھے ہیں ”المرتفع والمخضض ضد والسکون“۔

پیروی کرنے کے عادی تھے اور قرآن و مجید کے مطالب خواہ مخواہ کھینچ تان کر یہودیوں کی روایتوں کے موافق کرتے تھے اس نے

(بقیہ حاشیہ)

جس نے ان کو ڈھانک لیا اور غلط راہ پر لے گیا فرعون نے اپنی قوم کو اور ٹھیک رستہ نہ بتایا اور ہم نے پچھلوں کو قریب کر دیا اور ہم نے موسیٰ کو اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو بچا دیا پھر ہم نے پچھلوں کو ڈبو دیا پھر ہم نے بدلا لیا ان سے اور ہم نے ان کو سمندر میں ڈبو دیا اس لیے کہ بے شبہ انہوں نے ہماری نشانیاں کو جٹھلا دیا تھا اور اس سے

غافل تھے پھر پکڑا ہم نے فرعون کو اور اس کے لشکر کو اور ان کو ہم نے سمندر میں ڈال دیا۔ فرعون چاہتا تھا کہ ان کو زمین سے نکال دے پھر ہم نے اس کو ڈبو دیا اور سب کو جو اس کے ساتھ تھے اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل کو کہا کہ رہو اس زمین پھر جب آوے گا آخرت کا وعدہ تو ہم تم کو لائیں گے ملوان۔

ہم نے تم پر چھاؤں کی ابر کی اور تم پر من و سلویٰ اتارا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ مگر انہوں نے آپ اپنے اوپر ظلم کیا تھا اور ہم نے تم پر من و سلوے اتارا کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں اور اس میں زیادتی مت کرو تاکہ میرا غصہ تم پر نازل نہ ہو اور جس پر میرا غصہ نازل ہوا وہ ہلاک ہوا اور جدا کر دیے ہم نے بنی اسرائیل کے اسباط کے بارہ گروہ اور ہم نے موسیٰ پر وحی کی جب کہ اس کی قوم نے

و کانوا عنها غافلین  
فاخذناہ و جنودہ فنبذناہم  
فی الیم (قصص) فارادان یستفرہم  
من الارض فاغرقناہ و من  
معہ جمیعاً و قلنا من  
بعده لبنی اسرائیل اسکنو  
الارض فاذا جاء وعد الاخرة  
جئنا بکم لسفینا -  
(بنی اسرائیل)

و ظللنا علیکم الغمام  
وانزلنا علیکم المن  
والسلویٰ کلو من طیبات  
ما رزقناکم وما ظلمونا  
ولکن کانوا انفسہم  
یظلمون (بقرہ) ونزلنا علیکم  
المن والسلویٰ کلو من  
طیبات ما رزقناکم ولا تطغو  
فیہ فیحل علیکم غضبی  
ومن یحل علیہ غضبی  
فقد ہویٰ (طہ) وقطعناہم  
اثنتی عشرة اسباطا امّا و  
اوحینا الی موسیٰ اذا استسقاہ

انہوں نے اس جگہ بھی اور وہاں بھی جہاں قرآن میں آیا ہے  
فاضرب بعصاک الحجر فانفجرت منه اثنا عشرة

(یثیہ حاشیہ)

پانی مانگا کہ چل اپنی لاٹھی کے  
سہارے اس چٹان پر اس سے بہتے ہیں  
پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے - ان میں  
ہر ایک نے اپنا گھاٹ جان لیا کھاؤ  
اور پیو خدا کے رزق سے اور زمین پر  
مفسد ہو کر نافرمانی مت کرو جب تم  
نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ایک کھانے  
پر صبر نہیں کر سکتے پھر اپنے  
پروردگار سے دعا مانگا کہ ہمارے لیے  
وہ چیزیں نکالے جو زمین آگتی ہے -  
ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور  
اور پیاز اور لہسن موسیٰ نے کہا تم  
بدلتا چاہتے ہو برے کو بھلے سے جا  
اترو شہر میں کہ تم کو ملے گا جو  
تم مانگتے ہو - (بقرہ)

قومہ ان اضرب بعصاک الحجر  
فانفجرت (اعراف) فانفجرت  
منه اثنا عشرة عینا قد  
علم کل اناس مشربهم  
کلوا واشربوا من رزق الله ولا  
تعصوا فی الارض مفسدین  
(بقرہ) واذ قتلتم یا موسیٰ  
لن نصبر علی طعام واحد  
فادع لنا ربک ینزع لنا  
مما تنبت الارض من بقلها  
وقثاءها و فومها و  
عذسها و بصلها قال  
اتستبدلون الذی ہو  
ادنی بالذی ہو خیرا  
هبطوا مصر افان لکم  
ما سألتم -

اور ہم بنی اسرائیل کو دریا سے  
نکال لے گئے پھر وہ ایک ایسی قوم  
کے پاس آئے جو اپنے بتوں کی سیوا کرتے  
تھے بنی اسرائیل نے کہا کہ اے موسیٰ  
ہمارے لیے بھی ایسے معبود بنا جیسے  
ان کے معبود ہیں موسیٰ نے کہا کہ  
بے شک تم جاہل قوم ہو یہ خراب  
حالت ہے جس میں یہ لوگ ہیں اور  
غلط ہے جو یہ کرتے ہیں اور جب

وجاوزنا یبنی اسرائیل  
البحر فأتوا علی قوم  
یعکفون علی اصنام لهم  
قالوا یا موسیٰ اجعل لنا  
الہا کما لهم الہة قال  
انکم قوم تبہلون ان ہولاء  
متبر ماہم فیہ و باطل  
ما کانوا یعملون (اعراف)  
او اذ قلنا ادخلو هذه

عینا ضرب کے معنی زدن کے لیے اور سیدھے سادھے معجزہ کو ایک معجزہ خارج از قانون قدرت بنا دیا ۔

(بقیہ حاشیہ)

ہم نے تم سے کہا کہ داخل ہو اس شہر میں پھر کھاؤ اس میں سے جو چاہو پیٹ بھر کر اور داخل ہو دروازوں میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہو کہ ہم معافی چاہتے ہیں بخش دیں گے ہم تمہاری سب خطائیں اور نیکی کرنے والوں کو زیادہ دیں گے پھر ظالموں نے بات بدل دی اس کے سوا جو ان سے کہیں گئی تھی پھر ہم نے ان کی بدکاری کے سبب ان پر آسمان سے آفت بھیجی اور جب موسیٰ ہمارے وقت مقررہ پر آیا اور اس کے پروردگار نے اس سے بات کی تو اس نے کہا کہ تو مجھ کو اپنے تئیں دکھا دے تاکہ میں تجھ کو دیکھوں خدا نے کہا کہ تو مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتا لیکن تو اس پہاڑ کو دیکھ پھر اگر یہ پہاڑ اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو تو مجھ کو دیکھ سکے گا پھر جب اس کے پروردگار نے پہاڑ پر تجلی کی تو اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گرا پھر جب ہوش میں آیا تو کہا کہ تو پاک ہے اے اللہ میں توبہ کرتا ہوں تیرے سامنے اور میں پہلا ایمان لانے والا ہوں ۔ خدا نے کہا اے موسیٰ میں

القربہ فکلو منها حیث شئتم رغداً و ادخلوا الباب سجداً و قولوا حطة نغفرکم خطایا کم و سنزید المحسنین فبذل الذین ظلموا قولاً غیر الذی قیل لہم فارسلنا علیہم رجلاً من السماء بما کانوا یفستقون (بقرہ) یظلمون (اعراف) ولما جاء موسیٰ لمیقا تناء و کلمہ ربہ قال رب انی انظر الیک قال لن ترانی و لکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی فلما تجلی ربہ للجبل جعلہ دکا و خر موسیٰ صعقاً فلما افاق قال سبحانک تبت الیک و انا اول المومنین قال یموسیٰ انی اصطفتک علی الناس برسالاتی و بکلامی فخذ ما اتیتک و کن من الشاکرین (اعراف) واذ قلتم یا موسیٰ لن نومن لک حتی نری اللہ جہراً (بقرہ) و اختار موسیٰ قوبہ سبعین رجلاً لمیقاتنا (اعراف) فاخذتکم الصعقة

اس مقام پر حزب کے معنی زدن کے نہیں ہیں بلکہ چلنے کے  
یا جلد چلنے کے ہیں جیسے کہ عرب بولتے ہیں ”حزب فی الارض“

(بقیہ حاشیہ)

نے تجھ کو اور لوگوں پر اپنا رسول  
کرنے اور خود کلام کرنے سے برگزیدہ  
کیا ہے بھر جو میں تجھ کو دیتا  
ہوں اس کو لے اور شکر کرنے والوں  
میں ہو اور جب تم نے کہا اے  
موسیٰ ہم تجھ پر ایمان نہ لائیں گے  
جب تک کہ علانیہ خدا کو نہ  
دیکھیں اور موسیٰ نے ہمارے وقت  
مقررہ پر حاضر ہونے کے لیے اپنی قوم  
میں سے ستر آدمی چھانٹے بھر تم کو  
بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا اور یہ  
سب باتیں تم دیکھتے تھے پھر ہم  
نے تم کو تمہارے مر جانے (بیہوش  
ہو جانے) کے بعد اٹھایا کہ شاید  
تم شکر کرو۔ پھر جب ان کو کپ  
کپاٹنے نے پکڑا تو موسیٰ نے کہا  
اے پروردگار اگر تو چاہتا تو اس  
سے پہلے ہی ان کو اور مجھ کو بھی  
مار ڈالتا اور جب ہم نے تم سے قول  
لیا اور ہم نے تمہارے اوپر پہاڑ کو بلند  
کیا کہ مضبوط پکڑو جو کچھ ہم  
نے تم کو دیا ہے اور یاد رکھو جو کچھ  
اس میں ہے شاید کہ تم پیچ جاؤ اور  
جب ہم نے ان پر پہاڑ کو اٹھایا  
گویا کہ وہ سائبان تھا اور انہوں نے  
گناہ کیا کہ وہ ان پر گرے گا

وانتم تنظرون ثم بعثنکم  
من بعد موتکم لعلکم  
تَشکرون (بقر) فلما اخذتہم  
الرجفہ قال رب لو شئت  
اھلکتہم من قبل وایای (اعراف)  
وان اخذنا میثاقکم ورفعنا  
فوقکم الطور خذوا ما  
اتینکم بقوة و اذکروا  
ما فیہ لعلکم تتقون  
(بقر) و اذنتقنا الجبل  
فوقہم کانہ ظلۃ وظنوا انہ  
واقع بہم خذوا وما اتیناکم  
بقوة (اعراف) وما اعجلک  
عن قومک یا موسیٰ قال ہم  
آولاء علی اثری و عجلت الیک  
رب لترضی (طہ) واعدنا موسیٰ  
ثلثین لیلۃ و اتممنہا بعشر فتم  
میقات ربہ اربعین لیلۃ و قال  
موسیٰ لایخیرہ ہارون اخلفنی فی  
قومی و اصلح ولا تتبع سبیل  
المفسدین (اعراف) و اخذ  
قوم موسیٰ من بعدہ من  
حلبہم عجلا جسد الہ  
خوار (اعراف) قال فاننا قد  
فتنا قومک من بعدک  
و اضلہم السامری (طہ)

چلایا دوڑا زمین پر خود قرآن مجید میں آیا ہے - و اذا آخر یتھم  
فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوة

(بقیہ حاشیہ)

مضبوطی سے پکڑو جو ہم نے تم کو  
دیا ہے - ہم نے موسیٰ سے کہا کہ  
کیوں تو جلدی کر کے چلا آیا اپنی  
قوم کے پاس سے کہا وہ بھی میرے  
پیچھے ہیں اور میں تیرے پاس جلدی  
چلا آیا ہوں تاکہ اے پروردگار تو  
راضی ہو اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ  
سے تیس رات کا اور ہم نے پورا کیا  
اس کو دس سے پھر تمام ہو گئی ميعاد  
اس کے پروردگار کی چالیس رات اور  
موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا  
کہ میری قوم میں میرا خلیفہ ہو اور  
اصلاح کر اور مفسدوں کے طریق کی  
پیروی مت کر - موسیٰ کی قوم نے اس  
کے بعد اپنے زبور سے ایک بچھڑے کا  
پتلا بنایا جس میں سے آواز نکلتی تھی  
خدا نے موسیٰ سے کہا کہ ہم نے  
تیرے بعد تیری قوم کو فتنہ میں  
ڈالا اور سامری نے ان کو گمراہ کر  
دیا - پھر سامری نے ان کے لیے بچھڑے  
کا پتلا بنایا جس میں آواز نکلتی تھی  
پھر وہ بولے کہ یہ ہے ہمارا خدا اور

فاخرج لهم عجلا جسدا له  
خوار فقالو هذا الهکم والہ موسیٰ  
فنبی افلا یرون ان لا یرجع  
الیہم قولہ ولا یملک لهم  
ضروا ولا نفعما ولقد قال  
لهم ہارون من قبل یا قوم  
انما فتنتکم بہ وان ربکم  
الرحمان فاتوبوا واطیعوا  
امری قالو الن نبرح علیہ  
عاکفین حتی یرجع الینا  
موسیٰ (طہ) فرجع موسیٰ الی  
قومہ غضبان اسقا (طہ)  
قال موسیٰ لقومہ یا قوم  
انکم ظلمتم انفسکم بانھا ذکم  
العجل فتوبوا الی  
بارئکم فاقتلوا انفسکم  
ذالکم خیر لکم عند ربکم  
ربکم (بقرہ) ان الذین اتخذوا  
العجل سینالہم غضب  
من ربہم و ذلۃ فی الحیوۃ  
الدنیا (اعراف)

موسیٰ کا خدا تو بھول گیا کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ان کی بات کا الٹ  
کر جواب نہیں دیتا اور نہ ان کے لیے ضرر اور نہ نفع پہنچانے کا مالک ہے  
اور پہلے ہی ہارون نے ان سے کہا تھا کہ اے قوم اس کے سوا کچھ  
نہیں کہ تم اس سے فتنہ میں ڈالے گئے ہو اور بے شک تمہارا پروردگار رحم  
والا ہے - میری پیروی کرو اور میرے حکم کی اطاعت کرو انہوں نے کہا



(نساء) یعنی جب تم چلو زمین پر یعنی سفر کرو تو کچھ حرج نہیں ہے۔ کہ نماز میں کمی کرو، پس صاف معنی یہ ہیں کہ خدا

(بقیہ حاشیہ)

کہ ہم اس کی سیوا کیا کریں گے جب تک کہ موسیٰ لوٹ کر نہ آوے پھر موسیٰ اپنی قوم کے پاس لوٹ کر آیا غصہ میں بھرا ہوا انسوس کرتا ہوا موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم نے اس بچھڑے کے بنانے میں اپنی جانوں پر ظلم کیا توبہ کرو اللہ کے سامنے اور مار ڈالو اپنی جانوں کو کہ یہی تمہارے حق میں تمہارے خدا کے نزدیک بہتر ہے جن لوگوں نے بچھڑا بنایا قریب ہے کہ ان کے پروردگار کا غصہ ان تک پہنچے گا اور ذلت دنیا کی اس زندگی میں۔

موسیٰ نے کہا اے قوم میری کیا تم سے خدا نے وعدہ نہیں کیا تھا اچھا وعدہ اور کیا ایک لمبا زمانہ تم پر گذر گیا تھا بلکہ تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غصہ اترے اس لیے تم نے میرے وعدے کے برخلاف کیا موسیٰ نے کہا کہ بہت برا کیا تم نے میرے بعد کیا جلدی کی تم نے اپنے پروردگار کے حکم میں اور پھینک دیا الواح توریت کو اپنے بھائی کے سر کے بال پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اس نے کہا کہ اے میرے ماں جائے ان لوگوں نے مجھ کو کمزور جانا تھا اور مجھ کو مارے ڈالتے تھے پھر میرے دشمنوں کو مت خوش کرو اور مت کرو مجھ کو ان ظالموں کے ساتھ۔ مجھ کو یہ ڈر تھا کہ تو یہ کہے گا تو نے تفریق ڈال دی بنی اسرائیل میں اور نہ انتظار کیا تو

قال یا قوم الم یعدکم ربکم وعد احسننا افطال علیکم العهد ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی (طہ) قال بیشا خلفتمونی من بعدی اعجلتم امر ربکم والقی الواح واخذ براس اخیه یجره الیه قال ابن ام ان القوم استضعفونی وکادوا یقتلوننی فلا تشمت بی الاعداء ولا تجعلنی مع القوم الظالمین (اعراف) انی خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل ولم ترقب قولی (طہ) قالو ما اخلفنا موعدک بملکننا ولکننا حملنا اوزار امن زینة القوم فقد فناها فکذالک القی

نے حضرت موسیٰ کو کہا کہ ”اپنی لاٹھی کے سہارے سے سمندر میں چل وہ پھٹا ہوا یا کھلا ہوا ہے یعنی پایاب ہو رہا ہے“

(بقیہ حاشیہ)

نے میری بات کا انہوں نے کہا ہم نے تو اپنے اختیار سے تیرے وعدے کے خلاف نہیں کیا بلکہ ہم قوم (قبطی) کے زیور کا بوجھ اٹھا رہے تھے پھر ہم نے اس کو پھینک دیا اور اسی طرح پھینک دیا سامری نے۔ پھر سامری نے بچھڑے کی مورت بنائی جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ موسیٰ نے کہا اے سامری تیرا کیا حال ہے اس نے کہا مجھے وہ بات

انسامری (طہ) قال فہا خطبک یا سامری قال بصرت بمالم یبصروا بہ فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتها وكذلك سعلت فی نفسی قال فاذہب فان لک فی الحیوۃ ان تقول لامساک - (طہ)

سمجھائی جو ان کو نہیں سمجھائی پھر میں نے پیغمبروں کے ہانوں تلے کے نشان کی مٹی لی پھر میں نے بچھڑے میں ڈال دی اور اسی طرح کرنا میرے دل نے مجھے اچھا بتایا موسیٰ نے کہا کہ دور ہو تجھ کو اس دنیا میں یہی سزا ہے کہ تو کہتا رہے گا کہ میرے پاس مت آؤ۔

پھر جب موسیٰ کا غصہ تھا تو اس نے الواح کو اٹھا لیا اور اس میں ان کے لیے ہدایت اور رحمت تھی جو ڈرتے ہیں۔ پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی جو لوگ نیکی کرنے والے ہیں ان پر تعمت پوری کرنے کو اور ہر چیز کی تفصیل بتانے کو اور ہدایت اور رحمت کرنے کو کہ شاید وہ اپنے پروردگار سے ملنے پر ایمان لائیں۔

فلما سکت عن موسی الغضب اخذ اللواح وفی نسختها ہدی ورحمة للذین ہم یرہبون (اعراف) ثم آتینا موسی الکتاب تماماً علی الذی احسن و تفصیلاً لکل شیئ و ہدی و رحمة لعلہم یلقاء ربہم یومنون (انعام) و اذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل وبعثنا منہم اثنا عشر نقیباً و قال اللہ انی معکم لان اقمتم الصلوۃ

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا اور ان میں سے بارہ سردار کوڑے کیے اور خدا نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم قائم

سورہ طہ میں جو آیت ہے اس میں صاف بیان ہوا ہے کہ میرے بندوں کو رات کو سمندر میں سوکھے رستے سے لے کر نکل چل پس جو

(بقیہ حاشیہ)

کرتے رہو گے نماز اور تم دیتے رہو گے زکوٰۃ اور تم ایمان لاتے رہو گے میرے رسولوں پر اور تم مدد کرتے رہو گے ان کی اور تم قرض دیتے رہو گے اللہ کو قرض حسنہ ۔

جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا تم کو یہ حکم کرتا ہے کہ ذبح کرو بیل کو انہوں نے کہا کہ کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے موسیٰ نے کہا کہ میں تو اللہ سے پناہ مانگتا ہوں جاہل قوم سے انہوں نے کہا کہ اپنے پروردگار سے پوچھ کہ ہم کو بتلاوے کہ وہ کیسا بیل ہو کہہا کہ وہ بیل نہ بوڑھا ہو اور نہ بچہ میابہ سال ان دونوں کے بیچ میں کرو جو تم کو حکم دیا جاتا ہے ۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے پوچھ کہ بتلاوے کیا ہو اس کا رنگ موسیٰ نے کہا کہ خدا کہتا ہے کہ وہ بیل ڈھڈھاتے زرد رنگ کا ہو اس کا رنگ خوش کرتا ہو دیکھنے والوں کو انہوں نے کہا کہ پوچھ ہمارے لیے اپنے پروردگار سے کہ بتلاوے وہ کیسا ہے کہ ہم پر بیل مشتبہ ہو گئے ہیں اور اگر خدا نے چاہا تو ہم ہدایت پاویں گے ۔

واتیتکم الزکوٰۃ و آمنتم برسولی وعززتموہم و اقرضتم اللہ قرضاً حسناً ۔ (مائتہ)

اذ قال موسیٰ لقومہ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرة قالوا اتتخذنا ہزوا قال اعوذ باللہ ان اکون من الجاہلین قالوا ادع لنا ربک یمین لنا ماہی قال انہ یقول انہا بقرة لا فارض ولا بکر عوان بین ذالک فافعلو ما تو مروں قالوا ادع لنا ربک یمین لنا ما لونہا قال انہ یقول انہا بقرة صفرا فافع لونہا تسر الناظرین قالوا ادع لنا ربک یمین لنا ماہی ان البقر تشابہ علینا وانا ان شاء اللہ لمہتدون قال انہ یقول انہا بقرة لا ذلول تثیر الارض ولا تسقى السحرث مسلمة لاشبہ فیہا قالوا الان جئت بالحق فذبحوها وما کادوا یفعلون (بقر)

معجزہ تھا وہ یہی تھا کہ ایسے مشکل کے وقت میں سمندر کے پایاب ہونے سے خدا تعالیٰ نے موسیٰ کو اور تمام بنی اسرائیل کو

(بقیہ حاشیہ)

موسیٰ نے کہا کہ خدا کہتا ہے کہ وہ ایسا بیل ہو جو نہ جوتا ہو کہ زمیں کو پھاڑے یا کھیتی کو پانی دے اس کے تمام اعضا مسلم ہوں اور اس میں کوئی دھبہ نہ ہو انہوں نے کہا اب تو نے ٹھیک بات بتائی پھر انہوں نے ذبح کیا اور کرتے نہیں لگتے تھے اے لوگو تم اس پاک زمین میں داخل ہو جو خدا نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور مت پھرو اپنے پیٹ کے بل پیچھے پھرو پلٹو گے نقصان اٹھانے والے انہوں نے کہا اے موسیٰ اس میں تو بہت زبردست قوم رہتی ہے ہم ہرگز اس میں نہیں جائیں گے جب تک کہ وہ اس میں سے نہ نکل جاویں گے جب وہ اس زمین سے نکل جاویں گے تب ہم اس میں داخل ہوں گے ان میں سے دو آدمیوں نے کہا کہ جو خدا سے ڈرتے تھے جن پر خدا نے نعمت کی تھی کہ اے لوگو جا گھسو اس قوم کے دروازہ میں جب تم جا گھسو گے تم ہی غالب ہو گے اور خدا ہی پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان لانے

یا قوم ادخلوا الارض المقدسة التي كتب الله لكم ولا ترتدوا على ادباركم فتنقلبوا خسرين قالوا يا موسیٰ ان فیہا قوما جبارین وانا لن ندخلہا حتی یخرجوا منها فان یخرجوا منہا فانا داخلون قال رجلان من الذین یخافون انعم الله علیہما ادخلوا علیہم الباب فاذا دخلتموه فانکم غالبون و علی الله فتوکلوا ان کنتم مومنین قالوا یا موسیٰ انالن ندخلہا ایدا ماداموا فیہا فاذہب انت وریک فقاتلانا ہہنا قاعدون قال رب انی لا املک الا نفسی و اخی فافرق بیننا و بین القوم الفاسقین قال فانہا محرمة علیہم اربعین سنة یتیمہون فی الارض فلا تاس علی القوم الفاسقین -

(مائدہ)

والے ہو - انہوں نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز اس میں نہیں گھسیں گے جب تک کہ وہ اس میں ہیں تو جا اور تیرا پروردگار تم دونوں لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں - موسیٰ نے کہا اے پروردگار مجھ کو اختیار نہیں

فرعون کے پنچے سے بچا دیا اور جب فرعون نے پایاب اترنا چاہا تو پانی بڑھ گیا تھا وہ مع اپنے لشکر کے ڈوب گیا ۔

اس مقام پر یہ بحث پیش آوے گی کہ جب ”حزب“ کے معنی چلنے کے آتے ہیں اس کے صلہ میں ”فی“ کا لفظ آتا ہے جیسے کہہ ”اذ اضربتم فی الارض“ میں ہے حالانکہ ”فاضرب بعصاک البحر“ اور ”فاضرب بعصاک الحجر“ میں ”فی“ نہیں ہے مگر ”فی“ کے نہ ہونے سے کچھ ہرج نہیں ہے اس لیے کہ جب ”ضرب“ کے معنی چلنے کے لیے جاتے ہیں تو بواسطہ حرف جر یعنی ”فی“ کے متعدی کیا جاتا ہے اور جو افعال کہ بواسطہ جر کے متعدی ہوتے ہیں ان میں حرف جر کو محذوف کرنا اور فعل کو بلا واسطہ مفعول کی طرف متعدی کرنا جائز ہے اور اس مفعول کو منصوب علی نزع الخافض کہتے ہیں ۔

اس مقام پر ”اضرب“ کے ”عصا“ کے ساتھ ربط دینے کو ایک حرف جر یعنی ”ب“ ، ”عصا“ پر آ چکی تھی پھر اس فعل کو مفعول کی جانب متعدی کرنے کے لیے دوسرے حرف جر یعنی ”فی“ کا لانا کسی قدر فصاحت کلام کے مناسب نہ تھا اور اس لیے اس کا حذف اولیٰ تھا ۔ پس تقدیر کلام کی یہ ہے کہہ ”فاضرب بعصاک البحر“ اور قرینہ حذف ”فی“ کا خود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے کیوں کہ یہی قصہ انہی الفاظ سے سورہ طہ میں بھی آیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ ”فاضرب لہم طریقاً فی البحر“ پس ایک جگہ لفظ ”فی“ مذکور ہے تو یہی قرینہ باقی مقامات میں اس کے محذوف ہونے کا ہے ۔ اسی آیت میں فعل ”اضرب“ کے بلاواسطہ حرف جر متعدی الی المفعول ہونے کی مثال بھی موجود ہے ۔ شاہ ولی اللہ صاحب

(بقیہ حاشیہ)

مگر اپنی جان پر اور اپنے بھائی پر پھر ہم میں اور اس بدکار قوم میں فرق کر خدا نے فرمایا کہ وہ حرام کر دی گئی ہے آن پر چالیس برس تک وہ ٹکراتے پھریں گے زمین میں اور تو رنج مت کر اس بدکار قوم پر ۔

نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے کہ ”پس برو برائے ایشاں در راہ خشک“ یعنی شاہ صاحب نے ”ضرب“ کے معنی زدن کے نہیں لیے ’رفتن‘ کے لئے ہیں جو لازمی ہے اور لفظ ”طریقاً“ اس آیت میں ”اضرب“ کا مفعول ہے اور بلا واسطہ حرف جر متعدی الی المفعول ہوا ہے ۔

جغرافیہ کے نقشوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ خلیج عرب اور بحر احمر عدن کے پاس مل گئے ہیں دونوں طرف پہاڑ ہیں اور ان کے بیچ میں نہایت تنگ رستہ ہے جو جہاز خلیج عرب سے بحر احمر میں جاتے ہیں وہ اسی تنگ رستہ میں ہو کر گزرتے ہیں اس رستہ کو طے کرنے کے بعد بحر احمر ملتا ہے جو نہایت بڑا اور وسیع سمندر ہے جب اس کے شمال کی طرف چلے جاؤ تو اخیر کو آس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں ”اگر تم اپنے دائیں ہاتھ کو چت کر کر سب انگلیاں بند کرو اور صرف بیچ کی انگلی اور کلمے کی انگلی کھول دو اور دونوں کو پھیلا کر تانو تو بحر احمر کی شاخوں کی بالکل صورت بن جاوے گی ۔ کلمہ کی انگلی دائیں طرف رہے گی اور بیچ انگلی بائیں طرف اور ان دونوں کے بیچ میں ایک مثلث کی صورت دکھائی دے گی ۔ بحر احمر کی دائیں شاخ جو جانب شرق ہے چھوٹی ہے جیسے کہ کلمہ کی انگلی چھوٹی ہے اور بائیں شاخ جو جانب غرب ہے کسی قدر بڑی ہے جیسے کہ بیچ کی انگلی بڑی ہے اور یہ سمجھو کہ بیچ کی انگلی یعنی بڑی شاخ کے بائیں طرف مصر ہے اور ان دونوں انگلیوں کے بیچ میں جو مثلث جگہ ہے وہ جگہ ان جنگلوں اور پہاڑوں کی ہے جہاں بنی اسرائیل چالیس برس تک ٹکراتے پڑے پھرے اور اسی جگہ کوہ سینا یا کوہ طور ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تجلی ہوئی اور توریت ملی ۔

جس زمانے میں بنی اسرائیل مصر میں رہتے تھے اور فرعون

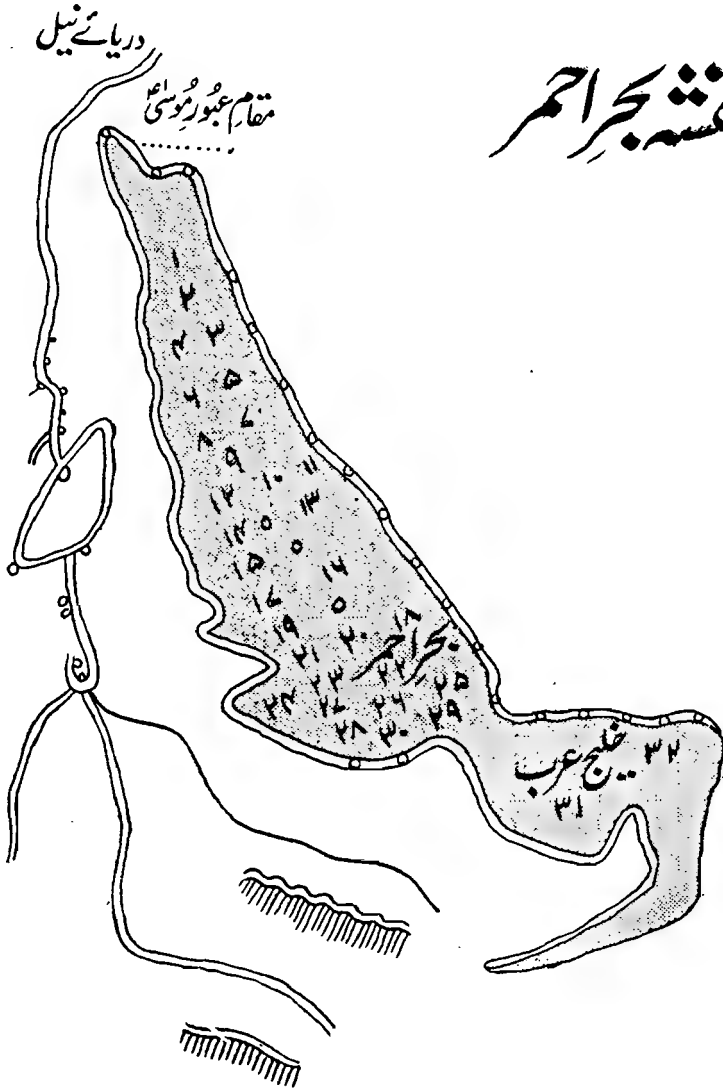
مشہور بادشاہ تھا اس زمانہ میں اس کا دارالسلطنت شہر رامیس تھا اس کے بائیں طرف تھوڑے فاصلہ پر دریائے نیل تھا اور دائیں طرف یعنی جانب مشرق تین منزل کے فاصلہ پر بحر احمر کی بڑی شاخ تھی حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو شہر رامیس سے لے کر نکلے پہلی منزل ”سکوت“ میں ہوئی دوسری منزل ”ایٹام“ میں تیسری منزل ”فہا حیروت“ میں یہ مقام بحر احمر کی بڑی شاخ کے بائیں کنارہ پر یعنی جانب غرب - اُس شاخ کی نوک کے پاس واقع تھا - جب فرعون نے مع اپنے لشکر کے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا - تو راتوں رات حضرت موسیٰ اسرائیل سمیت بحر احمر کی بڑی شاخ کی نوک میں سے جہاں ہم نے نقشہ میں نقطوں کا نشان کر دیا ہے پار اتر گئے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بہ سبب جوار بھائے کے جو سمندر میں آتا رہتا ہے اس مقام پر کہیں خشک زمین نکل آتی تھی اور کہیں پایاب رہ جاتی تھی بنی اسرائیل پایاب و خشک راستہ سے راتوں رات بہ امن اتر گئے۔ یہی مطلب صاف اس آیت سے پایا جاتا ہے - جو سورہ دخان میں ہے کہ ”و اترک البحر رہوا“ جس کا ٹھیک مطلب یہ ہے کہ چھوڑ چل سمندر کو ایسی حالت میں کہ اُترا ہوا ہے - صبح ہوتے فرعون نے جو دیکھا کہ بنی اسرائیل پار اتر گئے اس نے بھی ان کا تعاقب کیا اور لڑائی کی گاڑیاں اور سوار پیادے غلط رستے پر سب دریا میں ڈال دیے اور وہ وقت پانی کے بڑھنے کا تھا لمحہ لمحہ میں پانی بڑھ گیا جیسے کہ اپنی عادت کے موافق بڑھتا ہے اور دباؤ ہو گیا جس میں فرعون اور اس کا لشکر ڈوب گیا -

علمائے اسلام کا زمانہ گیارہ بارہ سو برس سے سمجھنا چاہیے ان بزرگوں نے جو اپنے ہوش سے بحر احمر اور اس کی شاخ اُس کو جس میں سے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل نے عبور کیا تھا نہایت عمیق اور ایک قہار سمندر دیکھا ہے اور ان کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا

تھا کہ کیسا ہی بڑا جوار بھاٹا آوے وہ جگہ کبھی پایاب نہیں ہو سکتی اس لیے انہوں نے قرآن مجید کی صاف صاف عبارت اور الفاظ کو جو صریح جوار بھاٹے اور خشک زمین کے نکل آنے پر دلالت کرتی تھی آلت پلٹ کر اس واقعہ کو بطور ایک عجیب واقعہ کے بنایا اور ایسا معجزہ جو قانون قدرت کو بھی توڑ دے ٹھہرا دیا۔ مگر حقیقت حال یہ نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں جب بنی اسرائیل نے عبور کیا بحر احمر ایسا قہار سمندر نہ تھا جیسا کہ اب ہے۔ گو اُس زمانہ کا صحیح جغرافیہ ہم کو نہ ملے مگر بہت پرانا جغرافیہ جو بطلمیوس نے بنایا تھا مع اس کے نقشہ جات کے جو بطلمیوس کے جغرافیہ کے مطابق بنائے گئے ہیں خوش قسمتی سے ہمارے پاس موجود ہے اور اس میں بحر احمر کا بھی نقشہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بطلمیوس کے زمانہ تک بحر احمر میں تیس چھوٹے بڑے جزیرے موجود تھے اور یہ صاف دلیل اس بات کی ہے کہ اس زمانہ میں بحر احمر ایسا قہار سمندر نہ تھا جیسا کہ اب ہے یا جیسا کہ ہمارے علمائے اسلام بارہ سو برس سے اس کو دیکھتے آئے ہیں۔ بحر احمر کی اس حالت پر خیال کرنے سے بالکل یقین ہو جاتا ہے کہ وہ مقام جہاں سے بنی اسرائیل اترے تھے بلاشبہ جوار بھاٹے کے سبب رات کو پایاب اور دن کو عمیق ہو جاتا ہوگا۔ مزید توضیح کے لیے بطلمیوس کے جغرافیہ میں سے بعینہ بحر احمر کے نقشہ کو ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔ یہ جغرافیہ ہمارے پاس اصل یونانی زبان میں جس میں بطلمیوس نے لکھا تھا مع لیٹن ترجمہ کے موجود ہے۔ جو ۱۶۱۸ء میں لوئیس سیزدہم شاہ فرانس کے عہد میں چھپا تھا۔ اس میں وہ تمام جزیرے جو بحر احمر میں موجود تھے مندرج ہیں۔ مؤرخین کے قول کے بموجب بنی اسرائیل منہ عیسوی سے دو ہزار پانسو تیرہ برس قبل بحر احمر کی شاخ سے اترے تھے اور بطلمیوس جس نے جغرافیہ لکھا تھا اور جس کو گلاڈیوس ٹالمی



کہتے ہیں سنہ عیسوی کی دوسری صدی میں تھا پس بنی اسرائیل کے عبور کرنے کے دو ہزار سات سو برس بعد تک وہ جزیرے موجود تھے۔ یہ بطلموس یونانی تھا مگر مصر میں رہتا تھا اور اس لیے



بحر احمر کا جو حال اس نے لکھا ہے زیادہ اعتبار کے لائق ہے سمندر کے جزیرے مدت تک نکلے رہتے ہیں اور پھر کسی زمانہ میں ان اسباب سے جن کا ذکر علم جیالوجی میں ہے دفعۃً زمین میں بیٹھ جاتے ہیں اور جہاں لوگ بستے تھے اور جن پایاب مقامات پر لوگ چلتے تھے وہاں دفعۃً میلوں گہوا پانی ہو جاتا ہے اسی طرح بطلموس کے زمانہ کے بعد کسی وقت میں یہ جزیرے بھی جو بحر احمر میں تھے غائب ہو گئے ہیں اور اب ہم کو اتنا بڑا قہار سمندر دکھائی دیتا ہے مگر موسیٰ کے عہد میں ایسا نہ تھا اور اس بات پر یقین کرنے کی بہت سی وجوہات ہیں کہ حضرت موسیٰ کو اس مقام پر سمندر کے پایاب ہو جانے کا حال معلوم تھا اور اسی سبب سے یہ رستہ انہوں نے اختیار کیا تھا۔ کیوں کہ سمندر کے پار ایسے جنگل و پہاڑ تھے جس میں فرعون کو لشکر لے جانا اور بنی اسرائیل کا تعاقب کرنا غیر ممکن تھا۔

### اسماء جزیرہ ہائے بحر احمر .

۱- تمی جینس	۱۱- جریکم	۲۱- اکبن تھین
۲- وئرس	۱۲- سیٹی رورم	۲۲- کیم بستا
۳- زجینیا	۱۳- کیٹی ٹھری	۲۳- مکبرنیا
۴- اگٹی تھونس	۱۴- میروئس	۲۴- ارنیان
۵- دیوم	۱۵- تھرب ڈی ڈیس	۲۵- بیکائی
۶- اسارٹی	۱۶- سا کرٹیس	۲۶- بیکائی
۷- پالی پیچ	۱۷- مجورم	۲۷- ایڈینی
۸- ایر اپلیڈس	۱۸- گارڈی منیڈ	۲۸- ڈایو دوارے
۹- جیسی ٹس	۱۹- ڈیف نین	۲۹- پینس
۱۰- گوما ڈیرم	۲۰- ایری	۳۰- اسی ڈس

(عجل) بچھڑا بنانے کا واقعہ اس وقت ہوا تھا جب کہ۔

حضرت موسیٰ چالیس دن رات پہاڑ پر جا کر رہے تھے۔ بنی اسرائیل نے بچپن سے مصریوں میں پرورش پائی تھی اور دیکھا کرتے تھے کہ وہ ساری قوم بتوں اور جانوروں کی پرستش کرتی ہے مصری بندر اور سانپ اور بیل اور اور بہت سے قسم کے جانوروں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ جب بنی اسرائیل سمندر کے پار ہوئے تو وہاں بھی انہوں نے بتوں کی پرستش کرتے ہوئے لوگوں کو پایا اور موسیٰ سے کہا کہ ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنا دے (یہ قصہ سورہ اعراف میں ہے) گان غالب ہوتا ہے کہ وہ لوگ بچھڑے ہی کی مورت کی پوجا کیا کرتے ہوں گے اور اسی کی نقل پر بنی اسرائیل نے بھی بچھڑے کی مورت بنائی تھی۔ جس کے سبب خدا کی خفگی ہوئی۔

(فاقتلوا) اس آیت سے یہ بات نہیں پائی جاتی کہ بنی اسرائیل میں سے کسی ایک نے بھی اپنے آپ کو مار ڈالا تھا کیوں کہ یہ کہنا کہ ”مار ڈالو اپنے آپ کو“ حضرت موسیٰ کا قول ہے اور یہ کہنا ایسی طرح کا کہنا ہے جیسے کوئی بزرگ کسی کو نفریں کرتے وقت کہے کہ ڈوب مر ایسا کرنے سے تو تیرا مرنا بہتر ہے۔ پس بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰ کے غصہ کے یہ الفاظ ہیں خدا نے اُن کو اپنے تئیں آپ مار ڈالنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ نہ اُن میں کسی نے اپنے تئیں آپ مار ڈالا تھا یہ مطلب اس آیت کے پچھلے حصہ سے جس میں معاف کر دینے کا ذکر ہے زیادہ تر صاف ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی تھی انہی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ ”پھر خدا نے تم کو معاف کیا۔“

(نری اللہ جہرۃ) انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے کی خواہش تین طرح پر پیدا ہوتی ہے اس کا حال اور اوصاف سننے

سے یا دل میں کسی خاص قسم کا ذوق و شوق پیدا ہو جانے سے یا اس کا حال کہنے والے کی بات پر یقین نہ کرنے سے ، موسیٰ کو بھی خدا کے دیکھنے کا شوق ہوا مگر وہ شوق دوسری قسم کا تھا جس کے غلبہ میں انسان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور ہونی نہ ہونی بات کہہ اُٹھتا ہے ۔ بنی اسرائیل نے بھی خدا کو دیکھنا چاہا مگر یہ ان کا سوال تیسری قسم کا تھا وہ موسیٰ کی اس بات پر کہ خدائے پروردگار عالم موجود ہے اور اس نے موسیٰ کو اپنا پیغمبر کیا ہے یقین نہیں لاتے تھے اور اس بنا پر انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو دکھا دے جب تک ہم علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیوں گے تجھ پر ایمان نہ لاویں گے ۔ حضرت موسیٰ اپنے شوق کے سبب جس میں انسان کو ڈھول ہو جاتا ہے بھول گئے کہ خدا ان آنکھوں سے دکھائی نہیں دے سکتا اور بنی اسرائیل نے اپنی حماقت سے یہ چاہا کہ علانیہ خدا کو ہم دیکھ لیں اور یہ نہ سمجھے کہ خدا اپنے تئیں نہ کسی کو دکھا سکتا ہے اور نہ کوئی خدا کو دیکھ سکتا ہے ۔ ہر کوئی اس کی قدرت کا کرشمہ دیکھتا ہے اور اسی سے اس کی ذات کے موجود ہونے پر یقین لاتا ہے ۔

(صاعقہ) صاعقہ کے معنی لغت میں ، موت کے بھی ہیں اور عذاب مہلک کے بھی ہیں ۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس عذاب سے کوئی ہلاک ہوئے بغیر رہے ہی نہیں اور عذاب یا بلا آنے کی سنسناہٹ اور گڑ گڑاہٹ اور کڑک کے معنی بھی آتے ہیں اور بجلی آسمان پر سے گرنے والی آگ کے معنی بھی ہیں اور ”صعق“ یکسرالعین کے معنی ”غشی علیہ“ یعنی بے ہوش کیا گیا ۔

اب دیکھنا چاہیے کہ اس جگہ فاخذتکم الصاعقۃ کے کیا معنی ہیں ۔ موت کے معنی تو یہاں ہو ہی نہیں سکتے ۔ اس لیے کہ ”وانتم تنظرون“ کا مطلب غلط ہو جاتا ہے ۔ کیوں کہ

موت کی نسبت ”واتم تنظرون“ نہیں کہہ سکتے۔ امام فخرالدین رازی بھی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ یہاں صاعقہ کے معنی موت کے نہیں ہیں کیوں کہ موت کی نسبت ”تنظرون“ نہیں آ سکتا اور اس کے سوا خدا نے سورہ اعراف میں فرمایا ہے ”وخر موسیٰ صعقا“ اور پھر فرمایا ہے ”فلما افاق“ اور افاقہ موت سے نہیں ہوتا بلکہ غشی سے ہوتا ہے، سورہ اعراف میں ”صاعقہ“ کی جگہ ’رجفہ‘ فرمایا ہے جس کے معنی کب کپاھٹ کے ہیں۔ غرضکہ اس جگہ ”صاعقہ“ کے معنی موت کے نہیں ہیں بلکہ ٹھیک معنی، گرج اور گڑ گڑاھٹ کے ہیں خواہ وہ گرج بجلی کی ہو خواہ وہ گڑ گڑاھٹ بادل کی ہو یا کسی آتشیں پہاڑ کی یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب کہ اسی آیت میں ہے کہ ”ثم بعثنا کم من بعد موتکم“ تو یہ ایک قومی ثبوت اس بات کا ہے کہ یہاں ’صاعقہ‘ کے معنی موت کے ہیں مگر مفسرین اور خصوصاً امام فخرالدین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ کبھی، بعث کا اطلاق ”لا بعد الموت“ پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے کہ خدا نے فرمایا ہے کہ فضرربنا علی اذانہم فی الکھف سنین عداداً ثم بعثنا ہم پس بعثنا کے لفظ سے تو، صاعقہ کے معنی موت کے لینے پر استدلال نہیں ہو سکتا رہا لفظ، ”موت“ کا اس کی نسبت مفسرین نے نہایت سہل رستہ اختیار کیا ہے جو ہم کو نہایت ہی مشکل اور پیچ دار معلوم ہوتا ہے انہوں نے فرمایا کہ محققین کا یہ قول ہے کہ ”صاعقہ“ سے مراد تو سبب موت ہے اور موت کے معنی موت ہی کے ہیں خدا نے ان لوگوں کو جو خدا کو دیکھنے گئے تھے صاعقہ سے جو سبب ان کی موت کا ہوا مار ڈالا اور پھر حضرت موسیٰ کی دعا سے اور گڑ گڑا کر یہ کہنے سے کہ یہ تو ستر کے ستر مر گئے اب بنی اسرائیل کو میں کیا جواب دوں گا

اور میری نبوت کی گواہی کون دے گا خدا نے پھر ان کو زندہ کر دیا۔

مگر میری سمجھ میں خدائے پاک کا کلام ایسا بودا نہیں ہے بلکہ جیسا اس کا قانون قدرت مستحکم اور مضبوط ہے ایسا ہی اس کا کلام بھی مضبوط ہے۔ جب کہ ہم کو یہ ثابت ہو گیا کہ صاعقہ کے معنی 'موت' کے نہیں ہیں بلکہ اس مقام پر ہو بھی نہیں سکتے اور 'بعث' کا اطلاق "لا بعد الموت" پر بھی آتا ہے تو ہم لفظ، موت، کو اس کے حقیقی معنوں پر یعنی بدن سے جان نکل جانے پر اطلاق نہیں کر سکتے بلکہ مردے کے مانند ہو جانے پر اطلاق کرتے ہیں اور اس کی دلیل خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس لیے کہ جو واقعہ اس مقام پر بیان ہوا ہے وہی واقعہ سورہ اعراف میں بھی آیا ہے اور وہاں یہ فرمایا ہے۔ "فلما اخذتهم الرجفة قال رب لو شئت اهلكتهم من قبل وایای"۔ یعنی بنی اسرائیل میں سے ستر آدمی جو خدا کے دیکھنے کے لیے گئے تھے ڈر کے مارے کانپنے لگے تو حضرت موسیٰ نے کہا کہ اے پروردگار اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی ان کو اور مجھ کو بھی مار ڈالتا۔

اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ ان کے مرنے تک نبوت نہ پہنچی تھی یا بے ہوش ہو گئے تھے یا ان کی حالت مردے کی سی ہو گئی تھی اور اسی سبب سے یہاں ان پر مردہ کا اطلاق کیا گیا ہے علاوہ اس کے حضرت موسیٰ پر بھی پروردگار کی تجلی ہوئی تھی جس کے سبب پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا وہاں یہ لفظ "وخر موسیٰ صعقا" یعنی موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا، سورہ احزاب میں خود خدا تعالیٰ نے خوف کی حالت کو

۱۔ فاذا جاء الخوف رايتهم ينظرون اليك تزروا رائيم  
کالذی یغشی علیہ من الموت (احزاب)، ۱۹۔

موت کی بے ہوشی کی حالت سے تشبیہ دی ہے پس ان سب آیتوں کے ملانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر بھی یہی حالت گزری تھی۔

’موت‘ کے لفظ کا نہایت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ امام فخرالدین رازی اور صاحب تفسیر ابن عباس نے سورہ زمی کی تینتالیسویں آیت میں لفظ موت کو بہ معنی نوم قرار دیا ہے، ’حین موتہا‘ کی تفسیر ’حین منامہا‘ اور قرآن مجید میں رنج میں پڑے رہنے پر بھی موت کے لفظ کا استعمال ہوئے جہاں سورہ آل عمران میں فرمایا ہے ”قل موتوا بيسظکم“ یعنی اپنے غصہ سے مر جاؤ۔ یعنی اس میں مبتلا رہو ڈھے ہوا ہے شہر غیر آباد یا فصل گزری ہوئی زمین پر بھی موت کا استعمال ہوتا ہے بے جان یا معدوم شے پر بھی موت کا لفظ بولا جاتا ہے جہاں فرمایا ہے کہ کذتم امواتاً فاحیاءکم ثم یحیتکم ثم یحببکم اور جگہ فرمایا ہے یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی غرض کہ جہاں تک غور کیا جاتا ہے اس مقام پر لفظ ’موتکم‘ سے جو قرآن مجید میں آیا ہے ان لوگوں کے فی الحقیقت مر جانے پر استدلال نہیں ہو سکتا۔

یہ تمام واقعات موسیٰ و بنی اسرائیل پر سینا کے مقام میں گزرے تھے وہاں ایک سلسلہ پہاڑوں کا ہے جس کو طور سینا، یا طور سینین کہتے ہیں اور کبھی صرف طور ہی اس کا نام لیتے ہیں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں وہ کوہ آتش فشاں تھا جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ہم علانیہ خدا کو دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ بجز اس کی قدرت کاملہ کے ایک عظیم الشان کرشمہ کے اور کچھ ان کو نہیں دکھا سکتے تھے۔ پس وہ ان کو اس پہاڑ کے قریب لے گئے جس کی آتش فشاں اور گڑگڑاھٹ

اور زور شور کی آواز اور پتھروں کے اڑنے کے خوف سے وہ بے ہوش یا مردے کی مانند ہو گئے۔ خدا تعالیٰ ان تمام کاموں کو جو اس کے قانون قدرت سے ہوتے ہیں خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے جن کے منسوب کرنے کا بلا شبہ وہ مستحق ہے اسی طرح ان واقعات عجیبہ کو بھی اس نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

اس بات کے آثار کہ کوہ سینا در حقیقت آتش فشاں تھا، اب تک پائے جاتے ہیں اور ہر شخص اب بھی جا کر دیکھ سکتا ہے ایک بہت بڑا عالم شخص یعنی کینن اسٹینلی حال میں بطور سیاحت اس وادی میں گئے تھے جہاں سے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل نے گزر کیا تھا۔ انہوں نے اس پہاڑ کا حال اس طرح پر لکھا ہے کہ ”چٹانوں کی راہ سے جو بطور زینہ کے بنی ہوئی تھیں ہم ایک وادی میں پہنچے جو سرخ پتھر کے پہاڑوں کے درمیان تھیں یہاں پر عجیب و غریب پہاڑ دیکھنے میں آئے جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا سرخ و سیاہ مادہ کی گرم نہریں ان پر بہتی ہیں در حقیقت آتشی مادہ اوپر بہہ آیا تھا جب کہ وہ زمین سے اٹھتے تھے یہ راستہ ایسی جگہ ہو کر گزرتا تھا جہاں بجڑ جلے ہوئے مادوں اور خاکستر کے اور کچھ نہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ہتھیار ڈھالنے کے کارخانے میں ڈھیر ہوتے ہیں یہاں اکثر ایسی چیزیں دیکھنے میں آئیں جن کو کوئی نیا آدمی آتش فشاں پہاڑ کے آثار تصور کرے لیکن یہ غلط فہمی ہے جلے پہاڑوں کی مانند جو بڑے بڑے ڈھیر معلوم ہوتے ہیں وہ صرف لوہے کے ریزے ہیں جو بھرے بھرے پتھروں کی بناوٹ میں ملے ہوئے ہیں سرخی مائل پتھر کی چٹانوں میں جو آتشی عمل کے آثار پائے جاتے ہیں وہ ان کی ابتدائی آٹھان سے متعلق ہیں۔ نہ کسی بعد کے انقلاب سے، ہر جگہ پانی کے عمل کے آثار ہیں



آگ کے کہیں نہیں ہیں۔“

کینن اسٹینلی بہت بڑے پسادری اور عیسائی مذہب کے پیشوا ہیں۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ درحقیقت خدا ہی آگ کی صورت میں پہاڑ پر اترتا تھا۔ اس لئے انہوں نے اپنی تحریر میں اس پہاڑ کو آتشیں پہاڑ کہنے سے بہت بچایا ہے۔ مگر جوشے کہ موجود ہے اس کو کوئی شخص ہیر پھیر کر بیان کرنے سے معدوم نہیں کر سکتا۔ خود توریت میں جو کچھ اس پہاڑ کی نسبت بیان ہوا ہے (اگر صحیح تسلیم کیا جاوے) تو کچھ شبہ نہیں رہتا کہ وہ آتش فشاں پہاڑ تھا۔ کتاب خروج باب نوزدہم میں لکھا ہے کہ ”بوقت طلوع صبح رعدا ہا و برقہا و غمامہ و مظلّمہ بالائے کوہ نمایاں شد و آواز کرنا بحدے شدید شد کہ تمامی قوی کہ در آردو بودند لرزیدند و تمامی مینی را دو و فرا گرفت و دودش مثل و دوتنور متصاعد بود و تمامی کوہ بغایت متزلزل شد، یہ تمام حالتیں وہ ہیں جو کوہ آتش فشاں میں واقع ہوتی ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ آتش فشاں تھا اور کینن اسٹینلی کی یہ تاویل کہ وہ نشانیاں اس پہاڑ کی بناوٹ ہی کی ہیں صحیح نہیں ہو سکتی۔

خدا کی تجلی ہر چیز میں ہے جس کو اس نے اپنی قدرت کاملہ سے بنایا اور پیدا کیا۔ ہم بلا شبہ کہہ سکتے ہیں کہ فلما تجل ربنا علی الجبل، فلما تجلی ربنا علی البحر، فلما تجلی ربنا علی الانسان، فلما تجلی ربنا علی الحار، فلما تجلی ربنا علی البعوضۃ، و ما فوقہا، فقد وقع کذا، مگر کسی مادی یا فانی صورت میں نہ خدا آ سکتا ہے نہ بہا سکتا ہے پس ہم توریت کے اس لفظ پر کہ ”خداوند در آتش بر آن تنزل نمود“ یقین نہیں لا سکتے گو کینن اسٹینلی کو یقین ہو۔ ہاں اگر ان لفظوں

کے معنی بھی تجلی اور ظہور قدرت کے لیے جاویں تو پھر مقام انکار نہیں رہتا ۔

(وظلنا علیکم الغمام) توریت میں بنی اسرائیل پر بادلوں کی چھاؤں ہونے کا واقعہ عجیب طرح سے لکھا ہے کہ بادل تمام دن بنی اسرائیل<sup>۱</sup> کو راہ دکھانے کے لیے اُن کے آگے آگے چلتا تھا اور جہاں ٹھہر جاتا تھا وہاں بنی اسرائیل قیام کرتے تھے اور رات کو وہی بادل روشنی کا ستون ہو جاتا تھا مگر اس پر کیوں کر یقین ہو سکتا ہے جب کہ چالیس برس تک بنی اسرائیل کو منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملا ۔ ہمارے علمائے مفسرین نے بھی اپنی عادت کے موافق یہودیوں کی پیروی کی ہے اور اس آیت کی تفسیر میں ایسی قسم کی باتیں جن کا اشارہ تک اس آیت میں نہیں ہے بیان کی ہیں ۔

قرآن مجید سے بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ بادل کا پھرنا معلوم نہیں ہوتا اس آیت سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت دھوپ اور گرمی کی سختی میں بادل آ جانے سے خدا نے اُن کی تکلیف کو دور کر دیا جس کا بطور ایک احسان کے ذکر کیا ہے بڑی غلطی لوگوں کے خیال میں یہ ہے کہ جو امور موافق قانون قدرت کے ظہور میں آتے ہیں ان کو نہ معجزہ سمجھتے ہیں نہ احسان جتلانے یا ماننے کے قابل جانتے ہیں اور اس لئے اس میں بالطبع ایسی باتیں شامل کر لیتے ہیں جو قانون قدرت سے خارج ہوں حالانکہ خدا تعالیٰ نے تمام قرآن مجید میں جاہجا بندروں پر اُنہی باتوں سے اپنا احسان جتلایا ہے اور انہی کو بطور معجزہ کے بتلایا

۱۔ دیکھو کتاب خروج باب ۱۴ ، ورس ۱۹ ، ۲۰ و باب ۴۰ ورس

ہے جس کو اس نے اپنی قدرت کاملہ سے موافق قانون قدرت کے پیدا کیا ہے۔ جب بنی اسرائیل بحر احمر کی شاخ کو پار کر گئے جس کا پانی بسبب جوار بھاٹے کے آترتا چڑھتا رہتا تھا، تو اُس پار پتھر اور ریگستان کا ایک مسطح بیابان ہے، وہاں اکثر ریگ کا طوفان رہتا ہے جو اس ملک کے ساتھ مخصوص ہے اور حال کے سیاحوں نے بھی اُس کو دیکھا ہے اُس ریت کے میدان میں دھوپ کی شدت سے بنی اسرائیل کو بڑی تکلیف ہوئی ہوگی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ریت بھی بھوبل کی مانند گرم ہوگی جس پر چلنا اور بیٹھنا نہایت مشکل ہوگا۔ ایسے وقت میں ابر کا آ جانا بلاشبہ بنی اسرائیل کے حق میں بہت بڑی نعمت تھی۔ جس کو اس مقام پر بطور احسان کے خدا نے یاد دلایا ہے۔

(من و سلوی) 'من' ایک چیز ہے جو بطور ترنجبین کے ایک خاص قسم کی جھاڑیوں پر جم جاتی ہے اور سلوی بٹیر کی قسم کا جانور ہے جو اس جنگل میں جہاں بنی اسرائیل گئے تھے بکثرت پایا جاتا تھا اور وہاں وہی اُن کی غذا تھی۔ پس اسی کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔ باقی عجائبات 'من' کے جو توریت میں بیان ہوئے ہیں اور جن پر یقین کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ قانون قدرت سے انکار کرنا۔ ان کا کچھ ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ گو مفسرین نے اور انبیاء کے قصے لکھنے والوں نے یہودیوں کی پیروی سے اپنی تصنیفات میں ان کا ذکر کیا ہے۔

حال کے سیاحوں نے بھی اُس جنگل میں 'من' کو پایا ہے۔ کینن اسٹینلی لکھتے ہیں کہ چشمہ مرہ سے گذر کر دو وادیاں دیکھیں جس میں سے ایک یقیناً ایلم ہوگی۔ عام صورت اس وسیع میدان کی یہ تھی کہ ایک ریگستان تھا اور جا بجا پانی کے سے راستے جیسے کوئی دریا خشک ہو جاتا ہے بنے ہوئے تھے ان

وادیوں کے راستہ راستہ جا کر عجیب سیاہ و سفید پہاڑ ملتے ہیں یہ بیابان بغیر درخت اور گھاس کے تھا لیکن ان وادیوں میں جن پر ایلم کا شبہ ہوتا ہے - درخت اور جھاڑیاں موجود تھیں - یہاں کھجور کے درخت چھوٹے چھوٹے تھے اور یہاں پر ”تمرسک“ کے درخت بھی تھے جن کے پتوں پر وہ شے پائی جاتی ہے جس کو اہل عرب ’من‘ کہتے ہیں -

(و اذا قلنا ادخلوا) اس آیت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ حضرت موسیٰ کے وقت کا قصہ نہیں ہے بلکہ بنی اسرائیل کا حال ہے - جب کہ وہ حضرت یوشع کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے تھے اس شہر کا نام قرآن مجید میں مذکور نہیں ہے - مگر قدیم نام اس کا ’یریحو‘ ہے جس کو یونانی میں ’جریکو‘ کہتے ہیں اور مسلمان مفسروں نے اس کو ’اریحا‘ لکھا ہے -

(و ادخلوا الباب سجداً) سجدہ سے مراد حقیقی سجدہ کرنا نہیں ہے جس میں ماتھا زمین پر ٹیکنا ہوتا ہے - بلکہ خشوع و خضوع سے خدا کا شکر کرتے ہوئے داخل ہونا مراد ہے - تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ”(اراد به الخضوع و هو الاقرب) یعنی سجدہ سے مراد عاجزی ہے اور یہی معنی اس جگہ زیادہ اچھے ہیں -

(فبذل) اس تبدیلی سے کسی لفظ کا بدل دینا مراد نہیں ہے کیوں کہ ان کو الفاظ نہیں بتائے گئے تھے بلکہ استغفار یعنی گناہوں سے معافی چاہنے کا حکم تھا - مگر انہوں نے اس حکم کو بدل ڈالا - اور توبہ استغفار کی کچھ پروا نہیں کی - بلکہ فتح کے سبب مغرور و متکبر ہو گئے - اسام فخرالدین رازی نے بھی یہ معنی اختیار کیے ہیں - چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ لہا امر و بالتواضع و سوال المغفره لم یمثلوا امر الله و لم یلتفتوا الیه ، یعنی جب کہ ان کو تواضع اور استغفار کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو

انہوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل نہ کی اور اس پر التفات نہ کیا۔ اور بیضاوی میں بھی یہی مطلب تسلیم کیا گیا ہے کہ ”بدلوہا بما امروا بہ من التوبۃ والاستغفار طلب مایستہون من اعراض الدنیا“، یعنی انہوں نے بدل دیا حکم توبہ و استغفار کا جو ان کو دیا گیا تھا دنیاوی چیزوں کے چاہنے سے جس کے وہ خواہش مند تھے۔ (فانفجرت) اس آیت میں یہی ایک امر بحث کے لائق تھا کہ پانی کے بارہ چشمے کیوں کر پیدا ہوئے تھے اور اس بحث کو ہم نے سینتالیسویں آیت کی تفسیر میں بالاستیعاب بیان کیا۔ پہاڑی ملک کو اہل عرب حجر کہتے ہیں جیسے کہ ’عرب الحجر‘ یعنی عرب کا پہاڑی حصہ اسی طرح، فاضرب بعصاک الحجر‘ میں لفظ حجر کا استعمال ہوا ہے۔ بحر احمر کی شاخ کو عبور کرنے کے بعد ایک وادی ملتی ہے جس کا قدیم نام ’ایشام‘ ہے وہاں پانی نہیں ملتا۔ توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک چشمہ تھا جس کا پانی نہایت تلخ تھا اور پی نہیں سکتے تھے اس لیے اس کا نام ’مرہ‘ رکھا ہے۔ حال کے زمانہ کے سیاحوں نے بھی وہاں ایک چشمہ پایا ہے جس کو وہ ’مرہ‘ خیال کرتے ہیں یہی مقام ہے جہاں بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے پانی مانگا تھا۔ اس مقام کے پاس پہاڑیاں ہیں جن کی نسبت خدا نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ ”فاضرب بعصاک الحجر“، یعنی اپنی لٹھی کے سہارے سے اس پہاڑی پر چڑھ چل۔ اس پہاڑی کے پرے ایک مقام ہے جس کو توریت میں ’ایلیم‘ لکھا ہے وہاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے۔ جس طرح پہاڑی ملک میں پہاڑوں کی جڑ یا چٹانوں کی دراڑوں میں سے جاری ہوتے ہیں جن کی نسبت خدا نے فرمایا ہے ”فانفجرت منہ اثنتا عشرة عینا“، یعنی اس سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے۔ اگر ہم توریت کی عبارت پر یقین کریں تو اس سے بھی یہی پایا جاتا ہے اور اس کی یہ عبارت ہے کہ

”بعد ازاں بہ ایلیم آمدند و در آنجا دوازده چشمہ آب یافتند و ہفتاد درخت خرما بود و در آنجا بہ پہلوئے آب اردوزدند“،  
یہ مقام اب بھی موجود ہے اور سیاحوں نے دیکھا ہے۔ مگر اب وہاں پانی کے چشمے نہیں بہتے۔ کیوں کہ پہاڑی چشمے انقلاب زمانہ سے سوکھ جاتے ہیں جیسے کہ مکہ معظمہ میں زمزم کا چشمہ خشک ہو گیا ہے۔ مگر ایسے مقاموں کو ہمیشہ لوگ مقدس سمجھتے ہیں اور اس کے یادگار یا نشان قائم رکھنے کو وہاں کنوئیں کھود دیتے ہیں جس طرح کہ مکہ معظمہ میں چاہ زمزم کھودا گیا ہے۔ اس مقام پر بھی جہاں حضرت موسیٰ کو بارہ چشمے ملے تھے۔ لوگوں نے کسی زمانے میں کنوئیں کھودے ہیں اور اب وہاں سترہ کنوئیں موجود ہیں اور وہ مقام عبور موسیٰ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقام پر بھی ”ترسک“ کے درخت ہوتے ہیں جن کے پتوں پر ’من‘ جم جاتا ہے۔

(واذ قلت یا موسیٰ) اس آیت کی تفسیر میں مفسروں نے دو زمانے کی جدا جدا باتوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ یہ بہت لمبی آیت ہے اور اس کے جدا گانہ دو حصے ہیں ایک حصہ اس سوال و جواب کا ہے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ سے کیا تھا۔ اور دوسرا حصہ آن واقعات کا ہے جو بعد حضرت موسیٰ بلکہ اس سے بھی بہت زمانہ کے بعد بنی اسرائیل پر واقع ہوئے تھے۔

جن جنگلوں اور میدانوں میں بنی اسرائیل پڑے پھرتے تھے وہاں بجز جنگل کے جانوروں کے شکار کے یا اس مویشی کے گوشت کے جو بنی اسرائیل کے ساتھ تھے اور کوئی چیز کھانے کو میسر نہ ہوتی تھی اور ایک ہی قسم کا کھانا کھاتے کھاتے بنی اسرائیل دق ہو گئے تھے جس کی شکایت انہوں نے حضرت موسیٰ سے کی اور زمین کی پیداوار کھانے کو مانگی جو شکار کے گوشت یا پلاؤ

جانوروں کے گوشت سے ادنیٰ درجہ کی تھی۔ حضرت موسیٰ کا اصلی مقصد فلسطین میں جانا اور وہاں کے شہروں پر قبضہ کرنا۔ کتا تھا مگر بنی اسرائیل عاقلیوں اور کنعانیوں سے ڈرتے تھے اور لڑنے پر اور ملک فتح کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ پس جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے زمین کی پیداوار کا کھانا ملنے کی خواہش کی، تو انہوں نے جواب دیا کہ کسی شہر میں چل پڑو اور جا آترو وہاں سب کچھ ملے گا۔ پس اس سے یہ سمجھنا کہ ان کے سفر میں کوئی شہر پڑا تھا اور حضرت موسیٰ نے یا خدا نے اس میں آنے کا حکم دیا تھا۔ ایک صریح غلط فہمی ہے۔

دوسرا حصہ آیت کا ان واقعات کے بیان میں ہے جب کہ بنی اسرائیل فلسطین میں پہنچ گئے اور شہروں کو فتح کر لیا اور اُس میں آباد ہو گئے۔ پھر ان کی بدیوں اور برائیوں اور انبیا کے قتل کے سبب اُن پر آفت آ پڑی اور ذلیل و خوار اور مسکین بے یارو مددگار ہو گئے اور باوجودیکہ اُن میں سے بادشاہان ذیشان پیدا ہوئے۔ مگر تمام قوم میں سے وہ شان و شوکت یک لخت جاتی رہی اور اس وقت تک اُن کا یہی حال ہے۔

(و رفعنا) یہ مضمون دو مقام میں آیا ہے ایک تو اسی آیت میں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر پہاڑ کو اونچا کیا اور سورۃ اعراف میں یہ لفظ ہیں و اذ ننتقنا الجبل فوقہم کانہ ظلۃ و ظنوانہ واقع بہم ان دونوں مقاموں میں چار لفظ ہیں جس کے معنی حل ہونے سے مطلب سمجھ میں آوے گا۔ رفع، فوق، نتق، ظلہ۔

”رفع“ کے معنی اونچا کرنے کے ہیں مگر اس لفظ سے یہ بات کہ جو چیز اونچی کی گئی ہے وہ زمین سے بھی معلق ہو گئی ہو لازم نہیں آتی۔ دیوار اونچا کرنے کو بھی ’رفعنا‘ کہہ سکتے ہیں۔ حالانکہ وہ زمین سے معلق نہیں ہوتی۔

”فوق“ کے لفظ کو بھی اس شے کا زمین سے معلق ہونا لازم نہیں ہے ۔

”شق“ کا لفظ البتہ بحث طلب ہے جس کے معنی مفسرین نے مذہبی عجائبات بنانے کو ’قلع‘ کے بھی لیے ہیں ۔ جس کو زمین سے یا جگہ سے علیحدہ کرنا لازم ہے ’رفع‘ کے بھی لیے ہیں جس کو علیحدہ کر لینا لازم نہیں ہے بیضاوی میں لکھا ہے ”و اذا انتقنا الجبل فوقهم ای قلعناه و رفعناه“ ۔ مگر قاموس میں اس کے معنی ہلا دینے کے لکھے ہیں ”انتقه زعزعه“ اور زعزع کے معنی ہلا دینے کے ہیں ”الزعزعة تحريك الريح الشجرة ونحوها او كل تحريك شديد یعنی ’زعزعه‘ کے معنی ہوا کا درخت کو ہلا دینے کے ہیں اور ہر جنبش شدید کو بھی زعزعه کہتے ہیں پس صاف طور سے انتقنا ، کے معنی ہلا دینے کے ہیں ۔ یعنی ہم نے پہاڑ کو ہلا دیا اور الفاظ ”و ظنوا انه واقع بهم“ زیادہ تر پہاڑ کے ہلا دینے کے جس سے ان کو اس کے گر پڑنے کا گمان ہوا مناسب ہیں ۔ ”ظله“ کے معنی سائبان کے بھی ہو سکتے ہیں ۔ چھتری کے

بھی ہو سکتے ہیں اور یہ جو چیز کہ ہم پر سایہ ڈالے اس کے بھی ہو سکتے ہیں اور اس چیز کا زمین سے معلق ہمارے سر پر ہونا ضرور نہیں ہے ۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ”الظله كل ما اظلك من سقف بيت او سحابة او جناح حايطه ، یعنی ’ظله‘ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو سایہ ڈالے ، گھر کی چھت یا ابر کا ٹکڑا یا احاطہ کا بازو یعنی دیوار پس ”ظله“ کے لفظ سے بھی یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ معلق سر کے اوپر ہو ۔

اب غور کرنا چاہئے تھا کہ واقعہ کیا تھا ، بنی اسرائیل جو خدا کے دیکھنے کو گئے تھے طور یا طور سینین کے نیچے کھڑے ہوئے تھے پہاڑ ان کے سر پر نہایت اونچا اٹھا ہوا تھا وہ اس کے سایہ



کے تلے تھے اور طور بہ سبب آتش فشانی کے شدید حرکت اور زلزلہ میں تھا۔ جس کے سبب وہ گان کرتے تھے کہ ان کے اوپر گر پڑے گا پس اس حالت کو خدا تعالیٰ نے ان لفظوں میں یاد دلایا ہے کہ ”و رفعنا فوقکم الطور“، ”نتقنا الجبل فوقہم کانہ ظلمة و ظنوا انہ واقع بہم“ پس ان الفاظ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عجیب ہو یا مطابق واقع اور موافق قانون قدرت نہ ہو ہاں مفسرین نے اپنی تفسیروں میں اس واقعہ کو عجیب و غریب واقعہ بنا دیا ہے اور ہمارے مسلمان مفسر (خدا ان پر رحمت کرے) عجائبات دور از کار کا ہونا مذہب کا فخر اور اس کی عمدگی سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے تفسیروں میں لغو اور بیہودہ عجائبات بھر دی ہیں۔ بعضوں نے لکھا ہے کہ کوہ سینا کو خدا ان کے سر پر اٹھا لایا تھا کہ مجھ سے اقرار کرو نہیں تو میں اسی پہاڑ کے تلے کچل دیتا ہوں۔ اور بعضوں نے کہا کہ نہیں بیت المقدس کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ کو اکھاڑ کر ہوا میں اڑا لایا تھا۔ اور پانچ میل کا چوڑا پانچ میل کا لمبا تھا۔ اتنی بڑائی اس کی اس لیے تھی کہ کل لشکر بنی اسرائیل کا اس کے تلے ایک ہی دفعہ میں کچل جاوے۔ یہ تمام خرافاتیں لغو و بیہودہ ہیں اور خدائے پاک کا کلام پاک ایسی بیہودہ باتوں سے پاک ہے۔

(کونوا قردة) ہو جاؤ بندر۔ اس کی تفسیر میں بھی ہمارے علمائے مفسرین نے عجیب و غریب باتیں بیان کی ہیں اور لکھا ہے کہ وہ لوگ سچ مچ صورت و شکل اور خاصیت میں بھی بندر ہو گئے تھے۔ بعضوں کا قول ہے کہ وہ سب تیسرے دن مر گئے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بندر جو اب درختوں پر چڑھتے اور ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر آچھلتے پھرتے ہیں انہی بندروں کی نسل میں سے ہیں۔

مگر یہ تمام باتیں لغو و خرافات ہیں۔ خدائے پاک کے کلام کا یہ مطلب نہیں ہے۔ یہودیوں کی شریعت میں سبت کا دن عبادت کا تھا اور اُس میں کوئی کام کرنا یا شکار کھیلنا منع تھا۔ مگر ایک گروہ یہودیوں کا جو دریا کے کنارہ پر رہتا تھا فریب سے سبت کے دن بھی شکار کھیلتا تھا۔ ان کی قوم کے مشائخوں نے منع کیا۔ جب نہ مانا تو ان کو قوم سے منقطع، برادری سے خارج، کھانے پینے سے الگ، میل جول سے علیحدہ کر دیا اور وہ توریت پر نہ چلنے والوں کو ایسا ہی کیا کرتے تھے اور اسی لیے ان کی حالت بندروں کی سی حالت ہو گئی تھی۔ جس کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ ”کونوا قردةً خاسئین“ یعنی جس طرح بندر بلا پابندی شریعت حرکتیں کرتے ہیں، جس طرح انسانوں میں بندر ذلیل و خوار ہیں اسی طرح تم بھی انسانوں سے علیحدہ اور ذلیل و خوار و رسوا ہو۔ جس کے سبب اُس زمانے کے لوگوں کو عبرت ہو اور آئندہ آنے والے اُن کی ذلت و رسوائی کا حال سن کر عبرت پکڑیں۔

یہ کہنا کہ وہ لوگ سچ میچ کے بندر ہو گئے تھے بجز اہل الجنة کے اور کوئی تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ اسی سبب سے بعض مفسرین نے بھی اُن کے سچ میچ کے بندر ہو جانے سے انکار کیا ہے۔ جس کو ہم بطور تائید اپنے کلام کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔ بیضاوی میں لکھا ہے ”وقال مجاهد مامسخت صورتهم ولکن قلوبهم فمشلوا بالقرۃ کما مشلوا بالحمار فی قولہ کہ مثل الحمار یحمل اسفارا“ یعنی مجاہد کا قول ہے کہ ان کی صورتیں بندر کی سی نہیں ہو گئی تھیں بلکہ ان کے دل بندروں کے سے ہو گئے اور اسی لیے بندروں کے ساتھ ان کو تشبیہ دی ہے جیسے کہ خدا نے گدھے کے ساتھ اپنے اس قول میں کہ ان کی مثال

گدھے کی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں تشبیہ دی ہے ۔

(تذبحوا بقرہ) یہ قصہ توریت میں بھی ہے ' مگر اس میں بنی اسرائیل کا موسیٰ سے اس کا اتا پتا پوچھنا مذکور نہیں ہے اور اس کے ذبح کے بعد جو قصہ توریت میں ہے وہ قرآن مجید میں نہیں ہے ۔ بہر حال اتنی بات کہ خدا نے ایک بیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا قرآن اور توریت دونوں میں موجود ہے ۔ بقرہ، بالتحریک و مع التا گائے اور بیل دونوں پر بولا جاتا ہے اور قرآن مجید کے یہ الفاظ کہ ”لا ذلول تشیر الارض ولا تسقی الحرث“ صاف اس کے بیل ہونے پر دلالت کرتے ہیں ۔ قرآن کے تمام الفاظ سے اور ان پتوں اور نشانوں سے جو بتائے گئے ہیں صاف پایا جاتا ہے کہ وہ بیل بت پرستوں یا کافروں کے طریقہ پر بطور سانڈ کے چھوڑا ہوا تھا ۔ تفسیر کبیر میں بھی مسلمہ کی تفسیر ”ای وحشیۃ مرسلۃ من الجبس“ لکھی ہے جو ٹھیک چھوڑے ہوئے سانڈ کی ہے اور اسی کے ذبح کر ڈالنے کا موسیٰ نے حکم دیا تھا اور بنی اسرائیل چاہتے تھے کہ وہ ذبح ہونے سے بچ جاوے اسی لئے اس کے اتے پتے پوچھتے تھے ۔ پس اس قصہ میں کوئی عجوبہ بات نہیں ہے ۔ جس پھڑے کو بنی اسرائیل نے پوجا تھا اس کا معدوم کرنا اور جس بیل کو بطور سانڈ کے چھوڑا تھا کہ وہ بھی ایک قسم کی پرستش ہے اس کو ذبح کر ڈالنا اس شرک و کفر کے مٹانے کے لیے تھا ۔ ہمارے مفسرین نے بلاشبہ غلطی کی ہے جو یہ سمجھا ہے کہ یہ قصہ اگلی آیت ”واذ قتلتم نفساً سے متعلق ہے اور پہلی آیت کو خدا نے پیچھے کر دیا ہے ۔

(واذ قتلتم) اس قصہ کو پہلے قصہ سے کچھ تعلق نہیں ہے ۔

بیل کے ذبح کرنے کا قصہ ختم ہو چکا یہ دوسرا قصہ ہے کہ بنی اسرائیل

میں ایک شخص مارا گیا اور قاتل معلوم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ سب جو موجود ہیں اور انہیں میں قاتل بھی ہے۔ مقتول کے اعضا سے مقتول کو ماریں جو لوگ درحقیقت قاتل نہیں ہیں وہ بہ سبب یقین اپنی بے جرمی کے ایسا کرنے میں کچھ خوف نہ کریں گے۔ مگر اصلی قاتل بہ سبب خوف اپنے جرم کے جو از روئے فطرت انسان کے دل میں اور بالتخصیص جہالت کے زمانے میں اس قسم کی باتوں سے ہوتا ہے۔ ایسا نہیں کرنے کا اور اسی وقت معلوم ہو جاوے گا اور وہی نشانیاں جو خدا نے انسان کی فطرت میں رکھی ہیں لوگوں کو دکھا دے گا۔ اس قسم کے حیلوں سے اس زمانہ میں بھی بہت سے چور معلوم ہو جاتے ہیں اور وہ بسبب خوف اپنے جرم کے ایسا کام جو دوسرے لوگ بلا خوف بہ تقویت اپنی بے جرمی کے کرتے ہیں نہیں کر سکتے۔ پس یہ ایک تدبیر قاتل کے معلوم کرنے کی تھی اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔

ہمارے مفسرین نے ان آیتوں کی یہ تفسیر کی ہے کہ پہلا اور پچھلا ایک ہی قصہ ہے اور پچھلی آیتوں میں جو بیان ہوا ہے وہ باعتبار وقوع کے مقدم ہے اور قصہ یوں قرار دیا ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک شخص قتل کیا تھا۔ اس کا قاتل معلوم کرنے کو خدا نے ایک بیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا اور یہ کہا کہ اس مذبح بیل کے اعضا سے مقتول کو مارو ان کے مارنے سے مقتول زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کو بتلا دیا۔

مگر اس تفسیر میں متعدد نقصان ہیں۔ اول تو پچھلی آیتوں کا مقدم قرار دینے اور دونوں قصوں کو ایک کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دوسرے ”کذالک یحییٰ اللہ الموتی“ کے معنی جب مربوط ہوتے ہیں جب اس کے پہلے یہ جملہ ”فما حیاء اللہ مقدر“

مانا جاوے اور ایسے جملہ کو جو خارج از عقل اور خلاف عادت باری تعالیٰ ہے اپنی طرف سے بغیر موجود ہونے کسی یقین یا اشارہ صریح کے مقتدر ماننا عبارت قرآن میں اضافہ کرنا ہے۔ تیسرے یہ کہ باوجود اس اضافے کے یہ ماننا پڑے گا کہ ’کذالک یحییٰ اللہ الموتی‘ سے مراد احياء اموات بروز بعث و نشر ہے اور اس جگہ بعث و نشر کے حال کے بیان کرنے کا کوئی محل و موقع نہیں ہے اور نہ کوئی مباحثہ بعث و نشر کی بابت ہے۔

جو سیدھے سادھے صاف صاف معنی آیتوں کے ہم نے بیان کیے ہیں اور جن میں نہ آیتوں کی ترتیب الٹنی پڑتی ہے اور نہ کسی جملہ خلاف از عقل و بغیر سند نقل کے اپنی طرف سے بڑھانے کی حاجت ہوتی ہے اور جو صاف طور پر قرآن مجید سے پایا جاتا ہے۔ شاید اس کی نسبت بھی بعض لوگ کچھ شبہ کریں گے۔ اول تو یہ کہیں گے ’اضربو‘ میں ضمیر مذکر کی ہے اور ’بعضہا‘ میں ضمیر مؤنث کی، اور دونوں کا مرجع ہم نے مقتول ٹھہرایا ہے۔ مگر یہ اعتراض کسی طرح صحیح نہیں ہونے کا۔ اس آیت سے پہلے ”و اذ فتلتم نفساً“ واقع ہے اور ”ببعضہا“ کی ضمیر نفس کی جانب راجع ہے اور نفس مؤنث ہے اور اس کے لیے مؤنث ہی کی ضمیر ہونی چاہیے۔ ”اضربو“ کی ضمیر کو بھی تمام مفسرین نے نفس ہی کی طرف راجع کیا ہے۔ مگر باعتبار شخص مقتول کے اس کا مذکر لانا جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں میں لکھا ہے ”الہما فی قولہ تعالیٰ فاضربوہ ضمیر وهو امان ان یرجع الی النفس وجینئذ یکون التذکیر علی تاویل الشخص والانسان واما الی القتل وهو الذی دل علیہ قولہ وما کنتم تکتُمون“۔

دوسرا یہ شبہ کریں گے کہ ”یحییٰ“ اور ”موتی“ کے لفظ

کے ہم نے وہ معنی نہیں لیے جو صریح ان لفظوں سے پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ اعتراض بھی صحیح نہ ہوگا اس لیے کہ ہم نے ان لفظوں کے وہی معنی لیے ہیں جن معنوں میں خود خدا نے ان لفظوں کو استعمال کیا ہے جہاں فرمایا ہے۔ ”وکنتم امواتا فاحیاءکم“ یعنی تم مردہ یعنی معدوم یا غیر موجود یا نامعلوم تھے۔ پھر ہم نے تم کو زندہ یعنی مخلوق یا موجود یا ظاہر کیا پس اسی دلیل سے ہم نے یہاں سے ”یحییٰ“، ”موتی“ کے یہی معنی لیے ہیں کہ نامعلوم قاتل معلوم ہو گیا اور ان کے معنوں کے صحیح ہونے پر خود اسی مقام میں خدا تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے۔ اوپر کی آیت میں لفظ واللہ مخرج آیا ہے اسی کے مقابل اس آیت میں یحییٰ اللہ کا لفظ آیا ہے۔ اوپر کی آیت میں تکتہ مومن کا لفظ آیا ہے۔ اسی کے مقابل اس آیت میں موتی کا لفظ آیا ہے۔ پس علانیہ ثابت ہے کہ یحییٰ اللہ سے ظاہر ہونا قاتل کا اور موتی سے نامعلوم یا غیر ظاہر ہونا قاتل کا مراد ہے نہ مقتول کا زندہ ہونا۔ خدا اپنی قدرت اور اپنی حکمت کو انہی باتوں میں جو انسان روزمرہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں ظاہر کرتا ہے۔ مگر انسان کا خیال اس پر قناعت نہیں کرتا اور دو راز کار باتوں کو پسند کرتا ہے۔

تیسرا شبہ یہ کریں گے کہ ”کذالک یحییٰ اللہ الموتی“ کے قبل ہم کو یہ جملہ کہ ”فاظہر اللہ“ مقدر ماننا پڑے گا۔ مگر یہ جملہ نہ خلاف عقل ہے نہ خلاف قرآن اور نہ خلاف سیاق کلام خدا، کیوں کہ خود خدا نے فرمایا ہے ”واللہ مخرج“ برخلاف اس پہلے جملہ کے نہ وہ زمین کا ہے نہ آسمان کا۔

## ہاروت ماروت کی اصلیت

ہاروت ماروت دونوں تاریخی شخص ہیں یعنی ان کا وجود تاریخ کی کتابوں سے پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں شخص شام کے رہنے والے تھے۔ قرآن مجید میں ان کا کوئی قصہ بجز اس کے جو یہاں ہے بیان نہیں ہوا ہے۔ تمام قصے جو مفسرین نے ان کی نسبت اپنی تفسیروں میں بھر لیے ہیں ان کی کچھ اصل مذہب اسلام میں نہیں ہے۔ جتنی روایتیں ان کی نسبت مذکور ہیں وہ سب مصنوعی اور جھوٹی ہیں۔ مسٹر ہائیڈ کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مجوسیوں کے ہاں ان کی نسبت بہت سے قصے لغو مشہور تھے۔ ہمارے مفسرین کی یہ عادت ہے کہ کسی کے ہاں کا قصہ ہو جب وہ اپنی تفسیروں میں اس کو داخل کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ایک ایسی مصنوعی روایت داخل کر دیتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ یہ مسلمان روایت ہے، مگر اس جھوٹ کا جواز الزام ہے وہ مفسروں یا راویوں پر ہے قرآن شریف اس سے بری ہے۔

یہ دونوں فرشتے نہیں تھے بلکہ آدمی تھے۔ ہمارے ہاں کے بعض مفسروں نے بھی ان کو آدمی قرار دیا ہے چنانچہ حسن نے ملکین کے لفظ کو لام کے زیر سے پڑھا ہے جس کے معنی دو بادشاہوں کے ہیں اور ضحاک سے اور ابن عباس سے بھی لام کی زیر سے پڑھنا روایت کیا گیا ہے۔ پھر ان میں اس بات پر اختلاف ہوا کہ وہ کون تھے حسن کا قول ہے کہ وہ دونوں بابل میں عجم کے کافروں میں سے تھے بغیر ختنہ کیے ہوئے۔ کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ دونوں بادشاہوں میں

سے صالح آدمی تھے -

ہم ملکین کے لفظ کو مطابق قرأت مشہور ہ لام کے زبر سے پڑھتے ہیں مگر فرشتے مراد نہیں لیتے - بلکہ آدمی مراد لیتے ہیں - جس کو لوگ نہایت نیک سمجھتے ہیں - اس پر فرشتہ کا اطلاق کرتے ہیں - قرآن مجید سے بھی کافروں میں اس محاورہ کا ہونا پایا جاتا ہے - جس طرح کہ زلیخا کی سہیلیوں نے حضرت یوسف کو دیکھ کر کہا تھا کہ ”ما ہذا بشرا ان ہذا الا ملک کریم“ اور مجوسیوں میں بھی ایسا استعمال تھا اور ہاید صاحب کی کتاب سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مجوسی ہاروت ماروت کو فرشتہ کہتے تھے - پس اس آیت میں جس طرح کہ لوگوں کے اس گمان کو کہ ، جو علم ان کے پاس تھا وہ خدا کی طرف سے آتارا گیا تھا بیان کیا گیا ہے ، اسی طرح پر جس خیال سے کہ وہ ان کو فرشتہ کہتے تھے ملکین کا لفظ لام کے زبر سے لایا گیا ہے - یعنی ان لوگوں نے اس چیز کی پیروی کی جس کی نسبت وہ کہتے تھے کہ بابل میں ہاروت اور ماروت پر جن کو وہ فرشتہ کہتے تھے خدا کی طرف سے آتاری گئی ہے - پس خدا نے یہ نہ فرمایا ہے کہ جو علم ان کے پاس تھا وہ خدا کی طرف سے آتارا ہوا تھا اور نہ یہ فرمایا ہے کہ وہ دونوں فرشتے تھے بلکہ جو زعم ان دونوں باتوں کی نسبت کافروں یا یہودیوں کا تھا وہ بیان کیا ہے -

اب ایک اور شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ جادو سیکھنے والوں کو منع کیوں کرتے تھے کہ تم مت سیکھو اور کافر مت بنو - یعنی برا کام کرنے والے مت بنو - یہ بات کچھ تعجب کی نہیں ہے - جادو سے اپنے خیال میں نقصان پہنچانا - خواہ فی الحقیقت اس سے نقصان پہنچتا ہو یا نہیں - ہر کوئی یہاں تک کہ جادوگر بھی برا جانتا ہے اور اسی وجہ سے وہ سیکھنے والے کو منع کرتے تھے - اس



زمانے میں بھی بہت لوگ ایسے ہیں جو کوئی برا کام جانتے ہیں مگر جب کوئی اُن سے سیکھنا چاہتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خراب کام ہے کیوں سیکھتے ہو لیکن جب سیکھنے والا اصرار کرتا ہے تو سکھا دیتے ہیں۔ پس ہاروت اور ماروت کا سیکھنے والوں کو ایسا کہنا ایک عام مجراء طبعی کے موافق تھا۔

اسی آیت میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ سحر باطل ہے یعنی سحر کچھ موثر نہیں ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ کسی کو بہ سبب اپنے سحر کے کچھ نقصان پہنچانے والے نہ تھے اور یہ کہنا نص صریح اس بات پر ہے کہ سحر کچھ اثر نہیں رکھتا اور یہی معنی سحر کے باطل ہونے کے ہیں۔ آگے جو خدا نے فرمایا ہے کہ ”الا باذن اللہ“ اس کے یہ معنی سمجھنا کہ ان کا سحر خدا کے حکم سے اثر کرتا تھا محض غلطی اور نا سمجھی ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عامل یا جادوگر کسی کام کے لیے عمل یا جادو پڑھتا ہے اور وہ کام اتفاقیہ اس کی خواہش کے مطابق ہو جاتا ہے اور شبہ پڑتا ہے کہ عمل یا جادو کے اثر سے ہوا ہے اس شبہ کے مٹانے کو خدا نے فرمایا ہے ”الا باذن اللہ“ یعنی ایسی حالت میں جو کام ہو جاتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہو جاتا ہے۔ کچھ جادو یا عمل کے سبب سے نہیں ہوتا۔

---

## حضرت نحمیا کا قصہ

خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے :

او کالذی مر علی قریۃ  
وہی خاویۃ علی عروشہا  
قال انی یحییٰ ہذہ اللہ بعد  
موتہا فاماتہ اللہ مائۃ  
عام ثم بعثہ قال کم لبثت  
قال لبثت یوماً او بعض  
یوم قال بل لبثت مائۃ  
عام فانظر الی طعامک  
وشرابک لم یتسنہ و انظر  
الی حمارک ولنجعلک  
آیۃ للناس و انظر الی العظام  
کیف ننشزہا ثم نکسوها  
لحمًا فلما تبین لہ قال اعلم  
ان اللہ علی کل شئی قدیدر۔

یا (تو نے اُس شخص کو نہیں  
دیکھا یعنی اس کا حال نہیں جانا  
جس نے رویا میں دیکھا) کہ  
گویا وہ گذرا ایک شہر پر ایسی  
حالت میں کہ وہ سر کے بل گرا  
ہوا تھا۔ اُس نے کہا کہ  
کیوں کر زندہ کرے گا (یعنی  
آباد کرے گا) اللہ اس کو اس  
کے سر جانے کے (یعنی ویران  
ہونے کے) بعد پھر اللہ نے اُس  
کو سو برس تک مرا ہوا رکھا  
پھر اس کو اٹھایا خدا نے کہا  
کہ کتنی دیر تک تو پڑا رہا  
اس نے کہا کہ میں پڑا رہا  
ایک دن یا کچھ کم ایک دن

کہا بلکہ تو پڑا رہا سو برس پھر دیکھ اپنے کھانے کو اور اپنے  
پینے کو (کیا) وہ نہیں بگڑا ہے اور دیکھ اپنے گدھے کو (کیا وہ نہیں  
کل گیا ہے) اور میں چاہتا ہوں کہ تجھ کو ایک نشانی آدمیوں  
کے لیے بناؤں اور دیکھ ہڈیوں کو کس طرح ہم ان کو حرکت میں

لاتے ہیں۔ پھر ان کو گوشت پہناتے ہیں پھر جب اس کو یہ بات ظاہر ہوئی اس نے کہا (حالت بیداری میں) میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قبل اس کے کہ اس کی تفسیر بیان کی جاوے لفظ ”کالذی“ میں جو حرف کاف ہے اس پر جو بحث ہے وہ بیان کرنی چاہیے۔ علمائے نحو میں سے کسائی اور فراء اور ابو علی فارسی کا یہ قول ہے کہ اس سے پہلی آیت میں جہاں فرمایا ہے کہ ”السم تر الی الذی حاج ابراہیم“ وہاں بھی ”الذی“ کی جگہ ”کالذی“ مراد ہے اور پھر اس آیت میں جو ”او کالذی“ آیا ہے اس کا عطف پہلی آیتوں کے معنوں پر ہے نہ لفظ پر۔ یہ بحث تو صرف سیاق عبارت سے اور ایک نحوی قاعدہ سے متعلق ہے۔ اس بحث سے یہ مطلب حل نہیں ہوتا کہ ”الذی“ پر کاف تشبیہ لانے سے جو یہ معنی ہو گئے ہیں کہ ”اس شخص کی مانند“ تو مانند کے کہنے سے کیا مطلب ہے۔ اخفش نے اس بحث کو نہایت مختصر کر دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہاں کاف زائد ہے۔ مگر کاف زائد کے لانے کی اور اس کے زائد ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ صاف بات تھی کہ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ ”کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا“ اور دوسری آیت میں فرمایا کہ ”کیا تو نے نہیں دیکھا اس شخص کو جو ایک قریہ میں گذرا“ پھر دوسری جگہ کاف زائد لانے کی اور مانند اس شخص کے جو ایک قریہ میں گزرا کہنے کی کیا حاجت تھی۔ میر و نحوی دوسری آیت میں چند لفظ محذوف مانتا ہے اور اس کا قول ہے کہ تقدیر آیت کی یوں ہے ”والم تر الی من کان الذی مرعلی قریۃ“ یعنی تو نے کیا نہیں دیکھا اس شخص کو جو تھا مثل اس شخص کے جو ایک قریہ پر گذرا۔ مگر اس سے بھی آیت کا مطلب نہیں کھلتا اور یہی سوال باقی رہتا ہے کہ مثل اس شخص سے کیا مطلب ہے۔

صاحب بیضاوی نے غالباً ان مشکلات کو خیال کیا ہے اور ایک قول بیان کرنے سے اپنی دانست میں اس مشکل کو حل کیا ہے اور لکھا ہے کہ ”او کالذی مر علی قریۃ“ حضرت ابراہیم کا قول ہے اور سوال مقدر کا جواب ہے - یعنی جب نمرود نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ ”میں زندہ کرتا ہوں“ تو حضرت ابراہیم نے کہا کہ اگر تو زندہ کرتا ہے تو اس طرح زندہ کر جس طرح کہ خدا نے اس شخص کو زندہ کیا تھا جو ایک قریہ پر گذرا تھا - اس تفسیر کے مطابق تقدیر آیت کی یہ ہوتی ہے کہ ”ان کنت تحیی فاحی کا حیاء اللہ الذی مر علی قریۃ“ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ لفظ کاف سے اس شخص کی مانند مراد نہیں بلکہ جس طرح وہ زندہ ہوا تھا اس طرح زندہ کرنے کی مانند مراد ہے اور پھر قاضی بیضاوی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ شخص جو زندہ ہوا تھا یا تو عزیز تھے یا خضر تھے یا کوئی کافر منکر بعث تھا - عزیز تو نہیں ہو سکتے کیوں کہ وہ حضرت ابراہیم کے زمانہ کے بہت بعد ہوئے ہیں اور یہ معلوم نہیں کہ قاضی صاحب نے خضر سے مراد کس سے لی ہے اور یہ واقعہ خضر پر کب گذرا تھا اور نہ یہ معلوم کہ وہ کافر منکر بعث کون تھا - رجماً بالغیب جو کچھ جی میں آیا یا منا لکھ دیا - راوی کی روایت (گو وہ کیسی ہی صریح البطلان ہو) تفسیروں میں قصوں کے لکھ دینے کو کافی ہے - پس یہ قول حضرت ابراہیم کا کسی طرح نہیں ہو سکتا -

اگر قرآن مجید کا ٹھیک ٹھیک ادب کیا جاوے اور اس کو دیو پری کا قصہ نہ قرار دیا جاوے جیسے کہ عجائب پسند مسلمان قرار دیتے ہیں تو آیت کے معنی نہایت صاف ہیں - یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ کاف حرف تشبیہ کا ہے اور کان بھی اسی کاف تشبیہ سے بنا ہے اور کاف تشبیہ کو بہ سبب کسی ضرورت کے مثلاً بغرض

اہتمام تشبیہ یا تبدیل سیاق کلام یا کسی اور ضرورت کے مشبہ بہ سے جدا کر کے مقدم کر دینا جائز ہے۔ مثلاً ”زید کالاسد“ سے جب کاف تشبیہ کو کسی سبب سے جدا کر کے مقدم کریں تو یوں کہیں گے ”کان زید الاسد“ اس مقام پر بھی ’الذی‘ مشتبہ نہیں ہے بلکہ اس سے اس شخص کے مرور کی تشبیہ یا تمثیل مراد ہے پس تقدیر آیت کی یہ ہے کہ ”الم تر الی الذی کانہ مرعلی قریۃ“ یعنی کیا نہیں دیکھا تو نے اس شخص کو جو گویا کہ گذرا تھا ایک قریہ پر، درحقیقت وہ شخص گذرا نہیں تھا بلکہ اس نے رویا میں دیکھا تھا کہ میں ایک قریہ پر گذرا ہوں جو ویران پڑا ہے اور جو تقدیر آیت کی ہم نے بیان کی ہے اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس شخص کا حال بیان کیا جاتا ہے جو یہ سمجھا تھا کہ گویا میں ایک قریہ میں گیا ہوں اور اس طرح کا بیان صریح دلالت کرتا ہے کہ وہ رویا کا واقعہ ہے مگر نحوی قاعدہ کے مطابق ”کان“ کا لفظ ’الذی‘ موصول کے صلہ میں واقع نہیں ہو سکتا۔ اس ضرورت سے حرف تشبیہ یعنی لفظ کان کو مقدم لانا پڑتا تھا اور وہ مقدم نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کے اسم و خبر صلہ کے جزو تھے۔ اس لیے حرف کاف جو اصل لفظ تشبیہ کا تھا وہ اس کی جگہ مقدم کیا گیا۔

قرآن مجید میں اس شخص کا جس کا رویا یہاں بیان ہوا ہے ذکر نہیں ہے اور نہ اس قریہ کا ذکر ہے جس میں اس شخص نے رویا میں دیکھا تھا۔ غالباً اس قریہ کے تعین کی ضرورت بھی نہیں کیوں کہ اس شخص نے رویا میں دیکھا ہوگا کہ میں ایک قریہ میں گزرا ہوں جو ویران پڑا ہے۔ البتہ اس شخص کی جس نے یہ رویا دیکھا اس کی تعین کرنی چاہیے۔ غالباً آن حضرت کے زمانے میں اس شخص کے نام کو ہر کوئی جانتا ہوگا

مگر اب ہمارے پاس اس شخص کا نام متعین کرنے کو بجز روایات اور تاریخی واقعات کے اور کچھ نہیں ہے۔ تاریخی واقعات سے جہاں تک کہ تحقیق ہو سکتے ہیں اور جن پر اعتماد ہو سکتا ہے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص حضرت نحمیا نبی تھے۔

توریت میں جو واقعات بیت المقدس کی ویرانی کے لکھے ہیں اور جو زمانہ اس کا قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت نصر نے ۵۹۰ قبل مسیح میں بیت المقدس کا محاصرہ کیا اور ۵۸۸ قبل مسیح میں بیت المقدس کو فتح کر لیا اور معبد کو جلا دیا اور بیت المقدس کو ویران کر دیا مگر کیخسرو بادشاہ ایران نے غلبہ پا کر یہودیوں کو قید بابل سے آزاد کیا اور ۵۴۶ قبل مسیح کے اُنہوں نے بیت المقدس میں واپس آ کر قربانیاں کیں اُس کے بعد کسی بادشاہ نے یہودیوں کو بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دی اور کسی نے پھر منع کر دیا پھر ۵۱۸ قبل مسیح میں دارا نے بیت المقدس کی تعمیر کی اجازت دے دی۔ مگر ہامان کی دشمنی سے حرج پڑتا رہا۔

۵۴۶ قبل مسیح کے عزیز پیغمبر بیت المقدس میں گئے اور یہودیوں کی بھلائی کا زمانہ شروع ہوا مگر بیت المقدس اسی طرح جلا ہوا اور ڈھیا ہوا پڑا تھا حضرت نحمیا نبی کو اس کا نہایت رنج تھا اُنہوں نے خدا سے بہت التجا اور دعا کی کہ وہ کسی طرح پھر تعمیر ہو۔ ایک دفعہ ارتحششتائی بادشاہ کے حضور میں حاضر تھے بادشاہ نے پوچھا کہ تم کیوں رنجیدہ ہو، اُنہوں نے کہا کہ میں کیوں کر رنجیدہ نہ ہوں کہ وہ شہر جس میں ہمارے بزرگوں کے مزار ہیں، ویران پڑا ہے اور اس کے دروازے آگ سے جلے پڑے ہیں بادشاہ نے پوچھا کہ پھر تو کیا چاہتا ہے حضرت نحمیا نے کہا کہ آپ مجھ کو وہاں جانے دیں تا کہ میں اس کو

پھر تعمیر کروں ، بادشاہ نے اجازت دی اور ایک میعاد مقرر کی کہ اس عرصہ میں تعمیر کر کے واپس آ جانا ۔

جب حضرت نحمیا بیت المقدس کی تعمیر میں مصروف تھے تو ان لوگ پر ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ کیا وہ بیت المقدس کو بنا لیں گے اور اس کے پتھروں کو جو جلے ہوئے اور خاک کے ڈھیروں کے تلے جمع ہیں نکال لیں گے کتاب نحمیا سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نحمیا کو بیت المقدس کی تعمیر کی بڑی فکر تھی اور خدا کے سامنے ہمیشہ التجا اور دعا کیا کرتے تھے ، بلاشبہ اُن کے دل میں یہ بات گزری ہوگی کہ اس شہر کے مرنے جانے یعنی ویران ہو جانے کے بعد کس طرح اللہ تعالیٰ اس کو زندہ یعنی آباد کرے گا انہیں تردّدات اور خدا سے التجا کرنے کے زمانہ میں جیسا کہ مقتضائے فطرت انسانی ہے حضرت نحمیا نے رویا میں دیکھا اور ان کو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس آباد اور تعمیر ہو جائے گا اسی رویا کا ذکر اس آیت میں ہے اور وہ رویا یہ ہے کہ اُنہوں نے دیکھا کہ میں ایک قریہ میں گیا ہوں جو بالکل ڈھ گیا ہوا اور ویران پڑا ہے رویا ہی میں اُنہوں نے کہا کہ اس قریہ کے اس طرح مرنے جانے یعنی ویران ہو جانے کے بعد کس طرح خدا اس کو زندہ کرے گا یعنی آباد کرے گا ۔ اسی حالت میں اُنہوں نے دیکھا کہ میں مرنے گیا ہوں اور پھر جی اُٹھا ہوں رویا میں اُن سے کسی نے کہا کہ کتنی دیر تک تم پڑے رہے اُنہوں نے کہا کہ ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم اُس نے کہا کہ تم سو برس تک پڑے رہے اپنے کھانے اور اپنے پینے کی چیزوں کو دیکھو کہ وہ تو نہیں بگڑیں اور اپنے گدھے کو دیکھ کہ اس کا کیا حال ہو گیا ہے اور دیکھ کہ پھر اصلی ہڈیاں کس طرح ہلتی ہیں اور کس طرح اُن کے اوپر گوشت چڑھتا

ہے اس عجیب رویا سے اُن کو تسلی ہوئی کہ بیت المقدس ضرور تعمیر ہو جاوے گا۔ پس یہی قصہ جو خدا کی قدرت اور حکمت اور عظمت کو جتاتا ہے اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

ہمارے مفسروں کی عادت ہے کہ سیدھی بات کو بھی ایک عجوبہ بات بنا کر بیان کرتے ہیں اور سنی سنائی باتیں نا تحقیق اور قصے کہانیاں اس میں شامل کر دیتے ہیں اسی طرح اس میں بھی کیا ہے بایں ہمہ جب ان تمام باتوں پر غور کیا جاتا ہے تو جو اصل بات ہے وہ بھی اس میں سے نکل سکتی ہے چنانچہ اس مقام پر بھی جو روایت ابن عباس کے نام سے تفسیر کبیر میں بیان کی ہے اُس سے پایا جاتا ہے کہ یہ تمام واقعہ جو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے وہ ایک رویا تھا۔ اس روایت میں بجائے حضرت نحمیا کے حضرت عزیز کا نام لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ خواب دیکھنے والے حضرت عزیز ہی ہوں مگر تاریخ سے مطابقت کرنے سے حضرت نحمیا کا ہونا زیادہ تر قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے اسی روایت میں لکھا ہے کہ جب وہ بیت المقدس میں پہنچے تو وہاں انگور اور انجیر پھل رہے تھے۔ انہوں نے انجیر اور انگور کھائے اور انگوروں کو نچوڑ کر شیرہ پیا اور سو رہے اور سونے ہی کی حالت میں خدا تعالیٰ نے ان کو مردہ کر دیا اور سو برس تک مردہ پڑے رہے ان لفظوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علمائے متقدمین کی بھی یہ رائے تھی کہ یہ واقعہ حالتِ نوم میں گزرا تھا جس کو ہم نے سیدھی طرح رویا سے تعبیر کیا ہے باقی حصہ جو اس روایت میں لکھا ہے محض بے اصل ہے جس کے لیے کوئی سند نہیں ہے۔

قرآن مجید کا سیاق کلام اس طرح پر واقع ہوا ہے کہ جو قصے اس میں بیان کئے گئے ہیں اُن کا مقصد بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف کے خواب کا جہاں ذکر ہے



وہاں بھی اسی طرح بیان ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے باپ سے کہا کہ میں نے گیارہ ستاروں اور چاند و سورج کو اپنے تئیں سجدہ کرتے دیکھا اور یوں نہیں بیان کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ چاند اور سورج مجھ کو سجدہ کرتے ہیں۔ کیوں کہ خواب میں دیکھنا قرینہ مقام علانیہ روشن تھا۔ اسی طرح اس مقام پر بھی حضرت نحمیا کے خواب کا مقصد بیان کیا گیا ہے اور ”فلما تبین“ کے لفظ سے صاف پایا جاتا ہے کہ وہ تمام واقعات جو اس آیت میں بیان ہوئے ہیں رویا میں واقع ہوئے تھے۔

---

## حضرت عزیر

(آن کے ابن اللہ ہونے پر بحث)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے او قالت الیہ۔ود عزیر  
ن ابن اللہ ، یعنی یہودیوں کا قول ہے کہ ”عزیر خدا کا بیٹا ہے“ ہمارے  
علمائے مفسرین اس آیت کی تفسیر میں یہ لکھتے ہیں کہ یہودیوں  
نے توریت مقدس کو ضائع کر دیا تھا یعنی بخت نصر نے جب  
بیت المقدس کو ویران کیا ہے اور جلایا ہے ۔ اُس وقت ضائع ہو گئی  
تھی مگر حضرت عزیر کے دعا مانگنے پر اللہ تعالیٰ نے توریت اُن کو  
یاد کروا دی اور اُنہوں نے اُس کو لکھ دیا ۔ اُس وقت یہودیوں نے  
کہا کہ یہ بات جو عزیر کو حاصل ہوئی تو بے شک وہ ابن اللہ  
ہے ۔

اس کے بعد علمائے مفسرین نے یہ بحث کی ہے کہ حضرت عزیر  
کو ابن اللہ کس نے کہا (۱) عبید ابن عمیر کا یہ قول ہے کہ صرف  
ایک یہودی نے یہ بات کہی تھی جس کا نام فخاص بن عازورا تھا  
اور (۲) سعید بن جبیر اور عکرمہ کا یہ قول ہے کہ ایک جماعت  
یہودیوں کی تھی جنہوں نے یہ کہا تھا (۳) بعض کا یہ قول ہے  
کہ یہ مذہب یہودیوں میں رائج تھا مگر پھر اُنہوں نے اُس کو  
چھوڑ دیا تھا ۔ (۴) تفسیر کشاف میں لکھا ہے کہ جو یہود مدینہ  
میں رہتے تھے اُن میں سے چند آدمیوں کا یہ مذہب تھا ۔ کل یہودیوں  
کا یہ مذہب نہیں تھا ۔

یہ سب اقوال ہمارے علمائے مفسرین کے ہیں مگر یہودی

اس سے افکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہودی عزیر کو کبھی ابن اللہ نہیں کہتے تھے -

علمائے مفسرین نے جو کچھ اس کی نسبت بیان کیا مؤرخانہ طریقہ پر اس کا ماخذ تلاش نہیں کیا اور نہ یہودی مذہب کی کسی کتاب کا حوالہ دیا - پس ہم کو علمائے مفسرین کے اقوال کا ماخذ تلاش کرنا ہے اور وہ صرف دو قول ہیں -

اول یہ کہ بعد ضائع ہو جانے توریت کے حضرت عزیر پیغمبر نے از سر نو توریت کو لکھا -

دوم یہ کہ یہودیوں کے کسی فرقہ نے حضرت عزیر کو ابن اللہ کہا -

پہلے قول کی سند ہم یہودی کتابوں سے بیان کرتے ہیں - واضح ہو کہ تین کتابیں ہیں جو حضرت عزیر کی طرف منسوب ہیں - ایک کتاب موسوم یہ کتاب ”عزرا“ ہے جو موجودہ عہد عتیق کی کتابوں میں شامل ہے اور سب لوگ اس کو صحیح اور معتبر مانتے ہیں - علاوہ اس کے دو کتابیں اور ہیں جو کتاب اول ”عزیر ڈراس“ اور کتاب دوم ”عزیر ڈراس“ کے نام سے موسوم ہیں - عزرا کا نام یونانی زبان میں ”عزیر ڈراس“ کہا جاتا ہے اور جو کہ ان دونوں کتابوں کی نسبت خیال کیا گیا ہے کہ یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں اس لیے ان دونوں کتابوں کو اسی نام سے موسوم کیا گیا ہے -

ان کتابوں میں سے دوسری کتاب کے چودھویں باب میں یہ ورس ہیں - ”دیکھ اے خدا میں جاؤں گا جیسا کہ تو نے مجھ کو حکم دیا ہے اور جو لوگ موجود ہیں میں ان کو فہائش کروں گا لیکن جو لوگ کہ بعد کو پیدا ہوں گے ان کو کون فہائش کرے گا - اس طرح دنیا تاریکی میں ہے اور جو لوگ اس میں رہتے ہیں بغیر

روشنی کے ہیں“ (ورس ۲۰)  
 ”کیوں کہ تیرا قانون جل گیا ہے۔ پس کوئی نہیں جانتا آن  
 چیزوں کو جو تو کرتا ہے اور آن کاموں کو جو شروع ہونے والے  
 ہیں۔“ (ورس ۲۱)

”لیکن اگر مجھ پر تیری مہربانی ہے تو روح القدس کو مجھ  
 میں بھیج اور میں لکھوں گا تمام جو کچھ کہ دنیا میں ابتدا  
 سے ہوا ہے اور جو کچھ تیرے قانون میں لکھا تھا تاکہ لوگ  
 تیری راہ کو پاویں اور وہ لوگ جو اخیر زمانہ میں ہوں گے زندہ  
 رہیں۔“ (ورس ۲۲)

”اور اُس نے مجھ کو یہ جواب دیا کہ جا اپنے راستہ سے  
 لوگوں کو اکٹھا جمع کر اور اُن سے کہہ کہ وہ چالیس دن تک  
 تجھ کو نہ ڈھونڈیں۔“ (ورس ۲۳)

”لیکن دیکھ تو بہت سے صندوق کے تختے تیار کر اور اپنے  
 ساتھ ”ماریا“ و ”دبریا“ ”سلیم“ - ”اکینسن“ اور ”ایشیل“  
 کو لے۔ ان پانچوں کو جو بہت تیزی سے لکھنے کو تیار ہیں۔“  
 (ورس ۲۴)

”اور یہاں آ اور میں تیرے دل میں سمجھ کی شمع روشن  
 کروں گا جو کہ نہ بجھے گی تا وقتیکہ وہ چیزیں پوری نہ ہوں جو  
 تو لکھنی شروع کرے گا“ (ورس ۲۵)

”اور جب کہ تو پورا کر چکے گا تو بعض چیزوں کو تو  
 مشہر کرے گا اور بعض چیزوں کو تو خفیہ عقل مندوں کو دکھاوے گا  
 کل اسی وقت تو لکھنا شروع کرے گا۔“ (ورس ۲۶)

”پس میں نے اُن پانچ آدمیوں کو لیا جیسا کہ اُس نے حکم  
 دیا تھا اور میدان میں گئے اور وہاں رہے۔“ (ورس ۲۷)  
 ”اور دوسرے دن دیکھو ایک آواز نے مجھ کو پکارا اور کہا

اے ”عیز ڈراس“ اپنا منہ کھول اور میں جو کچھ پینے کو دیتا ہوں اس کو پی۔“ (ورس ۳۸)

”تب میں نے اپنا منہ کھولا اور دیکھو اس نے ایک بھرا ہوا پیالہ میرے منہ تک پہنچایا اور جو کہ مثل پانی کے ایک چیز سے بھرا ہوا تھا لیکن اس کا رنگ مثل آگ کے تھا۔“ (ورس ۳۹)

”اور میں نے اس کو لیا اور پیا اور جب میں پی چکا میرے دل میں سمجھ آئی اور میرے سینہ میں عقل پیدا ہوئی کیوں کہ میری روح نے میرے ذہن کی قوت بخشی۔“ (ورس ۴۰)

”اور میرا منہ کھلا اور پھر بند نہ ہوا۔“ (ورس ۴۱)

”خدا ان پانچ آدمیوں کو بھی سمجھ دی اور انہوں نے رات کے عجیب خوابوں کو جو بیان کیے گئے لکھا اور جو ان کو معلوم نہ تھے اور وہ چالیس دن تک بیٹھے اور انہوں نے دن میں لکھا اور رات کو روٹی کھائی۔“ (ورس ۴۲)

”لیکن میں دن کو بولتا تھا اور رات کو اپنی زبان بند نہیں کرتا تھا۔“ (ورس ۴۳)

”چالیس دن میں انہوں نے دو سو چار (یا نو سو چار) کتابیں

لکھیں۔“ (ورس ۴۴)

”اور ایسا ہوا کہ جب چالیس دن پورے ہو گئے تو خدا

بولا اور اس نے کہا کہ جو تو نے پہلے لکھا ہے اس کو عام طور سے مشہر کر۔ تاکہ لائق اور نالائق سب پڑھیں۔“ (ورس ۴۵)

لیکن پچھلی ستر جو ہیں ان کو پوشیدہ رکھ تاکہ تو صرف

ان کو دے سکے جو تیرے لوگوں میں عقل مند ہوں۔“ (ورس ۴۶)

”کیوں کہ ان میں سمجھ کا چشمہ ہے اور عقل کا ذخیرہ

ہے اور علم کی روشنی ہے۔“ (ورس ۴۷)

”اور میں نے ایسا ہی کیا۔“ (ورس ۴۸)

کتاب عزرا جو عہد عتیق میں داخل ہے اور جس کو سب معتبر مانتے ہیں اُس میں لکھا ہے کہ ایں عزرا از بابل بر آمد کہ او در شریعت موسیٰ کہ خداوند کہ خداے اسرائیل دادہ بود کاتب ماهر بود۔“ (باب ۷ ورس ۶)

”زان رو کہ عزرا قلب خود را بہ خصوص طلبیدن و بجا آوردن شریعت خداوند و بہ خصوص تعلیم نمودن فرائض و احکام بہ اسرائیل حاضر کرد۔“ (باب ۷، ورس ۱۰)

جارج سیل صاحب اپنے ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ ”یہ رائے کہ عزرا نے نہ صرف کتب خمسہ موسیٰ کو بلکہ عہد عتیق کی اور کتابوں کو بھی خدا کی وحی سے دوبارہ تیار کیا۔ متعدد عیسائی فادرز کی بھی یہی رائے ہے جن کا ذکر ڈاکٹر پریڈیوز نے کیا ہے اور مصنفوں کی بھی یہ رائے ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آن کی اس رائے کی اصل بنا ”عیز ڈراس“ کے باب دوسرے کے ایک حصہ پر ہے۔ ڈاکٹر پریڈیوز نے بیان کیا ہے کہ اُس باب میں عیسائیوں نے عزرا کی طرف بہ نسبت یہودیوں کے بہت زیادہ باتیں منسوب کی ہیں کیونکہ یہودیوں کا یقین ہے کہ عزرا نے صرف موسیٰ کی کتابوں کا ایک صحیح نسخہ تیار کیا تھا اور اُس پر بہت محنت کر کے اُس کو بہت مکمل کیا تھا۔ اس میں بہت کم شبہ ہے کہ یہ خیال ابتداءً یہودیوں سے شروع ہوا گو اب آن کی رائے اور ہو، ہمارے نزدیک یہ سندیں جو ہم نے بیان کیں اُن سے ہمارے مفسرین کے پہلے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔

دوسرے قول کی تصدیق کے لیے ہم ”عیز ڈراس“ کی اُس دوسری کتاب سے استدلال کرتے ہیں۔ اُس کے چودھویں باب میں یہ ورس ہیں۔

”اور اب میں (خدا) تجھ سے کہتا ہوں۔“ (ورس ۷)

”کہ تو اپنے دل میں وہ نشانیاں جمع رکھ جو میں نے دکھائی ہیں اور آن خوابوں کو جو تو نے دیکھے ہیں اور آن تعبیروں کو جو تو نے سنی ہیں۔“ (ورس ۸)

”کیونکہ تو سب سے علیحدہ کر دیا جاوے گا اور اب سے تو میرے بیٹے کے ساتھ رہے گا اور ایسے لوگوں کے ساتھ جو تیری ہی مانند ہیں یہاں تک کہ زمانہ کا خاتمہ ہو جاوے۔“ (ورس ۹)

یہ ترجمہ جو ہم نے لکھا ہے انگریزی زبان کے ترجمہ کا اردو ترجمہ ہے۔ اصل کتاب ”عیز ڈراس“ موجود نہیں ہے۔ اگر بیٹے کی ساتھ رہنے سے حضرت عیسیٰ مراد ہوں تو یہ ورس محض سہل و بے معنی ہو جاتا ہے بلکہ سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کلمہ کا اطلاق خود حضرت عزرا کی طرف ہے کہ اب سے تو میرا بیٹا رہے گا یعنی مقبول و مقرب۔

اس کتاب کا عربی زبان میں بھی ترجمہ موجود تھا اور کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہی عربی ترجمہ عرب میں اور بالتخصیص مدینہ میں جہاں کثرت سے یہودی رہتے تھے مروج ہوگا اور نہایت قرین قیاس ہے کہ وہ ترجمہ ایسے لفظوں میں ہوگا جس سے لوگ حضرت عزرا کو ابن اللہ تعبیر کرتے ہوں گے جس طرح کہ عیسائی اسی قسم کے لفظوں کے سبب سے حضرت مسیح کو ابن اللہ تعبیر کرتے ہیں۔ پس یہ قول ہمارے علماء کا کہ مدینہ کے یہودیوں کا یہ خیال تھا نہایت صحیح اور قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

اب ہم کو ”عیز ڈراس“ کی دوسری کتاب پر جس کے حوالے ہم نے دیے ہیں بحث کرنی باقی ہے۔ یہ کتاب مجموعہ کتب عہد عتیق میں شامل نہیں ہے اور آس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جھوٹی یا نامعتبر کتاب ہے گو کہ اس میں بہت سی باتیں عمدہ اور

صحیح بھی موجود ہیں۔

اس کتاب کے نامعتبر ہونے کی یہ دلیلیں پیش ہوتی ہیں۔  
 اول : یہ کہ اس کتاب کا کوئی عبری یا یونانی نسخہ نہیں پایا جاتا  
 صرف لیٹن زبان کے چند نسخے اور ایک عبری زبان کا نسخہ ہے۔  
 مگر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ عبری یا یونانی نسخہ کا نہ پایا جانا  
 خصوصاً ایسی حالت میں کہ سب لوگ اس کا یونانی میں لکھا جانا  
 تسلیم کرتے ہیں اس کے نامعتبر ہونے کی کیوں کر دلیل  
 ہو سکتی ہے۔

دوسری دلیل یہ پیش ہوتی ہے کہ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ  
 ابتدا ہی میں یہ کتاب یونانی زبان میں لکھی گئی تھی جس کا یہ  
 مفاد ہے کہ حضرت عزرا نے نہیں لکھی کیوں کہ اگر وہ لکھتے  
 تو عبری زبان میں لکھتے مگر اس کا یونانی زبان میں ابتداءً لکھا  
 جانا صرف خیال کیا گیا ہے اور اس کا کچھ ثبوت نہیں ہے۔ علاوہ  
 اس کے بالاتفاق تسلیم کیا گیا ہے کہ حضرت متی کی انجیل دراصل  
 عبری زبان میں لکھی گئی تھی جو اب دنیا میں موجود نہیں ہے اور  
 موجودہ انجیل یونانی زبان کی اس کا ترجمہ ہے۔ پس کیا وجہ ہے  
 کہ ”عیزڈراس“ کی کتاب کے اس نسخہ کو جس کا یونانی میں لکھا  
 جانا خیال کیا گیا ہے عبری کا ترجمہ نہ تصور کیا جاوے۔

تیسری سب سے بڑی دلیل اس کتاب کی عزرا کی لکھی ہوئی  
 نہ ہونے کی ڈاکٹر گرے کا قول ہے وہ کہتے ہیں کہ ”اس کتاب  
 کے مختلف مقامات کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان مسئلوں  
 اور خیالات اور فقروں کی طرح ہے جو عہد جدید میں پائے جاتے ہیں  
 اور یہ بات کہ ہمارے سیویر یعنی حضرت مسیح کا ذکر ان کا نام  
 لے کر اس میں بہت صاف الفاظ میں کیا ہے۔ ان سب باتوں سے یہ  
 نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کل نہیں تو اکثر حصہ اس کا انجیل کے بعد



لکھا ہوا ہے ۔

جن ورسوں میں ایسے الفاظ ہونے کا خیال کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ورسوں میں مذکور ہیں ۔

”اور اس لیے میں تم سے کہتا ہوں اے کفار تم میں سے جو سنتے اور سمجھتے ہیں کہ تم ڈھونڈو اپنے گڈریا کو کہ وہ تم کو ہمیشہ کا آرام دے گا کیوں کہ اب وہ قریب ہے اور دنیا کے آخر میں آنے والا ہے۔“ (باب ۲ ، ورس ۳۴)

”بادشاہت کے انعام کے لیے تیار رہو کیوں کہ ہمیشہ کی روشنی تم پر چمکنے والی ہے۔“ (باب ۲ ، ورس ۳۵)

”اس دنیا کے سایہ سے بھاگو اور اپنے جلال کی خوشی کو حاصل کرو میں اپنے سیویر کی تصدیق صاف طور سے کرتا ہوں۔“ (باب ۲ ، ورس ۳۶)

عیسائی حضرت عیسیٰ پر سیویر کا لفظ اطلاق کرتے ہیں اور اسی خیال سے ڈاکٹر گرے نے خیال کیا ہے کہ اس سے حضرت عیسیٰ مراد ہیں اور یہ کتاب انجیل کے بعد لکھی گئی ہے ۔ مگر وہ عبری لفظ جس کا ترجمہ سیویر یعنی نجات دہندہ کیا جاتا ہے وہ عہد عتیق میں اشعیاء نبی کی کتاب باب ۴۳ ورس ۳ و ۱۱ و باب ۴۵ ورس ۲۱ و باب ۴۹ ورس ۲۶ و باب ۶۰ ورس ۱۶ میں آیا ہے اور خدا کی طرف اس کا اطلاق کیا گیا ہے ۔ پھر یہاں بھی سیویر سے خدا کیوں سمجھا نہیں جاتا ۔

”تب میں نے فرشتہ سے پوچھا کہ یہ جوان شخص کون ہے جو آن لوگوں کے سروں پر تاج رکھتا ہے اور ان کے ہاتھ میں شاخیں دیتا ہے۔“ (باب ۲ ، ورس ۴۶)

”پس اس نے جواب دیا کہ یہ خدا کا بیٹا ہے جس کو انہوں نے دنیا میں قبول کیا ہے۔“ (باب ۲ ، ورس ۴۷)

مگر بزرگ اور مقدس آدمی کو خدا کا بیٹا کہنا ایک عام محاورہ کتب عہد عتیق کا ہے۔ حضرت موسیٰ کی دوسری کتاب یعنی سفر خروج کے چوتھے باب کی بائیسویں آیت میں خدا نے حضرت یعقوب کو اپنا پہلا بیٹا کہا ہے اور وہ آیت یہ ہے : ”وہ فرعون بگوئے کہ خداوند چنیں می فرماید کہ اسرائیل پسر اول زادہ من است“ زادہ کا لفظ اصل عبری میں نہیں ہے۔

ہوشیع نبی کی کتاب کے پہلے باب کی دسویں آیت میں بنی اسرائیل پر خدا کے بیٹوں کا اطلاق ہوا ہے اور وہ آیت یہ ہے : ”معہذا تعداد بنی اسرائیل مثل ریگ دریا کہ پیمودنی و شمودنی نیست خواہد بود بلکہ واقع می شود در تمامی مقامے کہ بایشان گفته شد کہ شما قوم من نیستید بایشان گفته خواہد شد کہ پسران خدا می آید۔“

”اور جو شخص کہ مندرجہ بالا برائیوں سے بچے گا وہ میرے عجائبات کو دیکھے گا۔“ (باب ۷ ، ورس ۲)

”کیوں کہ میرا بیٹا جیسس آن لوگوں کے ساتھ ظاہر ہوگا جو اس کے ساتھ ہوں گے اور جو لوگ باقی رہیں گے وہ چار سو برس کے اندر خوش ہوں گے۔“ (باب ۷ ، ورس ۲۸)

بعد ان برسوں کے میرا بیٹا کرائسٹ مں جاوے گا اور تمام لوگ جو جان رکھتے ہیں وہ بھی۔“ (باب ۷ ، ورس ۲۹)

جیسس اور جیسو اور جوشیو یہ تینوں صورتیں یونانی نام جوشوا اور جیشوا کی ہیں جو مخفف ہے جیہوشوا کا ، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مقام میں جو جیسس نام ہے ڈاکٹر گرے نے کس دلیل پر اس کو حضرت مسیح کا نام سمجھا ہے۔ کیوں کہ اسی عزیز ڈراس کی پہلی کتاب کے پانچویں باب ورس ۵ میں یہی نام آیا ہے اور یہ وہ شخص ہے جو قید بابل سے چھوٹ کر بنی اسرائیل کے ساتھ

بیت المقدس میں آیا تھا۔ مذکورہ بالا ورس میں اسی شخص کا نام معلوم ہوتا ہے کیوں کہ لکھا ہے کہ جیسس آن لوگوں کے ساتھ ظاہر ہوگا جو اس کے ساتھ ہوں گے اور اس سے صاف اشارہ انہیں لوگوں کی طرف ہے جو قید بابل سے چھوٹ کر بیت المقدس میں آئے تھے۔

اس شخص نے بہت سی نیکی اور خدا پرستی کے کام کیے ہیں جن کا ذکر عزیز ڈراس کی پہلی کتاب کے باب ۵ ورس ۸ و ۲۴ و ۳۸ و ۵۶ و ۶۸ و ۷۰ و باب ۶ ورس ۲ و باب ۹ ورس ۱۹ میں مندرج ہے اور انہیں نیک کاموں کے سبب سے آس کو خدا نے اپنا بیٹا کہا ہے۔

مسیح اور کرائسٹ کے ایک ہی معنی ہیں۔ یہ لفظ ہر ایک کے لیے استعمال ہوتا تھا جس پر ایک خاص رسم میں تیل ملا جاتا تھا (دیکھو سفر لویان باب ۴ ورس ۳ و ۵ و ۱۶) ان ورسوں میں مسیح یا کرائسٹ کا لفظ ہائی پریسٹ کے لیے استعمال ہوا ہے اور بنی اسرائیل کے بادشاہوں کو بھی تیل ملا جاتا تھا اور وہ بھی اس لقب سے بولے جاتے تھے (دیکھو پہلا سموئل باب ۲ ورس ۱۰ و ۳۵ و باب ۱۲ ورس ۳ و ۵ و باب ۱۶ ورس ۶ و باب ۲۴ ورس ۶ و ۱۰ و باب ۲۶ ورس ۹ و ۱۱ و ۲۳ - دوسرا سموئل باب ۱ ورس ۱۴ و ۱۶ و باب ۱۹ ورس ۲۱ و باب ۲۳ ورس ۱)۔

یہودیوں میں پریسٹ کو بھی تیل ملا جاتا تھا جس وقت کہ وہ اپنے کام پر مقرر ہوتے تھے (دیکھو پہلی کتاب تواریخ الایام باب ۱۶ ورس ۲۲ و زبور ۱۰۵ ورس ۱۵) پس اس مقام پر کرائسٹ سے وہی جیسس مراد ہے جو قید بابل سے چھوٹ کر بیت المقدس میں آیا تھا اور بطور پریسٹ کے آس نے بہت سے کام کیے ہیں۔

مسر آرنلڈان اخیر دو ورسوں کی نسبت جن میں جیسس

اور کرائسٹ کا لفظ آیا ہے یہ لکھتے ہیں کہ ”اس ورس اور اس کتاب کے اور چند فقروں سے جیسس کرائسٹ کا نام اور ان کے کام اور موت وغیرہ کا حال صاف صاف معلوم ہوتا ہے اور یہ بات ناممکن ہے کہ کسی یہودی نے جس نے اس کتاب کو تسلیم کر لیا ہو وہ عیسائی نہ ہو گیا ہو“ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بات ناممکن ہے کہ کسی یہودی نے جس نے اس کتاب کو تسلیم کر لیا ہو ان لفظوں کے وہ معنی سمجھے ہوں جو مسٹر آرنلڈ نے سمجھے ہیں۔

اس کے بعد مسٹر آرنلڈ لکھتے ہیں ”کہ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کتاب ہمارے سیویر یعنی حضرت مسیح کے تھوڑے زمانہ بعد لکھی گئی ہو گی اور جس کے حالات اور جس کے حواریوں کی تحریرات سے مصنف نے چند فقرے لکھے ہیں“ اگرچہ ہم نے تشریح کر دی ہے کہ ان ورسوں کے وہ معنی نہیں ہو سکتے جو عیسائی مصنف سمجھتے ہیں لیکن اگر ہم ان کے اس قول کو تسلیم کر لیں کہ یہ کتاب حضرت مسیح کے تھوڑے زمانہ بعد لکھی گئی تھی تو بھی یہ بات تسلیم کرنی ضرور ہوگی کہ قبل نزول قرآن مجید کے یہ کتاب تحریر ہو چکی تھی اور جو کہ اس میں متعدد جگہ انسانوں کو ابن اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اس واسطے یہودیوں کا بعضا فرقہ حضرت عزیر کو ابن اللہ کہتا ہوگا جیسا کہ ہمارے مفسروں نے لکھا ہے کہ مدینہ کے یہودیوں کا یہ اعتقاد تھا چنانچہ سعید ابن جبیر اور عکرمہ نے روایت کی ہے کہ سلام بن مشکم اور نعمان بن ادنی اور مالک ابن صیف جو مدینہ کے یہودی تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ ہم کیوں کر تمہاری تابعداری کریں تم نے تو ہمارا قبلہ چھوڑ دیا ہے اور عزیر کو ابن اللہ بھی نہیں سمجھتے۔ اس میں

کچھ شک نہیں کہ شام کے یہودیوں کا یہ اعتقاد نہیں تھا اور اسی وجہ سے وہ لوگ اس بات سے کہ وہ عزیر کو ابن اللہ سمجھتے تھے ہمیشہ انکار کرتے رہے ہیں مگر آن کے انکار کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی فرقہ بھی اس اعتقاد کا نہ تھا اگر اس وقت عیسائیوں سے پوچھو تو سب عیسائی اس بات سے کہ وہ حضرت مریم کو بھی خدا سمجھتے تھے انکار کریں گے حالانکہ چوتھی صدی کے اخیر میں عیسائیوں میں ایک فرقہ پیدا ہوا تھا جو کولی ری ڈینس پکارا جاتا تھا۔ موشیم اکلیزیاسکل ہسٹری صفحہ ۱۷۰ میں لکھا ہے کہ آن لوگوں نے باب اور بیٹے (یعنی خدا اور حضرت مسیح) کے سوا حضرت مریم کو بھی خدا مانا تھا۔ یہ فرقہ چند روز رہا اور مدت سے معدوم ہو گیا۔ اسی طرح یہودیوں کا بھی ایک خاص فرقہ تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور اب وہ معدوم ہے۔

مسلمان عالموں کی دلیل کہ قرآن مجید علانیہ مدنیہ میں پڑھا جاتا تھا اور آیت ”وقالت الیہود عزیر بن اللہ“ سب یہودی سنتے تھے اگر آن کا یہ اعتقاد نہ ہوتا تو ضرور الزام دیتے کچھ کم مضبوط نہیں ہے۔

---

# حضرت عیسیٰ کی پیدائش

اور

## وفات کا مسئلہ

حضرت عیسیٰ کی نسبت جو امور قرآن مجید میں مذکور ہیں وہ بلاشبہ نہایت غور کے لائق ہیں ان میں سے ہم اس مقام پر صرف حضرت عیسیٰ کی ولادت اور وفات پر بحث کریں گے۔ ان کے متعلق باقی باتیں دوسرے مضمون میں علیحدہ بیان کی جائیں گی۔

عیسائی اور مسلمان دونوں خیال کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ صرف خدا کے حکم سے عام انسانی پیدائش کے برخلاف بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ اگر ایسا ہی ہونا فرض کیا جاوے تو اول اس بات پر غور کرنی ہوگی کہ بن باپ کے پیدا کرنے میں حکمت الہی کیا ہو سکتی ہے۔ ایسے واقعات جو خلاف عادت یا مافوق الفطرت تسلیم کیے جاتے ہیں ان سے یا تو قدرت کاملہ پروردگار کا اظہار مقصود ہونا چاہیے یا ان کا وقوع بطور معجزہ مانا جاوے جب کہ خداوند تعالیٰ اقسام حیوانات کو بغیر تولد و تناسل کے عادتاً پیدا کرتا رہتا ہے اور خود انسان کو بھی بلکہ تمام حیوانات کو ابتداءً اس نے اسی طرح پیدا کیا ہے۔ یا یوں کہو کہ آدم کو بے ماں و بے باپ کے پیدا کیا تھا تو حضرت عیسیٰ کے صرف بے باپ کے پیدا کرنے میں اس زیادہ قدرت کاملہ کا اظہار نہ تھا۔ اگر یہ خیال کیا جاوے کہ صرف ماں سے پیدا کرنا دوسری طرح پر اظہار قدرت کاملہ تھا تو یہ بھی صحیح نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ

اظہار قدرت کاملہ کے لیے ایک ابرہین اور ایسا ظاہر ہونا چاہیے کہ جس میں کسی کو شبہ نہ رہے۔ بنِ باپ کے مولود کا ہونا ایک ایسا امر مخفی ہے جس کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اظہار قدرت کاملہ کے لیے کیا گیا ہے۔

بطریق اعجاز حضرت عیسیٰ کے بنِ باپ کے پیدا ہونے پر معجزہ کا بھی اطلاق نہیں ہو سکتا۔ معجزہ بمقابلہ منکرانِ نبوت صادر ہوتا ہے قبل ولادت حضرت مسیح بلکہ ادعائے نبوت یا الوہیت کوئی شخص منکر نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر معجزہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے۔ معہذا اگر وہ معجزہ ہوتا تو حضرت مریم کا معجزہ ہوتا نہ حضرت مسیح کا۔ علاوہ اس کے جب کہ ان کی ولادت ٹھیک اسی طرح پر واقع ہوئی تھی جس طرح کہ عموماً بچوں کی ہوتی ہے کہ نو مہینے تک حمل میں رہے اور ہر وقت ولادت حضرت مریم پر وہ تمام حالات طاری ہوئے۔ جو عموماً عورتوں پر بچہ پیدا ہونے میں طاری ہوتے ہیں تو کسی طرح اعجازاً ان کے پیدا ہونے کا کسی کو احتمال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

عیسائی حضرت مسیح کے بنِ باپ کے پیدا ہونے کو ایک اور حکمتِ الہی پر منسوب کر سکتے ہیں کہ وہ گنہگار انسان کی آمیزش سے پاک اور بے گناہ ہوں تا کہ گنہگار انسانوں کی طرف سے فدیہ کیے جاویں۔ مگر جب ماں کی شرکت سے وہ بری نہ تھے تو انسانی آمیزش سے پاک نہیں ہو سکتے تھے۔ لاطینی کلیسانی کونسل ٹرینٹ میں تسلیم کیا کہ حضرت مریم بھی بنِ باپ کے پیدا ہوئی تھیں۔ اگر یہ بھی مانا جاوے تو وہ بھی ماں کی شرکت سے بری نہ تھیں۔ انجام کار عیسائی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے حضرت مریم کو انسانی خاصیت یعنی گنہگار ہونے کی قابلیت سے اس لیے پاک کر دیا تھا کہ ان سے فدیہ ہونے کے لائق مولود پیدا ہو تو خدا اس طرح

حضرت عیسیٰ کے باپ کو بھی پاک کر سکتا تھا اور بن باپ کے پیدا کرنے میں کوئی خاص حکمت نہیں ہو سکتی تھی۔

ابتداء میں عیسائیوں کو یہ خیال نہیں تھا کہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں یا بن باپ کے پیدا ہوں گے۔ کیوں کہ مسیح کی نسبت یقین کیا جاتا تھا کہ وہ داؤد کی نسل سے ہوں گے۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو مسیح موعود نہیں مانا مگر جنہوں نے اُن کو مسیح موعود مانا اور عیسائی یا نصاریٰ کہلائے ان سب کو کامل یقین تھا کہ وہ حضرت داؤد کی اولاد میں ہیں۔ چنانچہ انجیل متی میں لکھا ہے ”یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہیم“ اور لوک انجیل کے باب ۱ ورس ۲۷ اور متی کی انجیل باب ۱ ورس ۴۰ سے پایا جاتا ہے کہ یوسف حضرت مریم کا شوہر داؤد کی نسل سے تھا۔ مسلمان بھی قرآن کی رو سے جیسے کہ سورۃ انعام میں لکھا ہے حضرت عیسیٰ کو حضرت ابراہیم کی ذریت یعنی اولاد سمجھتے ہیں۔ پس اگر حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے ہوں تو وہ نسل داؤد یا اولاد ابراہیم سے کیوں کر قرار پا سکتے ہیں۔

اگر یہ کہا جاوے کہ ماں کے سبب سے ان کو داؤد کی نسل سے قرار دیا گیا ہے تو یہ بات دو وجہ سے غلط ہے اول اس لیے کہ یہودی شریعت میں عورت کی طرف سے نسب قائم نہیں ہو سکتا دوسرے یہ کہ حضرت مریم کا داؤد کی نسل سے ہونا ثابت نہیں کیٹو میکلوپیڈیا میں لکھا ہے۔ ”یومیسیس جو قدیمی مذہبی مؤرخ ہے گو حضرت عیسیٰ کے نام پر اس نے طول طویل بحث کی ہے مگر اس کے بیان سے اور نیز متی اور لوک کی انجیلوں سے مریم کی پیدائش اور نسب پر کوئی نئی روشنی نہیں پڑتی۔ اپنی جو مریم کی ماں بیان کی گئی ہیں ان کی نسبت جس قدر قصے ہیں وہ محض افسانے ہیں اور ان کا کچھ ثبوت و شہادت نہیں ہے۔“ انجیل لوک باب ۱ ورس ۶، ۷، ۳۷



سے پایا جاتا ہے کہ حضرت مریم حضرت زکریا کی بیوی الیشع کی رشتہ دار تھیں اور الیشع ہارون کی بیٹی تھیں۔ مگر یہ نہ معلوم ہے کہ مریم و الیشع میں کیا رشتہ تھا اور نہ یہ معلوم ہے کہ ہارون کس کی اولاد میں تھے۔ قرآن مجید میں حضرت مریم کے باپ کا نام عمران لکھا ہے۔ اس پر استدلال کرنے سے بھی داؤد کی نسل سے حضرت مریم کا ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔

- عیسائی مفسر جب کہ حضرت عیسیٰ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کو تسلیم کر کر نسل داؤد سے ثابت کرنے میں عاجز ہوئے۔ تو انہوں نے کہا کہ سینٹ لوک کی انجیل میں جو نسب نامہ یوسف کا لکھا ہے در حقیقت وہ مریم کا نسب نامہ ہے تاکہ مریم کا داؤد کی نسل سے ہونا ثابت کریں۔ دو انجیلوں میں حضرت عیسیٰ<sup>۴</sup> کے نسب نامے ہیں۔ متی کی انجیل میں حضرت عیسیٰ<sup>۴</sup> کے باپ کا نام یوسف<sup>۴</sup> اور آن کے باپ کا نام یعقوب<sup>۴</sup> لکھا ہے اور لوک کی انجیل میں یوسف<sup>۴</sup> کے باپ کا نام ہیلی لکھا ہے۔ پہلا نسب نامہ بذریعہ سلیمان کے داؤد تک پہنچتا ہے اور دوسرا نسب نامہ بذریعہ ناٹان کے۔ یہ دونوں نسب نامے بلا شبہ مختلف ہیں۔ مگر عیسائی مفسر کہتے ہیں جیسے کہ تفسیر ہنری اسکاٹ میں مندرج ہے کہ یوسف نے ہیلی کی دختر سے یعنی حضرت مریم سے شادی کی تھی اور شاید اس نے یوسف کو متبنی بھی کیا تھا اور یوسف ہیلی کا بیٹا کہلاتا تھا اور یہودیوں میں رواج تھا کہ نسب ناموں میں صرف مردوں کا نام لکھتے تھے نہ عورتوں کا۔ اس لیے سینٹ لوک نے اس نسب نامہ میں جو در حقیقت مریم کا ہے بجائے مریم کے یوسف کا نام لکھ دیا ہے۔

اس بیان پر بعض عیسائی علماء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ نسب نامہ داؤد تک بذریعہ ناٹان کے پہنچتا ہے اور حضرت مسیح کا

بذریعہ سلیمان کے داؤد کی نسل میں ہونا چاہیے اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ سلیمان کی اولاد میں ہونے والے تھے بلکہ صرف یہ بیان ہوا ہے کہ وہ داؤد کے بیٹے اوریشی کی نسل سے ہوں گے اور سلیمان بطور ایک عمدہ نمونہ حضرت مسیح کے بیان ہوئے ہیں۔

اگر یہ بات فرض بھی کر لی جائے کہ اس پچھلے نسب نامے میں بجائے حضرت مریم کے یوسف کا نام لکھا گیا ہے اور یہ بھی فرض کر لیا جاوے کہ یوسف ہیلی کے متبنی اور داماد تھے اور یہ بھی فرض کیا جاوے کہ حضرت عیسیٰ کا سلیمان کے ذریعہ سے داؤد کی اولاد میں ہونا کچھ ضرور نہ تھا تو بھی اس بات کا جواب نہیں ہو سکتا کہ یہودی شریعت میں ماں کی طرف سے نسب نہ معتبر گنا جاتا تھا اور نہ بیان کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عورتوں کا نام بھی نسب ناموں میں داخل نہ ہوتا تھا۔ پس حضرت عیسیٰ مسیح کی نسبت جو جو پیشین گوئی تھی کہ وہ داؤد کی نسل میں سے ہوں گے کسی طرح ماں کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی بلکہ بموجب اس پیشین گوئی کے ضرور ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح ایسے باپ کی اولاد ہوں جو داؤد کی نسل سے ہو۔

پادری رچارڈ وائسن نے تفسیر انجیل لوک میں لکھا ہے کہ ”یہ عام یقین تھا کہ حضرت عیسیٰ یوسف کے بیٹے ہیں اور ان کا معجزہ کے طور سے پیدا ہونا مشہور نہیں کیا گیا تھا بلکہ یوسف اور مریم کے دلوں ہی میں مخفی تھا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بات کب پہلے پہل ظاہر کی گئی۔ چون کہ انجیل کے حالات میں اس پر کچھ اشارہ نہیں پایا جاتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات حواریوں کو بھی ظاہر نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے وہ اور نیز اور بھی ان کو یوسف اور مریم کا بیٹا سمجھتے تھے اور یہ امر منجملہ ان امور کے

تھا جن کو مریم نے خدا کی ہدایت سے حضرت عیسیٰ کے مردوں سے جی اٹھنے کے بعد تک اپنے دل میں چھپا رکھا۔ اگر پیش تر سے یہ بات مشہور ہو جاتی تو حضرت عیسیٰ کی تبلیغ رسالت کے بعد لوگ اکثر حضرت مریم کو تنگ کیا کرتے اور اہانت کی باتیں ان سے پوچھا کرتے اور جب کہ اس قدر اختلاف رائے عیسیٰ کی نسبت ان کے دشمنوں میں ہوتا تو مریم کو خطرہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ کم سے کم یہ ہوتا کہ وہ بہت دقت و تکلیف میں مبتلا ہو جاتیں۔ ان امور کے لحاظ سے ظن قوی ہوتا ہے کہ یہ بات حضرت عیسیٰ کی زندگی بھر کسی کو معلوم نہیں ہوئی تھی مگر سینٹ لوک کے اس فقرہ سے کہ، جیسا کہ وہ یوسف کا بیٹا خیال کیا جاتا تھا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بعد عروج مسیح یہ امر منجملہ ان باتوں کے تھا جو پہلے پہل معلوم ہو گئی تھیں اور بغیر کسی شبہ کے وہ مان لیا گیا تھا اور اسی وجہ سے یہ بات انجیل متی اور انجیل لؤک میں داخل ہوئی ہے۔“

اس بات کو خود حواری حضرت عیسیٰ کے اور تمام عیسائی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مریم کا خطبہ یوسف سے ہوا تھا۔ یہودیوں کے ہاں خطبہ کا یہ دستور تھا جیسے کہ کیٹوسیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ شوہر اور زوجہ میں اقرار ہو جاتا تھا کہ اس قدر معیاد کے بعد شادی کریں گے۔ یہ اقرار یا تو ایک باقاعدہ تحریر یا معاہدہ کے ذریعہ سے گواہوں کی موجودگی میں ہوتا تھا جس طرح کہ ہم مسلمانوں کے ہاں نکاح کا خط لکھا جاتا ہے یا بغیر تحریر کے اس طرح پر ہوتا تھا کہ مرد عورت کو گواہوں کے سامنے ایک ٹکڑا چاندی کا دے دیتا تھا اور یہ لفظ کہتا تھا کہ یہ چاندی کا ٹکڑا اس امر کی کفالت میں قبول کر کہ اتنے دنوں بعد تو میری زوجہ ہو جاوے گی۔

یہ معاہدے حقیقت میں عقد نکاح تھے - صرف زوجہ کا گھر میں لانا باقی رہ جاتا تھا اور وہ اس میعاد پر ہوتا تھا جو اس معاہدہ میں قرار پاتی تھی - اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسی کہ مسلمانوں میں فاتحہ خیر ہوتی ہے جو در حقیقت ایک شرعی نکاح ہے لیکن زوجہ فی الفور گھر میں نہیں لائی جاتی یا جیسے کہ اب بھی بعض دفعہ مسلمانوں میں نکاح بہ تحریر نکاح خط عمل میں آتا ہے اور زوجہ کا شوہر کے گھر بھیجنا کسی آئندہ وقت پر ملتوی رہنا ہے -

یہودیوں کے ہاں اس رسم کے ادا ہونے کے بعد مرد اور عورت باہم شوہر اور زوجہ ہو جاتے تھے اور بجز اس کے کہ زوجہ اپنے شوہر کے گھر رہنے کو اس مدت کے بعد بھیج دی جاوے اور کوئی ایسی رسم جس پر جواز تزوج منحصر ہو عمل میں نہیں آتی تھی یہاں تک کہ اگر بعد اس رسم کے اور قبل رخصت کرنے کے ان دونوں سے اولاد پیدا ہو تو وہ ناجائز اولاد تصور نہیں ہوتی تھی بلکہ بے گناہ شرعی اولاد جائز تصور ہوتی تھی - شاید خلاف رسم بات ہونے سے معیوب گنی جاتی ہوگی اور دونوں کو ایک شرم اور خجالت کا باعث ہوتی ہوگی -

امر مذکورہ کا ثبوت کیٹو سیکلوپڈیا سے بھی ظاہر ہوتا ہے اس میں لکھا ہے کہ جب یہ معاہدہ شادی کا یہودیوں میں ہو جاتا تھا تو زن و مرد ایک دوسرے کو دیکھنے کے مجاز ہوتے تھے - جس کی ان کو پہلے اجازت نہیں ہوتی تھی - اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک نسبت شدہ باکرہ کے بطن سے خدا نے اپنے بیٹے کے پیدا ہونے میں یہ حکمتیں رکھی تھیں - اول - یہ کہ ان پر غیر مشروع اولاد ہونے کا طعنہ عاید نہ ہو - دوم - یہ کہ ان کے والدین موافق یہودی شریعت کے سزا کے مستوجب نہ ہوں - سوم -

یہ کہ یوسف کے نسب نامہ سے جن کی وشتہ دار مریم تھیں۔ مریم کا نسب نامہ ظاہر ہو جاوے۔ چہارم۔ یہ کہ حضرت مسیح کا ایام طفولیت میں کوئی مربی اور سرپرست ہو۔ ان تمام بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں میں اس طرح نسبت کے بعد اولاد کا پیدا ہونا شرعاً ناجائز نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں نے نعوذ باللہ حضرت مریم پر جو بہتان باندھا تھا وہ یوسف کے ساتھ نہیں باندھا تھا بلکہ پنتھرا تالی کے ساتھ منسوب کیا تھا۔ کیوں کہ یوسف ان کے شرعی شوھر ہو چکے تھے پس کوئی وجہ اس بات کے خیال کرنے کی نہیں ہے کہ یوسف فی الواقع مسیح کے باپ نہ تھے۔ متی کی انجیل میں جو یہ لکھا ہے کہ یوسف نے جب یہ دیکھا کہ مریم حاملہ ہیں تو اُن کے چھوڑ دینے کا ارادہ کیا۔ اگر یہ بیان تسلیم کیا جاوے تو اس کا سبب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام رسم کے بر خلاف حاملہ ہو جانے سے یوسف کو رنج و خجالت ہوئی ہوگی جس کے سبب سے ایسا خیال ہوا ہوگا، مگر جو کہ فی الحقیقت وہ پاک حمل تھا اور جو کچھ حضرت مریم کے پیٹ میں تھا وہ روح القدس اور کلمۃ اللہ تھا۔ یوسف نے خواہ خود ہی خواہ اپنے خواب کی تائید پر جس کا ذکر سینٹ متی کی انجیل میں ہے وہ خیال چھوڑ دیا۔

اگرچہ ان چاروں مروج انجیلوں کے زمانہ تالیف میں نہایت اختلاف ہے مگر جو زمانہ کہ علمائے عیسائی نے قریب صحت کے تسلیم کیا ہے اس کی رو سے پایا جاتا ہے کہ متی کی انجیل حضرت عیسیٰ کے بعد دوسرے یا تیسرے سال میں اور لوقا کی انجیل اکتیسویں یا بتیسویں سال میں اور یوحنا کی انجیل تریسٹھویں یا چونسٹھویں سال اور مارک کی انجیل اس کے بھی بہت دنوں بعد تحریر ہوئی تھی۔ مگر متی کی نسبت بخوبی ثابت ہے کہ وہ دراصل

عبرانی میں لکھی گئی اور موجودہ یونانی انجیل اس کا ترجمہ ہے۔ جس کے مترجم کا نام اور زمانہ ترجمہ اب تک تحقیق نہیں ہوا۔ پس متی کی موجودہ یونانی انجیل بھی قدیم نہیں ہے بلکہ اخیر زمانہ کی لکھی ہوئی ہے۔

یہ تمام انجیلیں اور حواریوں کے نامے اور اعمال جو ان انجیلوں کے اخیر میں شامل ہیں یونانی زبان میں لکھے گئے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتابیں عیسائی مذہب کو ان ملکوں میں رواج دینے کے لیے لکھی گئی تھیں جہاں یونانی زبان مروج تھی اور جہاں کے لوگ زیادہ تر یونانیوں کے سے خیالات رکھے تھے۔

یونانیوں میں ایک عام خیال تھا کہ نہایت مقدس اور بزرگ شخص کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ ہرکیولیس، ڈیاس کوری، راسیولس، فیثا غورث، افلاطون۔ ان سب کو یونانی خدا کا بیٹا کہتے تھے اور افلاطون کے حمل کے قصہ کو قصہ حمل مثل حضرت عیسیٰ بیان کرتے تھے۔ غرض کہ جب حواریوں کو یونانی زبان کے ذریعے سے دین عیسوی کا پھیلانا مدنظر ہوا تو حضرت عیسیٰ کو ایسے بزرگ لقب سے ملقب کرنا پڑا ہوگا جو ان لوگوں کے خیالات سے مناسب تھا۔ جن کے لیے وہ انجیلیں لکھی گئی تھیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک وہ انجیلیں حضرت عیسیٰ کی ولادت کی نسبت ان خالص خیالات کے ظاہر ہونے کا ذریعہ نہیں ہو سکتیں جو حضرت عیسیٰ کے زمانہ میں اور ان انجیلوں کے تحریر ہونے سے پیشتر تھا۔ بایں ہمہ ہم انہی انجیلوں میں متعدد جگہ پاتے ہیں کہ یوسف کو حضرت مریم کا شوہر اور حضرت مسیح کو ان کے باپ یوسف کا بیٹا تسلیم کیا ہے۔

انجیل متی باب ۱ ورس ۱۶ میں لکھا ہے کہ یوسف مریم کا شوہر تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ متی کی انجیل میں حضرت عیسیٰ

کے نسب نامہ میں اوروں کی نسبت یونانی لفظ 'اجن نسی' بیائے معروف استعمال ہوا ہے جس سے خاص باپ کا بیٹا ہونا پایا جاتا ہے اور حضرت عیسیٰ کی نسبت یونانی لفظ 'جنان' آیا ہے۔ جس سے اس ورس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ 'یعقوب سے پیدا ہوا یوسف شوہر مریم جس سے عیسیٰ پیدا ہوا مگر ویطسٹین نے یونانی زبان کی سند پر ثابت کیا ہے' کہ 'جنان' کا لفظ بھی ماں اور باپ دونوں سے پیدا ہونے پر بولا جاتا ہے۔ معہذا اس تغیر کا سبب وہی خیالات ہیں جو یونانیوں میں مذہب عیسوی پھیلانے کی بناء پر پیدا ہوئے تھے۔

لوک کی انجیل باب ۲ ورس ۳۳ کے موجودہ نسخوں میں یہ لفظ ہیں 'تب یوسف اور اس کی ماں' مگر اس مقام پر بھی اسی خیال سے تعبیر کیا ہے۔ ڈاکٹر کریسباخ کی صحیح اور مقابلہ کر کے چھاپی ہوئی انجیل مطبوعہ لیپسک ۱۸۰۵ء اور سنڈروف کی چھاپی ہوئی انجیل مطبوعہ ۱۸۴۹ء اور روسن ولگٹ کے ترجمہ انگریزی میں یوسف کا نام نہیں ہے بلکہ 'اس کا باپ اور اس کی ماں' لکھا ہے اور ٹروٹوپ نے یونانی انجیل کی شرح میں اس کی تصحیح کی ہے جس سے یوسف کا پدر مسیح ہونا تسلیم ہوتا ہے۔ لوک کی انجیل کے اسی باب کے ۴۳ ورس میں بھی قدیم نسخے الگزنڈر یانوس میں بھی 'گوینس' کا لفظ ہے جس کے معنی والدین کے ہیں۔

لوک کی انجیل باب ۲ ورس ۴۸ میں حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ 'دیکھ تیرا باپ اور میں غمگین ہو کر تجھے ڈھونڈتے تھے'۔

لوک انجیل باب ۲ ورس ۲۷ و ۴۱ میں یوسف اور مریم کو حضرت عیسیٰ کا ماں باپ کہہ کر تعبیر کیا ہے۔  
متی کی انجیل باب ۱۳ ورس ۵۵ میں لکھا ہے کہ لوگوں نے

حضرت عیسیٰ کی نسبت کہا کہ ”کیا یہ بڑھی کا بیٹا نہیں۔ کیا اس کی ماں مریم نہیں کہلاتی۔“

اور انجیل یوحنا باب ۶ ورس ۴۲ میں ہے کہ لوگوں نے حضرت مسیح کی نسبت یہ کہا کہ ”کیا یہ یسوع یوسف کا بیٹا جس کے ماں باپ کو ہم پہچانتے ہیں، نہیں ہے۔“

انجیل یوحنا باب ۱ ورس ۴۵ میں لکھا ہے کہ ”فلپ نے انتھنیل کو کہا کہ جس کا ذکر موسیٰ نے توریت میں اور نبیوں نے کیا ہے ہم نے اسے پایا ہے وہ یوسف کا بیٹا یسوع ناصری ہے۔“

اعمال حواریں باب ۲ ورس ۳ میں پطرس حواری نے حضرت عیسیٰ کے داؤد کی نسل میں ہونے کی نسبت کہا ہے کہ ”خدا نے اس سے (یعنی داؤد سے) قسم کر کے کہا کہ میں تیرے تخت پر بیٹھنے کے لیے جسم کے طور پر تیری کمر سے مسیح کو پیدا کروں گا۔“

سینٹ پال نے اپنے خط موسومہ رومیاں باب ۱ ورس ۴ میں لکھا ہے کہ ”وہ مسیح جسم کے حق میں داؤد کے تخم سے ہوا پر روح قدس کے حق میں جی آٹھنے کی قوی دلیل سے خدا کا بیٹا ثابت ہوا۔“

ان تمام سندوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح کے زمانے کے سب لوگ اور خود حواری بھی جانتے تھے اور یقین کرتے تھے کہ حضرت عیسیٰ اپنے باپ یوسف کے تخم سے پیدا ہوئے ہیں نہ کہ بغیر باپ کے۔ مگر وہ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا روحانی اعتبار سے کہتے تھے اسی خیال سے جس سے کہ یونانی اپنے ہاں کے بزرگوں کو خدا بیٹا کہتے تھے اور اس بات کو نہایت صفائی سے سینٹ پال نے اپنے خط کی مذکورہ آیت میں بیان کیا ہے۔ زمانہ کے گزرنے پر وہ خیال جس سے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا



بیٹا کہا محو ہو گیا اور لوگ حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا سمجھنے لگے اور اسی کے ساتھ یہ قرار دیا کہ وہ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے اور ان کی ضد سے یہودیوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ نعوذ باللہ وہ ناجائز طور پر پیدا ہوئے تھے۔ اور یہ اتہام سلسلے نے جو تیسری صدی میں تھا، کیا تھا اور ظاہراً یہ وہ زمانہ ہے کہ جب عیسائیوں کو اس بات میں کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں اور بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں زیادہ تر غلو ہو گیا تھا۔

قرآن مجید نے اس بات میں کہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے کچھ بحث نہیں کی جب قرآن نازل ہوا اس وقت دو فرقے مخالف موجود تھے۔ ایک فرقہ نہایت نالائقی اور بدی سے یہ کہتا تھا کہ حضرت مسیح بطور ناجائز مولود کے پیدا ہوئے ہیں۔ دوسرا فرقہ یہ کہتا تھا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے اور ثالث ثلاثہ ہیں۔ قرآن مجید نے ان دونوں فرقوں کے اعتقاد کو رد کر دیا اور حضرت مسیح کے مقدس اور روح پاک ہونے پر اور حضرت مریم کی عصمت و طہارت پر گواہی دی اور اس بات کو کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے اور ثالث ثلاثہ میں جھٹلا دیا۔ اور بتلا دیا کہ وہ مثل اور انسانوں کے خدا کے بندے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں بیان ہوا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ جہاں تک کہ اشارہ ہے حضرت عیسیٰ کے روح القدس اور کلمۃ اللہ ہونے کا اور حضرت مریم کی عصمت اور طہارت کا اشارہ ہے۔ جیسا کہ ہم آگے بیان کرتے ہیں۔ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ جو شخص حضرت مریم کی نسبت تہمت بد لگاوے وہ مسلمان نہیں ہے۔

سورہ آل عمران میں ہے کہ جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم بے شک اللہ تجھ کو خوش خبری دیتا ہے ایک کلمہ کی اپنی طرف سے اس کا نام (ہوگا) مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا رویت دار دنیا

میں اور آخرت میں اور (خدا کے) مقربوں سے اور کلام کرے گا لوگوں کے گہوارہ میں (یعنی بچنے میں) اور بڑھاپے میں اور ہوگا نیکوں میں سے - مریم نے کہا اے پروردگار کہاں سے ہوگا میرے بیٹا اور نہیں چھو اے مجھ کو کسی آدمی نے - خدا نے ہی کہا ہوگا اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے جب کہ کوئی کام کرنا ٹھہرا چکتا ہے تو اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس کو کہتا ہے کہ ہو پھر ہو جاتا ہے - اور سورۃ مریم میں ہے کہ پھر ہم نے بھیجا اُس کے (یعنی مریم کے پاس اپنی روح کو پھر وہ بن گئی اُس کے لیے ٹھیک آدمی ، مریم نے کہا کہ بے شک میں تجھ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو (خدا سے) ڈرتا ہے اُس نے کہا کہ میں تو صرف تیرے خدا کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ تجھ کو پاکیزہ لڑکا دوں - مریم نے کہا کہ کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور نہیں چھو اے مجھ کو کسی آدمی نے اور نہ میں بدکار ہوں - اس نے کہا یہی ہوگا تیرے پروردگار نے کہا ہے کہ وہ مجھ پر آسان ہے اور ہم اس کو لوگوں کے لیے نشانی اور اپنی رحمت کرنا چاہتے ہیں اور تھی یہ بات ٹھہر چکی -

فرشتہ کا حضرت مریم کو بیٹا ہونے کی بشارت دینا اور ان کا یہ کہنا کہ مجھے مرد نے نہیں چھو اے سینٹ لوک کی انجیل میں بھی مذکور ہے تمام یہودی یقین رکھتے تھے کہ ان میں ایک مسیح پیدا ہونے والا ہے جو یہودیوں کی بادشاہت کو پھر قائم کرے گا اس لیے یہودی اور یہودی عورتیں بیٹا ہونے کی نہایت آرزو رکھتی تھیں اور دعائیں مانگتی تھیں اور عبادتیں کرتی تھیں کہ وہ شخص ہمارا ہی بیٹا ہو - ایسی حالتوں میں ان کا اس قسم کی خوابوں کا دیکھنا یا بن بولنے والے کی آوازوں کا سننا یا متخیلہ میں کسی مجسم شے کا دکھلائی دینا ایسا امر ہے جو بمقتضائے فطرت انسانی واقع ہوتا ہے - بعض علماء کا یہ قول ہے کہ اس سورۃ میں جو خطاب فرشتوں کا

حضرت مریم سے ہے وہ بطریق الہام اور روع فی النفس اور القا فی القلب کے ہے مگر مجھ کو کچھ شبہ نہیں جیسے کہ سیاق کلام سے پایا جاتا ہے۔ کہ امر بشارت جو اس صورت میں اور سورہ مریم میں بیان ہوا ہے وہ ایک ہی واقعہ ہے۔ اور رویا میں واقع ہوا تھا اور مینٹ متی کی انجیل سے بھی ایسا ہی مستنبط ہوتا ہے کیوں کہ بموجب اُس انجیل کے یوسف کو بھی اس حمل کی خبر خواب میں بذریعہ فرشتہ دی گئی تھی۔

بیٹا ہونے کی بشارت حضرت اسحاق کو اور ان کی بیوی کو اور حضرت زکریا کو بھی دی گئی تھی۔ صرف بشارت سے تو بے باپ کے پیدا ہونا لازم نہیں آتا ہے۔ ہاں ان بشارتوں پر غور کرنا چاہیے کہ ان میں کوئی ایسا لفظ تو نہیں ہے جس سے بن باپ کے پیدا ہونے کا اشارہ نکلے، سو ایسا بھی کوئی لفظ ان بشارتوں میں نہیں ہے۔

سب سے زیادہ غور کے لائق لفظ ”لم یمسسنی بشر ولم اک بغیا“ ہے۔ بلا شبہ یہ دونوں کلمے نہایت صحیح ہیں اور جس زمانہ میں بشارت ہوئی اُس زمانہ میں بلا شبہ حضرت مریم کو کسی مرد نے نہیں چھوا تھا۔ بلکہ غالباً ان کا خطبہ بھی یوسف کے ساتھ نہ ہوا تھا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے بعد بھی یہ واقعہ نہیں ہوا۔

جس طرح کہ حضرت مریم کو اس بشارت سے تعجب ہوا۔ اُسی طرح حضرت اسحاق اور ان کی بیوی اور حضرت زکریا کو بھی تعجب ہوا تھا۔ جب کہ وہ فرمانے لگیں: ”یا ویلتی الدوانا عجوز و ہذا بعلی شیخا ان ہذا لشیء عجیب“ اور دوسری جگہ فرمایا ہے۔ ”فاقبلت امرتہ فی صرة فصکت وجہہا و قالت عجوز عقیم“ اور حضرت زکریا نے فرمایا۔ ”انی

یہ کہوں لی غلام و قد یبلغنی الکبر و امراق عاقر“ اور دوسری جگہ فرمایا ہے۔ ”وكانت امرق عاقرأ وقد بلغت من الکبر عتیا“ حضرت مریم کی حالت اولاد ہونے سے مایوسی کی نہ تھی اور اسحاق اور ان کی بیوی اور زکریا اور ان کی بیوی کی حالت مایوسی کے قریب تھی۔ مگر جب ان دونوں سے بیٹے کا پیدا ہونا بغیر باپ کے تسلیم نہیں کیا گیا تو حضرت مریم کے تعجب سے جو صرف اس وقت کی کیفیت پر تھا جب کہ بشارت ہوئی تھی۔ نہ آئندہ کی ہونے والی حالت پر، کیوں کہ حضرت عیسیٰ کے بے باپ کے پیدا ہونے پر استدلال ہو سکتا ہے اور کیا عجب ہے کہ اس خواب کے بعد ہی حضرت مریم کو اور ان کے مریموں کو حضرت مریم کی شادی کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو جو آخر کار یوسف کے ساتھ عقد ہونے سے پورا ہوا۔

اس تعجب کے بعد فرشتے نے حضرت مریم سے کہا کہ ”کذالک الله یخلق ما یشاء“ اسی طرح حضرت زکریا سے کہا تھا ”کذالک الله یدفعل ما یشاء“ حضرت مریم سے کہا کہ ”قال کذالک قال ربک و هو علی هین“ اسی طرح حضرت زکریا سے کہا کہ ”قال کذالک قال ربک و هو علی هین“ لفظ جو سورۃ آل عمران میں ہے وہ کسی امر کے ہونے پر بلا اسباب ”کن فیہ۔ کنون“ قدرتی و فطرتی کے دلالت نہیں کرتا کیوں کہ ہر شے کے ہونے کو خدا اسی طرح فرماتا ہے ”اذا اراد شیئاً انما یقول له کن فیکون“ پس ہر شے ”کن“ کے حکم سے ہمیشہ قانون قدرت اور قاعدہ فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ پس یہ الفاظ کسی طرح اس بات پر کہ حضرت مسیح کی ولادت فی الفور بلا قاعدہ فطرت اور بغیر باپ کے ہوئی تھی، دلالت نہیں کرتے۔

”آیۃ الناس“ کے لفظ سے یہ سمجھنا کہ حضرت مسیح

کو بغیر باپ کے بطور ایک نشانی معجزہ کے پیدا کیا تھا محض بے جا ہے۔ اس لیے کہ بے باپ کے پیدا ہونا (اگر بالفرض ہوا بھی ہو) ایسا امر مخفی ہے جو کسی طرح ”آیہ للناس“ نہیں ہو سکتا۔ آیتہ کا لفظ قرآن مجید میں فرعون، اصحاب کہف والرقیم، قوم نوح، نوح اور اصحاب سفینہ پر بھی اطلاق ہوا ہے۔ حضرت مریم بوجہ اپنی عبادت اور خدا پرستی اور نیکی کے اور حضرت عیسیٰ بہ سبب اس رحم دلی کے جو انجیل سے پائی جاتی ہے، خدا کی عمدہ نشانی کے لقب کے مستحق تھے۔

”بکلمۃ منہ“ کے لفظ یا ”کلمۃ القاھا الی مریم“ کے الفاظ بھی کسی طرح بن باپ کے پیدا ہونے پر دلالت نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد جگہ لفظ ”کلمہ“ کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ سورۃ اعراف میں فرمایا ہے ”وتمت کلمۃ ربک الحسنی علی بنی اسرائیل“ اور سورۃ یونس میں فرمایا ہے ”وکیدالک حقت کلمۃ ربک علی الذین فسقوا“ اسی طرح اور بہت سی جگہ آیا ہے اور کلمۃ اللہ سے وہ امور محققہ مراد ہیں جو ہونے والے تھے اور ہوئے اور ہوں گے۔ حضرت مسیح کا حضرت مریم سے پیدا ہونا ایک امر محقق اور معین تھا یا یوں کہو کہ موعود تھا پس اسی امر محقق یا موعود کو کلمہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور جس طرح تمام قرآن میں کلمہ کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اسی طرح اس مقام پر بھی کیا ہے ان الفاظ سے بن باپ کے پیدا ہونے پر کچھ بھی اشارہ نہیں نکلتا۔

سورۃ النساء میں جہاں خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی نسبت فرمایا ہے کہ ”کلمۃ القاھا الی مریم“ وہاں یہ بھی فرمایا ہے ”وروح منہ“ اس لفظ سے بھی بن باپ کے پیدا ہونا نہیں ثابت ہوتا۔ تمام جان داروں کی نسبت کیا حیوان اور کیا انسان ”روح منہ“ کا لفظ اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ سوائے اس کے اور کسی معنی

میں حضرت عیسیٰ کی نسبت اس لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً مسلمانوں کے مذہب کے مطابق جو خدا کے یا خدا کی روح کے یا خدا کے کلمہ کے مجسم ہونے کے قائل نہیں ہیں اور اس کو ”لم یلد و لم یولد“ جانتے ہیں معہذا چند علمائے مفسرین نے بھی جیسا کہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے ”روح منہ“ قریباً قریباً ویسے ہی معنی مراد لیے ہیں جو ہم نے بیان کیے ہیں۔

اس میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ لوگوں کے لیے دینی زندگی کا سبب تھے۔ اس لیے ان کو روح سے تعبیر کیا ہے۔ خدا نے قرآن کی صفت میں فرمایا ہے ”کذالک او حینا الیک روحاً من امرنا“ اسی طرح حضرت عیسیٰ کو بھی روح کہا گیا ہے۔ اور روح کے لفظ سے اُن کی بزرگی بھی ظاہر ہوتی ہے جیسے کہ کہتے ہیں کہ یہ تو خدا کی نعمت ہے اور اس سے صرف اس نعمت کا بزرگ اور کامل ہونا مراد ہوتا ہے۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ روح سے رحمت مراد ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں ”و ایدھم بروح منہ“ کہا ہے ”ای برحمة منہ“ اور جب کہ حضرت عیسیٰ خلق کے لیے رحمت تھے تو اُن کی نسبت ”روحاً منہ“ کا اطلاق کیا گیا ہے۔ سورہ مجادلہ میں تمام ایمان والوں کی نسبت کہا گیا ہے ”اولئک کتاب فی قلوبھم الایمان و ایدھم بروح منہ“۔ پھر حضرت عیسیٰ کی نسبت ایسے الفاظ کا استعمال کسی طرح اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے۔

سورۃ مریم میں جو الفاظ وارد ہوئے ہیں اُن پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ اُن سے بن باپ کے پیدا ہونے کا اشارہ پایا جاتا ہے۔ مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ سورۃ مریم میں حضرت مریم کے رویا کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے انسان کی صورت

دیکھی جس نے کہا کہ ”میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ تم کو پیٹا دوں۔ اس کے بعد جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر (فی) تعقیب کی آئی جیسے کہ ”فحملته فاجاءها المخاض“ مگر اس فی سے اتصال زمانی مستنبط نہیں ہو سکتا۔ جیسے کہ مثال مذکورہ بالا سے ظاہر ہے۔ کیوں کہ ان کے حاملہ ہونے اور دردزہ شروع ہونے میں اتصال زمانی نہ تھا۔ لوک کی انجیل میں بھی لکھا ہے کہ ”جب مریم کے جننے کے دن پورے ہوئے وہ اپنا پہلوتا پیٹا جی“۔ تفسیر کبیر میں بھی مدت حمل نو مہینے یا آٹھ مہینے یا سات مہینے لکھے ہیں۔ ابن عباس کی روایت نو مہینے کی ہے جو صحیح معلوم ہوتی ہے۔ غرض کہ اس مقام پر جہاں فی آئی ہے اس سے ہر جگہ خواہ مخواہ اتصال زمانی مستنبط نہیں ہو سکتا ہے۔

اس بات کے سمجھنے کے بعد آیات سورہ مریم پر غور کرنا چاہیے کہ جب حضرت مریم نے اپنے رویا میں انسان کو دیکھا تو انہوں نے کہا ”انی اعوذ الرحمن منك ان كنت تقيا“ اس نے کہا ”انما انا رسول ربك لاھب لك غلاما زكيا“ حضرت مریم نے کہا ”ان یكون لی غلام ولم یسنی بشر ولم اک بغیا“ اس نے کہا ”كذلك قال ربك هو علیٰ هین و لنجعلہ آية للناس و رحمة منا و كان امرا مقضیا“ اس کے بعد ہے۔ ”فحملته“ پس اس حرف فی سے جو فحملته پر ہے یہ لازم نہیں آتا کہ بمجرد اس گفتگو کے حضرت مریم حاملہ ہو گئی تھیں بلکہ پایا جاتا ہے کہ اس گفتگو کے کسی زمانہ ما بعد میں وہ حاملہ ہوئیں۔ جس وقت کی یہ گفتگو ہے بلاشبہ حضرت مریم کو کسی بشر نے نہیں چھوا تھا۔ لیکن اس کے بعد ان کا خطبہ یوسف سے ہوا اور وہ حسب قانون فطرت انسانی اپنے شوہر یوسف سے حاملہ ہوئیں۔

اسی طرح ”فاتت بہ قومہا تہملہ“ کی فہ کا حال ہے کہ وہ ولادت کے زمانے سے متصل نہیں ہے بلکہ اس مذکورہ ولادت کے بعد کسی زمانہ میں واقع ہوا ہے۔ تفسیر ابن عباس میں لکھا ہے کہ ولادت کے چالیس دن بعد یہ واقع ہوا ہے اور تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ یہ واقعہ یعنی قوم کے پاس لانے کا اور حضرت عیسیٰ کے کلام کرنے کا۔ حضرت عیسیٰ کی صغر سنی میں واقع ہوا تھا اور ابوالقاسم بلخی کا قول ہے کہ حضرت عیسیٰ جوان ہونے کے قریب تھے جب یہ واقعہ ہوا تھا چنانچہ تفسیر کبیر کی یہ عبارت ہے ”اختلف الناس فیہ فالجمہور علی انہ قال ہذا الکلام حال صغرہ“ وقال ابوالقاسم البلخی انہ کما قال ذالک ہین کان کالمراق الذی یفہم وان لم یبلغ حد التکلیف“ (تفسیر کبیر) غرض کہ علمائے مفسرین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تکلم حضرت عیسیٰ ولادت کے متصل نہ تھا۔

قرآن مجید سے صاف پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ ایسے وقت میں واقع ہوا تھا جب حضرت عیسیٰ نبی ہو چکے تھے۔ کیوں کہ آپ نے فرمایا ہے۔ کہ ”انی عبد اللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبینا“ تاریخ پر اور انجیلوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی بارہ برس کی عمر تھی (دیکھو انجیل لوک باب ۲) جب انہوں نے بیت المقدس میں یہودی عالموں سے گفتگو کی۔ اسی بات پر یہودی عالم ناراض ہوئے اور انہوں نے آکر حضرت مریم سے کہا کہ تیرے ماں باپ تو بڑے نیک تھے تو نے یہ کیسا عجیب یعنی بد مذہب لڑکا جنا ہے۔ حضرت مریم نے خود اس کا جواب نہیں دیا اور حضرت عیسیٰ کو اٹھا لائیں۔ اُس وقت انہوں نے فرمایا کہ ”انی عبد اللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبینا“



اور ممکن ہے کہ یہ واقعہ اُس کے بھی بعد ہوا ہو۔ یعنی جب کہ حضرت یحییٰ شہید ہو چکے تھے اور حضرت عیسیٰ نے یہودیوں کو سمجھانا اور ان کی بدیوں کو وعظ میں برا کہنا شروع کر دیا تھا۔

غرض کہ اس قدر تو جملہ علمائے مفسرین تسلیم کرتے ہیں کہ یہ واقعہ ولادت کے زمانہ کے متصل واقع نہیں ہوا تھا اس کے بعد ہوا۔ کوئی مدت ما بعد کے زمانہ کی چالیس دن اور کوئی قریب عمر مراحق یعنی بارہ برس کی قرار دیتا ہے اور ہم باستدلال قرآن مجید زمانہ نبوت قرار دیتے ہیں۔

قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عیسیٰ نے ایسی عمر میں جس میں حسب فطرت انسانی کوئی بچہ کلام نہیں کرتا کلام کیا تھا۔ قرآن مجید کے یہ لفظ ہیں ”کیف نکلم من کان فی المہد صبیا“ اس میں لفظ ”کان“ کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے سے ہم کیوں کر کلام کریں جو مہد میں تھا یعنی کم عمر لڑکا ہماری گفتگو کے لائق نہیں۔ یہ اسی طرح کا محاورہ ہے جیسے کہ ہمارے محاورہ میں ایک بڑا شخص ایک کم عمر لڑکے کی نسبت کہے کہ ابھی ہونٹ پر سے تو اس کے دودھ بھی نہیں سوکھا کیا یہ ہم سے مباحثہ کے لائق ہے ”کان“ کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت وہ نہ مہد میں تھے نہ مہد کے لائق تھے اور اس کے بعد کی آیت سے اس مراد کی اور بھی تائید ہوتی ہے اور بالفرض حضرت عیسیٰ نے اگر مہد میں کلام بھی کیا ہو تو اس سے ان کے بن باپ کے پیدا ہونے پر کیوں کر استدلال ہو سکتا ہے۔

یہودیوں کے اس قول سے بھی کہ ”یا مریم لقد جئت شیاً“ فرمایا ”اخت ہارون ما کان ابوک امر سوء و ما کان امک بغیا“ حضرت عیسیٰ کے بن باپ کے پیدا ہونے پر استدلال نہیں

ہو سکتا۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں جب کہ یہودیوں نے حضرت مریم سے یہ بات کہی کہ کوئی بھی حضرت مریم پر بدکاری کی تہمت نہیں کرتا تھا اور نہ اس آیت میں اس قسم کی تہمت کا اشارہ ہے 'فری' کے معنی بدیع و عجیب کے ہیں۔ اس لفظ سے غالباً یہودیوں نے مراد لی ہوگی "شیئاً عظیماً منکراً"۔ مگر اس سے یہ بات کہ انہوں نے اُس وقت حضرت عیسیٰ کی نسبت ناجائز مولود ہونے کی تہمت کی تھی لازم نہیں آتی۔ بلکہ قرینہ اس کے برخلاف ہے کیوں کہ حضرت عیسیٰ نے اس کے جواب میں اس تہمت سے بری ہونے کا کوئی لفظ بھی نہیں کہا۔ اگر اس وقت یہودیوں کی مراد اُس سے تہمت بد نسبت حضرت مریم کے اور ناجائز مولود ہونے کی نسبت حضرت عیسیٰ کے ہوتی تو ضرور حضرت عیسیٰ اپنے جواب میں اپنی اور اپنی ماں کی بریت اُس تہمت سے ظاہر کرتے۔

صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کی تلقین سے جو خلاف عقائد یہود تھی علمائے یہود ناراض ہو کر حضرت مریم کے پاس آئے جس سے اُن کی غرض یہ ہوگی کہ وہ حضرت عیسیٰ کو اُن باتوں سے باز رکھیں اور کہا کہ تیرا باپ اور تیری ماں تو بڑے نیک تھے تو نے یہ کیسا عجیب بچہ جنا ہے جو تمام عقائد کے خلاف باتیں کرتا ہے۔ حضرت مریم نے کہا کہ اُسی سے پوچھو۔ اس پر یہودیوں نے کہا کہ وہ کل کا بچہ ہمارے منہ لگنے کے لائق نہیں۔ اُس پر حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو اُٹھا لائیں اور انہوں نے کہا کہ میں خدا کا نبی ہوں۔ یہ ایسا معاملہ ہے جو فطرت انسانی کے موافق واقع ہوا اور اب بھی واقع ہوتا ہے۔ شوخ و شریر لڑکے کی ماں سے اُس کی شکایت کی جاتی ہے۔ جو شوخی کہ اس نے کی ہو اس کی نسبت اس کی ماں کہتی ہے کہ

اسی سے پوچھو۔ پس ان الفاظ سے جو قرآن مجید میں ہیں حضرت عیسیٰ کے بن باپ کے پیدا ہونے پر کسی طرح استدلال نہیں ہو سکتا۔ اٹھا لانے کا لفظ اس مقام پر مجازاً بولا گیا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ گود میں اٹھا لانا لازم نہیں آتا۔

سورة انبیاء میں حضرت مریم کی نسبت خدا نے فرمایا ہے ”والتی احصنت فرجہا فنفسخنا فیہا من روحنا وجعلناہا وابنہا آیۃ للعالمین“ اس سے بھی حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اول تو کوئی مسلمان خدا کی روح کے مجسم ہونے پر اعتقاد نہیں کر سکتا۔ ”احصنت فرجہا“ کے یہ معنی نہیں کہ ”احصنت فرجہا من کل رجل“۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ ”احصنت فرجہا من غیر زوجہا“۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے ”احصنت اے عن الفواحش لانہا قد ذقت بالزنا“ اس کی نظیر خود قرآن میں موجود ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ حصان کے معنی عقیقہ عورت کے ہیں اور اس کی مثال میں حضرت مریم کی نسبت جو لفظ ”احصنت فرجہا“ کا آیا ہے وہی لکھا ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اس لفظ سے حضرت مریم کا تہمت بد سے بری ہونا نکلتا ہے نہ حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا محصنات کے معنی عفاف کے اور جگہ بھی قرآن میں آتے ہیں جیسے کہ ”محصنات غیر مسافحات“ ”محصنین غیر مصافحین“ اور شوہر دار عورت کے بھی آئے ہیں جیسے کہ ”والصالحات من النساء“ تفسیر کبیر میں لکھا ہے ”یقال امرۃ محصنة اذا کانت ذات زوج“ پس حضرت مریم کی نسبت احصنت کا لفظ زیادہ تر صاحب زوج ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

نفخ روح حضرت عیسیٰ میں کچھ دلیل ان کے بن باپ ہونے نہیں ہو سکتی۔ تمام انسانوں کی نسبت خدا تعالیٰ نے نفخ روح

کہا ہے جیسے کہ سورہ تنزیل میں فرمایا ہے - ”خلق الانسان من طین ثم جعل نسله من سلالۃ من ماء مہین ثم سواہ و نفخ فیہ من روحہ“ پس جس طرح کہ اور انسانوں میں اللہ اپنی روح نفخ کرتا ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ میں بھی کی تھی -

سورۃ آل عمران میں ہے ”ان مثل عیسیٰ عند اللہ کہ مثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیہ کون“ اس آیت سے بھی حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا ثابت نہیں ہوتا ، مفسرین نے لکھا ہے کہ وفد نجران جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور جو حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے پر یہ دلیل لاتے تھے کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں اس لیے خدا کے بیٹے ہیں ، اس دلیل کے رد کرنے کو یہ آیت نازل ہوئی - اگر یہ روایت صحیح مانی جاوے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا تسلیم کر لیا ہو کیوں کہ یہ دلیل بہ طور دلیل الزامی کے ہے - دلیل الزامی میں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ جو مقدمہ مخالف نے قائم کیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط - بلکہ اس کے مقابلہ میں ایک اور مقدمہ مسلمہ پیش کیا جاتا ہے جس سے مخالف کی دلیل باطل ہو جاتی ہے - پس اس مقام پر دلیل الزامی اس طرح قائم ہوتی ہے کہ اگر بالفرض تم بوجہ بن باپ کے پیدا ہونے کے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہو تو حضرت آدم کو جو بن ماں باپ کے پیدا ہوئے ہیں بدرجہ اولیٰ خدا کا بیٹا ماننا چاہیے اور جب کہ تم حضرت آدم کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے تو حضرت عیسیٰ کو صرف بن باپ کے پیدا ہونے سے کیوں خدا کا بیٹا مانتے ہو -

معہذا اگر لفظ مثل سے حضرت آدم اور حضرت عیسیٰ میں مماثلت مراد ہے تو وہ مماثلت دونوں کی خلقت میں تو نہیں

ہو سکتی۔ کیوں کہ حضرت آدم مٹی سے یا پانی سے پیدا ہوئے تھے اور نہ وہ نو مہینے کسی عورت کے پیٹ میں رہے اور نہ مثل ایسے انسانوں کے جو نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں اُن کا حالت نطفہ سے جنین ہونے تک نشو و نما ہوا۔ برخلاف حضرت عیسیٰ کے۔ پس حضرت عیسیٰ اور حضرت آدم کی پیدائش میں تو کسی طرح مماثلت نہیں ہو سکتی اور اگر یہ کہا جاوے کہ صرف باپ نہ ہونے میں مماثلت ہے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اول یہ بات ثابت ہونی چاہیے کہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے جب یہ بات ثابت ہو جاوے تو بن باپ پیدا ہونے میں مماثلت کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ حالاں کہ ان کا بے باپ کے پیدا ہونا ابھی تک ثابت نہیں ہے پس اگر مماثلت ہے تو یا تو نفخ روح میں ہے کہ حضرت آدم کی نسبت بھی کہا ہے کہ ”نفخت فیہ من روحی“ اور حضرت عیسیٰ کی نسبت کہا ہے ”فنفخنا فیہ من روحنا“ اور یا صرف مخلوق ہونے میں ہے کہ جس طرح حضرت آدم خدا کے بندے اور مخلوق تھے اسی طرح حضرت عیسیٰ بھی خدا کے بندے اور مخلوق ہیں اور اس کی تائید قرآن مجید سے ہوتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے ”لن یتنسکف المسیح ان یرکون عبد اللہ“ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس آیت سے حضرت مسیح کے بن باپ پیدا ہونے پر استدلال کیا جاوے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ہر جگہ حضرت عیسیٰ کو ابن مریم کہا گیا ہے۔ اگر ان کے کوئی باپ ہوتا تو ان کی ابنیت باپ کی طرف منسوب کی جاتی نہ ماں کی طرف۔ مگر یہ دلیل نہایت بودی ہے۔ کیوں کہ جب قرآن نازل ہوا تو حضرت عیسیٰ یہود اور نصاریٰ دونوں میں ابن مریم کے لقب سے مشہور تھے۔ وہی مشہور لقب اُن کا قرآن میں بھی

بیان کیا گیا ہے اس سے ان کا بے باپ کے پیدا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ حضرت مسیح کے واقعات میں جیسے کہ آپ کی ولادت کا مسئلہ بحث طلب ہے ویسا ہی آپ کی وفات کا مسئلہ بھی غور کے لائق ہے۔ یہودی یقین رکھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھا کر قتل کر ڈالا۔ عیسائی یقین رکھتے ہیں کہ یہودیوں نے ان کو صلیب پر چڑھایا اور وہ صلیب ہی پر مر گئے پھر صلیب پر سے اتار کر قبر میں دفن کیا پھر وہ جی اٹھے۔ جمہور مسلمین کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ پر الحاد کا اور یہودی شریعت کے مسائل مقررہ سے بھر جانے کا الزام لگایا تھا۔ انجیل یوحنا کے ساتویں باب کی بارہویں آیت میں لکھا ہے کہ ”لوگوں میں اس کی (یعنی حضرت عیسیٰ کی) بابت بہت تکرار تھی۔ بعضے کہتے تھے کہ وہ نیک ہے اور کتنے کہتے تھے کہ نہیں بلکہ وہ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور اسی انجیل کے باب ۲۶ آیت ۶۵ میں لکھا ہے کہ سردار امام نے اپنے کپڑے پھاڑ کر کہا کہ یہ (یعنی حضرت عیسیٰ) کفر کہہ چکا ہے اب ہم کو اور گواہوں کی کیا درکار ہے دیکھو اب تم نے اس کا کفر بکنا سنا۔“

یہودی شریعت میں جیسے کہ توریت کی کتاب احبار باب ۲۴ ورس ۱۴ و کتاب استثناء باب ۱۳ سے پایا جاتا ہے ارتداد یا الحاد کی سزا سنگسار کرنا تھا۔ مگر اُس زمانہ میں رومیوں کی سلطنت تھی اور وہ یہودی شریعت سے مرتد ہونے کے جرم میں کسی کو سنگسار نہیں کرتے تھے اس لیے یہودیوں نے حضرت عیسیٰ پر بادشاہ وقت سے باغی ہونے کی تہمت لگائی اور پلاط سے کہا کہ

وہ اپنے تئیں یہودیوں کا بادشاہ کہتا ہے ، لوگوں کو ورغلاتا ہے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتا ہے ، جرم بغاوت کی سزا صلیب پر چڑھا کر مار ڈالنا تھی ۔ اس لیے یہودیوں نے پلاط سے جو وہاں کا حاکم تھا درخواست کی کہ وہ صلیب پر چڑھا دیا جاوے ۔

واقعہ صلیب کے بعد مختلف فرقوں نے مختلف رائیں اس کی نسبت قائم کیں ۔ یہودی اپنی شیخی سے یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ کو شریعت کے بموجب پہلے سنگسار کر کے قتل کر ڈالا اور پھر صلیب پر لٹکا دیا ۔ عیسائی سنگسار کر کے مار ڈالنا تو تسلیم نہیں کرتے جو درحقیقت غلط بھی ہے مگر صلیب پر چڑھا کر مار ڈالنا تسلیم کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ بعد اس کے حضرت عیسیٰ قبر میں دفن کیے گئے اور پھر مردوں میں سے جی اٹھے اور حواریوں سے ملے اور پھر زندہ آسمان پر چلے گئے اور اپنے باپ یعنی خدا کے دائیں ہاتھ پر جا بیٹھے ۔ بعض قدیم عیسائی فرقے جن کو حضرت عیسیٰ کا صلیب پر چڑھایا جانا بہت ناگوار تھا ۔ حضرت عیسیٰ کے صلیب پر چڑھائے جانے سے قطعاً منکر تھے بعض کہتے تھے کہ شمعون قرینی صلیب پر چڑھایا گیا اور بعض کہتے تھے کہ یہودائے اسخریوطی ۔ شمعون وہ شخص ہے جو صلیب لے کر چلنے کو بیگار میں پکڑا گیا تھا اور یہودا وہ شخص ہے جس نے مخبری کر کے حضرت عیسیٰ کو پکڑوایا تھا ۔

مسلمان مفسروں کی عادت ہے کہ پرانے قصوں میں بغیر تحقیقات اصلیت کے اور بلاغیر کرنے کے مقصد قرآن مجید پر جہاں تک ہو سکتا ہے یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کو لے لیتے ہیں ۔ انہوں نے پچھلی روایت کو زیادہ مؤدب سمجھا اور ظاہری الفاظ قرآن مجید

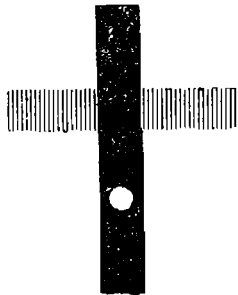
۱۔ دیکھو انجیل متی باب ۲۲ ورس ۱۶ و باب ۲۷ ورس ۱۱ و ۲۷ و انجیل

لوک باب ۱۵ ورس ۲ و ۲۶ و باب ۲۳ ورس ۲ و انجیل یوحنا باب

کو اس کے مناسب پایا۔ اس لیے انہوں نے پچھلی روایت کو اختیار کیا اور قرآن مجید کے ایک لفظ کی بناء پر جس کو ہم آگے بیان کریں گے یہ قرار دیا کہ شمعون یا یہودا کی صورت بدل کر بعینہ حضرت عیسیٰ کی سی صورت ہو گئی تھی اور یہودیوں نے اس کو حضرت عیسیٰ جان کر صلیب پر چڑھا دیا تھا اور وہ زندہ آسمان پر چلے گئے تھے۔

ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے آسمان پر جانے میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے اعتقاد میں چنداں تفاوت نہیں ہے کیونکہ دونوں حضرت عیسیٰ کے زندہ آسمان پر چلے جانے کا اعتقاد رکھتے ہیں، مگر درحقیقت یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو دونوں مذہبوں میں نہایت مختلف ہے۔ عیسائی مذہب میں حضرت عیسیٰ کے صلیب پر چڑھائے جانے اور صلیب ہی پر جان دینے کا اعتقاد رکن اعظم ایمان ہے۔ کیوں کہ ان کے اعتقاد میں انسانوں کی نجات صرف حضرت عیسیٰ کے فدیہ ہونے یعنی صلیب پر جان دینے میں منحصر ہے۔ جو کوئی اس امر کا اعتقاد نہ کرے وہ موجودہ عیسائی مذہب کے مطابق عیسائی نہیں ہے اور نہ نجات کا مستحق ہے۔ پس مسلمانوں کا یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰ بغیر صلیب پر چڑھائے زندہ آسمان پر چلے گئے موجودہ عیسائی مذہب کے بالکل برخلاف ہے۔

اس واقعہ پر بحث کرنے سے پہلے ہم کو مناسب ہے کہ



صلیب دینے کی نسبت کچھ بیان کریں کہ وہ کیوں کر دی جاتی تھی اور کس طرح آس پر جان نکالتی تھی۔ جاننا چاہیے کہ صلیب بطور چلیپا کے اس صورت کی ہوتی تھی آس پر چڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ آن لکڑیوں پر جو یمن و یسار

میں ہیں پھیلاتے تھے اور آس کی ہتھیلیوں کو آن لکڑیوں سے ملا کر



آہنی کیلیں ٹھوک دیتے تھے جہاں گول نشان ہے وہاں ایک مضبوط لکڑی لگی ہوتی تھی جو دونوں ٹانگوں کے بیچ میں زہتی تھی اور انسان اُس پر لٹک جاتا تھا اس سے یہ غرض تھی کہ انسان بدن کے بوجھ سے نہ کھسکنے پاوے۔ پھر دونوں پاؤں کو اوپر تلے کر کے اور نیچے کی لمبی لکڑی پر رکھ کر ایک لوہے کی میخ اس طرح ٹھوکتے تھے کہ دونوں پاؤں کو توڑ کر لکڑی میں نکل جاتی تھی اور کبھی پاؤں میں میخ نہیں ٹھوکتے تھے بلکہ رسی سے خوب جکڑ کر باندھ دیتے تھے۔

صلیب پر چڑھا دینے سے انسان مر نہیں جاتا کیوں کہ اس کی صرف ہتھیلیاں اور کبھی ہتھیلیاں اور پاؤں زخمی ہوتے تھے اس کے مرنے کا سبب یہ ہوتا تھا کہ چار چار، پانچ پانچ دن تک اس کو صلیب پر لٹکائے رکھتے تھے اور ہاتھ پاؤں کے چھیدوں اور بھوک اور پیاس اور دھوپ کا صدمہ آٹھاتے آٹھاتے کئی دن میں مرتا تھا۔ چنانچہ اس کی سند طیطوس کی شہادت سے جو کتاب میٹری کان صفحہ ۱۱ میں اور ازیمرس کی شہادت سے جو تفسیر انجیل متی مطبوعہ گریگارئین صفحہ ۶۳ میں مندرج ہے اور ازلسطربنان کی کتاب صفحہ ۲۹۰ سے جو حضرت مسیح کے حالات میں لکھی ہے اور یوسی بیس کی تاریخ کلیسا صفحہ ۲۹۱ سے بخوبی پائی جاتی ہے۔

اب اس بات پر غور کرنی چاہئے کہ حضرت عیسیٰ کو کس طرح صلیب پر چڑھایا تھا۔ جس دن حضرت عیسیٰ صلیب پر چڑھائے گئے وہ جمعہ کا دن تھا اور یہودیوں کی عید فصح کا تہوار تھا۔ دوپہر کا وقت تھا جب ان کو صلیب پر چڑھایا گیا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ان کی ہتھیلیوں میں کیلیں ٹھونکی گئیں مگر یہ امر مشتبہ ہے کہ پاؤں میں بھی کیلیں ٹھوکی گئیں یا نہیں۔ کیوں کہ انجیل یوحنا میں صرف ہتھیلیوں کے چھید دیکھنے کا ذکر ہے اور لوقا کی انجیل میں ہاتھ پاؤں دونوں کا مگر اس

اختلاف سے جو اصل امر ہے اس میں کچھ اثر پیدا نہیں ہوتا ۔

عید فصیح کے دن ختم ہونے پر یہودیوں کا سبت شروع ہونے والا تھا اور یہودی مذہب کی رو سے ضرور تھا کہ مقتول یا مصلوب کی لاش قبل ختم ہونے دن کے بغی قبل شروع ہونے سبت کے دفن کر دی جاوے مگر صلیب پر انسان اس قدر جلدی نہیں مر سکتا تھا ۔ اس لیے یہودیوں نے درخواست کی کہ حضرت مسیح کی ٹانگیں توڑ دی جاویں تاکہ فی الفور مر جاویں ۔ مگر حضرت عیسیٰ کی ٹانگیں توڑی نہیں گئیں اور لوگوں نے جانا کہ وہ اتنی دیر میں مر گئے ۔ برجھی کا حضرت عیسیٰ کے پہلو میں آن کے زندہ یا مردہ ہونے کی شناخت کے لیے چبھونا صرف یوحنا کی انجیل میں ہے اور کسی انجیل میں نہیں ہے اور نہ اُس وقت جب کہ حضرت عیسیٰ نے اپنے ہاتھوں کے چھید حواریوں کو دکھلائے ۔ پسلی کے چھید کا دکھانا کسی انجیل میں لکھا ہے اس برجھی کا چبھونا نہایت مشتبہ ہے محمدا بھی اگر وہ صحیح ہو تو وہ بھی کوئی ایسا زخم جس سے فی الفور ہلاکت ہو متصور نہیں ہو سکتا ۔ جس طرح آن کے ہاتھ پاؤں زخمی تھے اسی طرح پسلی کے نیچے بھی ایک زخم تسلیم کیا جاوے ۔

جب کہ لوگوں نے غلطی سے جانا کہ حضرت در حقیقت مر گئے ہیں تو یوسف نے حاکم سے اُن کے دفن کر دینے کی درخواست کی ۔ وہ نہایت متعجب ہوا کہ ایسے جلد مر گئے ۔ اس قدر جلدی مر جانے کی خبر سے کچھ حاکم ہی متعجب نہیں ہوا بلکہ عیسائی بھی اس کو ناممکن سمجھتے تھے اور اس لیے تیسری صدی عیسوی میں جو عیسائی علماء تھے انہوں نے حضرت عیسیٰ کا اس قدر جلد صلیب پر مرنا آخر کار ایک معجزہ قرار دیا ۔

غرضکہ یوسف کو دفن کرنے کی اجازت مل گئی اور

حضرت عیسیٰ صرف تین چار گھنٹے صلیب پر رہے کسی کتاب سے نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی رسم تجہیز و تکفین کی حضرت عیسیٰ کے ساتھ عمل میں آئی تھی بلکہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوسف نے ان کو ایک لحد میں رکھا اور اس پر ایک پتھر ڈھانک دیا۔

اس بات کا تصفیہ نہیں ہو سکتا کہ یوسف نے یہ کام اس لیے کیا تھا تاکہ حضرت عیسیٰ کے دشمن یقین کر لیں کہ درحقیقت عیسیٰ مر گئے اور وہ جانتا تھا کہ وہ مرے نہیں ہیں یا آنکہ درحقیقت ان کو مردہ سمجھ کر اس نے لحد میں رکھ دیا تھا۔ بہر حال رات کو وہ اس لحد میں نہ تھے اور اس سے پہلی بات کی تائید ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود یہودیوں کو بھی شبہ تھا کہ وہ مر گئے ہیں یا نہیں۔ اس لیے صبح کو بروز شنبہ انہوں نے حاکم کی اجازت سے وہاں پر پہرہ متعین کر دیا مگر اب کیا فائدہ تھا جو کچھ ہونا تھا وہ اس سے پہلے ہو چکا تھا۔

جب اس تمام واقعہ پر مؤرخانہ طور پر نظر ڈالی جاوے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ صلیب پر مرے نہ تھے بلکہ ان پر ایسی حالت طاری ہو گئی تھی کہ لوگوں نے ان کو مردہ سمجھا تھا اس امر کی نظیریں کہ صلیب پر سے لوگ زندہ اترے ہیں تاریخ میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر کلارک نے متی کی انجیل کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ایسی کئی ایک مثالیں موجود ہیں کہ شخص مصلوب کئی دن تک زندہ رہا ہے۔ ہیروڈوٹس رومی مؤرخ نے لکھا ہے کہ سندوکیس دارا کے حکم سے صلیب پر چڑھایا گیا۔ اور پھر اس کے حکم سے اتارا گیا وہ زندہ رہا اور رہا کر دیا گیا۔ یوسی سیس مؤرخ نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ طیطوس بادشاہ کے حکم سے بہت سے قیدی صلیب پر چڑھائے گئے ان میں سے تین آدمی اس کے ملاقاتی تھے۔ اس نے بادشاہ سے ان کی سفارش

کی اور وہ صلیب پر سے اتارے گئے اور ان کا معالجہ کیا گیا۔ مگر ان میں سے دو آدمی مر گئے اور ایک شخص اچھا ہو گیا۔ حضرت عیسیٰ تین چار گھنٹے بعد صلیب سے اتار لیے گئے تھے اور ہر طرح پر یقین ہو سکتا ہے۔ کہ وہ زندہ ہی رات کو وہ لحد سے نکال لیے گئے اور وہ مخفی اپنے مریدوں کی حفاظت میں رہے۔ حواریوں نے ان کو دیکھا اور ملے اور پھر کسی وقت اپنی موت سے مر گئے۔ بلاشبہ ان کو یہودیوں کی عداوت کے خوف سے نہایت مخفی طور پر کسی نامعلوم مقام میں دفن کر دیا ہوگا جو اب تک نامعلوم ہے اور یہ مشہور کیا گیا ہوگا کہ وہ آسمان پر چلے گئے۔ حضرت موسیٰ کی وفات کے وقت بھی نہایت شبہ تھا کہ بنی اسرائیل جو پہاڑوں اور جنگلوں میں پھرتے پھرتے اور دشمنوں سے لڑتے لڑتے حضرت موسیٰ کے ہاتھ سے نہایت تنگ ہو گئے تھے حضرت موسیٰ کی تلاش کے ساتھ کیا کریں گے اس لیے کہ ان کو بھی ایک پہاڑ کی کھوہ میں ایسے نامعلوم مقام میں دفن کیا گیا تھا کہ آج تک کسی کو اس کا پتہ معلوم نہیں ہوا۔ چنانچہ توریت کی پانچویں کتاب میں لکھا ہے، کہ ”پس موسیٰ بندہ خداوند در آنجا بزمین معہ آب موافق قول خداوند وفات کرد او را در درہ زمین معہ آب برابریت یعور دفن کرد هیچ کس از مقبرہ او تا بہ امروز واقف نیست“۔ حضرت علی مرتضیٰ کا جنازہ بھی خوارج کے خوف سے اسی طرح مخفی طور پر دفن کیا گیا تھا۔ حالانکہ خوارج کا خوف بہ نسبت یہودیوں کے بہت کم تھا اور اسی طرح بعض لوگوں نے حضرت علی مرتضیٰ کی نسبت بھی کہا تھا کہ وہ آسمان پر چلے گئے۔

اب ہم کو قرآن پر غور کرنا چاہیے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ کی وفات کے متعلق چار جگہ

ذکر آیا ہے ۔

اول ۔ تو سورہ آل عمران میں اور وہ یہی آیت ہے جس کی ہم تفسیر لکھتے ہیں کہ جب ”اذ قال اللہ یا عیسیٰ انی مستوفیک ورافعک الی“ (آل عمران آیت ۵۶) اللہ نے عیسیٰ سے کہا کہ ”بے شک میں تجھ کو وفات دینے والا ہوں اور تجھ کو اپنی طرف رفع کرنے والا ہوں“ ۔

دوم ۔ سورہ مائدہ میں جہاں فرمایا ہے کہ ”جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ سے کہے گا کہ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ تو حضرت عیسیٰ کہیں گے کہ میں نے ان سے نہیں کہا بجز اس کے جس کا تو نے مجھ کو حکم دیا تھا کہ خدا کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے اور جب تک میں ان میں رہا ان پر شاہد تھا ۔ پھر جب تو نے مجھ کو وفات دی تو تو ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے“ ۔

سوم ۔ سورہ مریم میں جہاں فرمایا ہے کہ ”جب حضرت مریم حضرت عیسیٰ کو علماء یہود سے کلام کرنے کو لے آئیں تو حضرت عیسیٰ نے کہا کہ ”میں خدا کا بندہ اور نبی ہوں مجھ کو کتاب ملی ہے اور مجھ کو حکم دیا ہے نماز کا اور زکوٰۃ کا جب تک کہ میں زندہ رہوں اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے کا اور مجھ کو جبار و شقی نہیں بنایا ہے اور مجھ پر سلامتی ہے جس دن کہ میں پیدا ہوا اور جس دن کہ مروں گا اور جس دن کہ پھر زندہ ہو کر اٹھوں گا“ ۔

چہارم ۔ سورہ نساء میں جہاں یہودیوں کے کفر کے اقوال بیان کیے ہیں وہاں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”یہودی کہتے تھے ہم نے عیسیٰ بن مریم رسول خدا کو قتل کر ڈالا حالانکہ

نہ انہوں نے ان کو قتل کیا اور نہ صلیب پر مارا، لیکن ان پر (صلیب پر مار ڈالنے کی) شبہہ کر دی گئی اور جو لوگ کہ اس میں اختلاف کرتے ہیں البتہ وہ اس بات میں شک میں پڑے ہیں۔ ان کو اس کا یقین نہیں ہے بجز گمان کی پیروی کے۔ انہوں نے ان کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے اپنے پاس ان کو اٹھا لیا۔“

پہلی تین آیتوں سے حضرت عیسیٰ کا اپنی موت سے وفات پانا علانیہ ظاہر ہے مگر جو کہ علمائے اسلام نے بہ تقلید بعض فرق نصاریٰ نے قبل اس کے کہ مطلب قرآن مجید پر غور کریں یہ تسلیم کر لیا تھا کہ حضرت عیسیٰ زندہ آسمان پر چلے گئے ہیں۔ اس لیے انہوں نے ان آیتوں کے بعض الفاظ کو اپنی غیر محقق تسلیم کے مطابق کرنے کو بے جا کوشش کی ہے۔

پہلی آیت میں صاف لفظ ”متوفیک“ کا واقع ہے جس کے معنی عموماً ایسے مقام پر موت کے لیے جاتے ہیں۔ خود قرآن مجید سے اس کی تفسیر پائی جاتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے ”اللہ یتوفی الانفس حین موتھا“ ابن عباس اور محمد بن اسحاق نے بھی جیسے کہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے ”متوفیک“ کے معنی ”ممیتک“ کے لیے ہیں۔

یہی حال لفظ ”توفیتنی“ کا ہے جو دوسری آیت میں ہے اور جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تو نے مجھ کو موت دی یعنی جب میں مر گیا اور ان میں نہیں رہا تو تو ان کا نگہبان تھا۔

پہلی آیت میں اور چوتھی آیت میں لفظ ”رفع“ کا بھی آیا ہے جس سے حضرت عیسیٰ کی قدر و منزلت کا اظہار مقصود ہے نہ یہ کہ ان کے جسم کو اٹھا لینے کا۔ تفسیر کبیر میں بھی

بعض علماء کا قول لکھا ہے کہ لفظ ”رفع“ کا تعظیماً اور تغنیماً بولا گیا ہے۔

جن علماء نے ”متوفیک“ کے معنی ”ممیتک“ کے قرار دیے تھے انہوں نے قرآن مجید کے ٹھیک ٹھیک معنی سمجھے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو قتل نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی موت سے مرے۔ مگر انہوں نے ”رافعک“ کے معنوں میں غلطی کی جو یہ خیال کیا کہ پھر زندہ ہو کر آسمان پر چلے گئے۔ کیوں کہ ”رافعک“ کے لفظ سے جیسا ہم نے اوپر بیان کیا۔ آسمان پر جانا لازم نہیں آتا۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ پر موت طبعی طاری کرنے سے مقصود یہ تھا کہ ان کے دشمن ان کو قتل نہ کر سکیں۔ وہب کا یہ قول ہے کہ وہ تین گھنٹہ تک مردہ رہے اور محمد بن اسحاق کا قول ہے کہ سات گھنٹہ، تک پھر زندہ ہوئے اور آسمان پر چلے گئے اور ربیع ابن انس کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھاتے وقت موت دی۔

بہر حال ان اقوال سے اس قدر ثابت ہوا کہ بعض علماء اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو موت طبعی طاری ہوئی اور بعض علماء نے ’رفع‘ کے لفظ سے حضرت عیسیٰ کے جسم کا آسمان پر اٹھا لینا مراد نہیں لیا، بلکہ اس سے ان کی قدر و منزلت مراد لی ہے۔ پس جب ان دونوں قولوں کو تسلیم کیا جاوے تو جو ہم بیان کرتے ہیں وہی پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو یہودیوں نے نہ سنگسار کر کے قتل کیا نہ صلیب پر قتل کیا بلکہ وہ اپنی موت سے مرے اور خدا نے ان کے درجہ اور مرتبہ کو مرتفع کیا۔

ان آیتوں میں ایک اور لفظ بھی غور کے قابل ہے یعنی

”سادت فیہم“ اس کے صاف معنی ہیں کہ جب تک میں زندہ تھا اور اس کی سند خود قرآن مجید کی دوسری آیت میں موجود ہے جہاں فرمایا ہے ”سادت حیا“ پس صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو معنی ’حیا‘ کے ہیں وہی معنی ”فیہم“ کے ہیں، اس کے بعد ہے ”فلما توفیتہنی“ تو اس سے اور بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس لفظ سے ”حیا“ ہی مراد تھی اور مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ جب تک میں ان میں تھا یعنی زندہ تھا تو میں اس پر شاہد تھا اور جب تو نے مجھے موت دی تو تو ان کا نگہبان رہا۔ پس ان دونوں آیتوں میں اس دنیا ہی میں حضرت عیسیٰ کا زندہ رہنا اور اس دنیا ہی میں اپنی موت سے مرنا بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔

اب باقی رہی چوتھی آیت، مگر جب یہ تحقیق ہو گیا کہ یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ کو سنگسار کر کے قتل کیا تھا اور عیسائی یہ یقین کرتے تھے کہ یہودیوں نے صلیب پر حضرت عیسیٰ کو قتل کیا تھا حالاں کہ یہ دونوں باتیں غلط تھیں۔ وہ سنگسار تو ہرگز نہیں ہوئے، صلیب پر البتہ لٹکائے گئے مگر صلیب پر مرے نہیں۔ ان دونوں اعتقادوں کے رد کرنے کو خدا نے فرمایا کہ ”ما قتلوه و ما صلبوه“ پہلے ”ما“ قافیہ سے نفس قتل کا سلب ہوتا ہے اور دوسرے سے کمال صلیب کا۔ کیوں کہ صلیب پر چڑھانے کی تکمیل اسی وقت تھی جب صلیب کے سبب موت واقع ہوئی، حالاں کہ صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی۔ ”ولکن شبہ لہم“ سے اور زیادہ تشریح اس مطلب کی ہوتی ہے۔ تشبیہ میں چار چیزیں ہوتی ہیں: ایک مشبہ اور ایک مشبہ بہ، ایک وجہ تشبیہ ایک مشبہ لہ۔ اس آیت میں صرف دو چیزیں بیاں ہوئی ہیں: ایک مشبہ



جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے ، دوسری مشبہ لہم جو یہودی تھے اور جو درپے قتل حضرت مسیح تھے - مشبہ بہ قرآن میں مذکور نہیں ہے - علمائے اسلام نے بعض عیسائی فرقوں کا یہ قول پایا کہ شمعون یا یہودا صلیب پر چڑھایا گیا تھا انہوں نے جھٹ قرآن کے معنی بدل دیے اور یہودا یا شمعون کو مشبہ اور حضرت عیسیٰ کو مشبہ بہ اور یہودا یا شمعون کی تبدیل صورت کو وجہ تشبیہ قرار دے دیا ، حالانکہ یہاں حرف مشبہ بہ محذوف ہے اور وہ ”موتی“ ہے اور وجہ تشبیہ وہ حالت ہے جو حضرت عیسیٰ پر طاری ہوئی تھی جس کے سبب وہ مردہ تصور ہوئے تھے - پس تقدیر آیت کی یہ ہے کہ ”و ما صلبوہ و لکن شبہ لہم بالـموتی“ اس کی زیادہ تصریح اسی آیت کے اگلے لفظوں سے ہوتی ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ ”جو لوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں وہ شک میں ہیں - ان کو کچھ علم نہیں ہے بجز گمان کی - پیروی کے“ اور پھر اس کے بعد تاکیداً اور یقیناً فرمایا کہ ”انہوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا اور اس مقام پر صلیب کا کچھ ذکر نہیں کیا بلکہ صرف قتل کی نفی کی اور اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اوپر جو صلیب کی نفی کی تھی اس سے نفی قتل بالصلیب مراد تھی نہ مطلق صلیب - ”ثم اماتہ باجل مسمی و رفعہ الیہ کما قال اللہ تعالیٰ بل رفعہ اللہ الیہ -

انہی باتوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائی عالموں سے مباہلہ چاہا جس سے ایک نہایت عمدہ طور پر فطرت انسانی ظاہر ہوتی ہے - تمام اہل مذاہب خواہ صحیح مذہب رکھتے ہوں یا غلط دو قسم کے ہوتے ہیں - جہلا اور علماء ، جہلا کا یقین مذہبی باتوں پر نہایت پختہ اور مستحکم ہوتا ہے اور جو کچھ انہوں نے

سمجھا ہے یا سیکھا ہے اس کے سوا وہ اور کچھ نہیں جانتے اور کوئی شبہ ان کے دل میں نہیں ہوتا۔ ان کی مثال اندھے آدمی کی سی ہے کہ وہ اس رستہ پر جو اس کو کسی نے بتلا دیا ہے چلا جاتا ہے اور اس کے ٹھیک ہونے پر یقین رکھتا ہے اور خود نہیں جانتا کہ درحقیقت یہ رستہ اسی جگہ جاتا ہے جہاں اس کو جانا ہے یا نہیں۔ پھر اگر کسی نے کہہ دیا کہ میں اندھے آگے گرھا ہے یا دیوار ہے تو وہ بغیر کسی شک کے اس پر یقین کر لیتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے۔ پھر جس نے جو راہ بتائی اس طرف ہو لیا۔ یہی جہلائے اہل مذہب کا حال ہے جس مذہب میں وہ ہیں ان کو اس پر ذرا بھی شبہ نہیں۔ مگر علماء کا حال اس کے برخلاف ہوتا ہے گو وہ بھی مذہب کی پیروی کرتے ہیں اور جس مذہب میں وہ ہیں اس کو سچ کہتے ہیں اور دل میں بھی اس پر یقین رکھتے ہیں مگر ان کا دل شبہ سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ مذہب کے ہزاروں مسئلوں کو سچ کہتے ہیں مگر ان کی عقل ان کو قبول نہیں کرتی ان کا علم ان کے ویسے ہی ہونے پر ان کی تصدیق نہیں کرتا اور جب وہ اس پر سچا یقین نہیں کر سکتے تو اپنے دل کو سمجھاتے ہیں کہ گو یہ بات عقل سے اور سمجھ سے دور ہو مگر مذہب کی رو سے ہم کو یونہی ماننا اور اس پر یقین کرنا ضرور ہے۔ پس درحقیقت ان پر ان کو سچا یقین نہیں ہوتا۔ دل میں ایک کاٹھا سا کھٹکتا رہتا ہے اور جس پر ان کو حقیقی یقین نہیں ہوتا اس پر یقین بٹھلانا چاہتے ہیں۔ علمائے عیسائی جو حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے کا اعتقاد رکھتے تھے یہ بھی ایسی ہی باتیں ہوتی تھیں جن کو وہ مذہباً مانتے تھے اور مذہباً اس پر اعتقاد رکھتے تھے۔ مگر سچائی سے دل نہیں مانتا تھا۔ فطرت انسانی میں یہ بات ہے کہ جو سچا شبہ اس کے دل میں ہوتا ہے وہ دور کرنے سے دور نہیں ہوتا

اور یقین بٹھلانے سے یقین نہیں بیٹھتا۔ بلکہ وہ شبہ جب ہی دور ہوتا ہے جب حقیقتاً شبہ دور ہو جاوے اور یقین جب ہی آتا ہے جب کہ حقیقتاً یقین آ جاوے۔ ایسی حالت میں کوئی شخص ایسی بات کرنے پر فطرتاً آمادہ نہیں ہو سکتا جو اُس کے دل میں کھٹکنے والے شبہ کے برخلاف ہو۔ اسی لیے علمائے عیسائی سے نہ جھلائے عیسائی سے کہا گیا کہ اگر تم اس پر یقین رکھتے ہو تو مباہلہ کرو اور ظاہر ہو گیا کہ وہی دل میں کھٹکنے والا شبہ اُس پر آمادہ نہیں کر سکتا اور ثابت ہو گیا کہ خود علمائے عیسائی کو حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے اور مر کے جی اٹھنے پر سچا یقین نہیں تھا اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اب بھی بجز ایسے یقین کے جو مذہباً ہوتا ہے سچا یقین نہیں ہے۔

ہم اہل اسلام کو بھی ان باتوں سے بری نہیں سمجھتے۔ ہزاروں مسلمان اس وقت موجود ہیں جو بہت سے مسئلوں پر صرف اس وجہ سے یقین رکھتے ہیں کہ مذہباً اُن پر یقین رکھنا چاہئے مگر وہ دل میں کھٹکنے والا شبہ اُن کے دل میں موجود ہے۔ البتہ اسلام میں ایسے علماء اور اہل اللہ بھی گذرے ہیں جنہوں نے درحقیقت مذہب اسلام پر غور و فکر کی ہے اور حقیقتاً تمام شبہات ان کے دل سے دور ہوئے ہیں اور حقیقتاً اُن کے دل میں یقین آیا ہے۔ ایسے محققین کو ہمیشہ لوگوں نے کافر کہا ہے اور اب بھی کہتے ہیں۔ مگر کچھ شبہ نہیں کہ خدا کے سامنے ان کے کفر کے مقابلہ میں دوسروں کا ایمان بجوے ہم نمی آزد۔

## حضرت عیسیٰ کے معجزات

سورہ مائدہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اُن واقعات میں سے جو حضرت عیسیٰ پر بچنے اور جوانی کے زمانہ میں گزرے تھے چند واقعات کا جن کا بیان سورہ آل عمران میں بھی ہو چکا ہے بطور اپنے احسان اور اپنی نعمت کے بیان کرنا شروع کیا ہے۔ بچنے کی حالت کو یاد دلایا ہے پھر نوعمری کے زمانہ کو یاد دلایا ہے پھر نبوت کے زمانہ کو یاد دلایا ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ اس طرح کا طرز کلام نہایت دلچسپ اور محبت سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ایک اعلیٰ درجہ کے شخص کو اس کے بچنے کی بھولی بھولی باتیں یاد دلائی جاتی ہیں اور پھر اُن کالوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کو اس نے حاصل کیا ہے ان دونوں زمانہ کی باتیں مل کر نہایت دلچسپ اور پر اثر ہو جاتی ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو دونوں زمانوں کی باتوں کو یاد دلایا ہے اور یوں فرمایا ہے کہ تو اس بات کو یاد کر جب کہ میں نے روح القدس سے تیری مدد کی۔ تو اس بات کو یاد کر جب کہ تو نے بچنے میں گفتگو کی۔ تو اس بات کو یاد کر جب کہ میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت سکھائی۔ تو اس وقت کو یاد کر جب کہ تو مٹی سے جانوروں کی مورتیں بناتا تھا اور اُن میں پھونکتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ اللہ کے حکم سے زندہ ہو جاویں گی۔ تو اُس وقت کو یاد کر جب کہ تو ااندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرتا تھا۔ تو اُس وقت کو یاد کر جب کہ تو موتے کو زندہ کرتا تھا

تو اُس وقت کو یاد کر جب کہ میں نے تجھ کو بنی اسرائیل سے بچایا۔ اُس وقت کو یاد کر جب کہ میں نے حواریوں کے دل میں ڈالا کہ مجھ پر اور تجھ پر ایمان لاویں۔ تو اُس وقت کو یاد کر جب کہ تجھ سے حواریوں نے آسمان پر سے رزق اترنے کی درخواست کی۔ تو اُس وقت کو بھی یاد رکھ جب کہ میں تجھ کو اُس شرک کے الزام سے جو تیری امت نے تجھ پر دھرا ہے بری کروں گا۔ ان باتوں کے سوا سورۃ آل عمران میں ایک اور بات بھی بیان ہوئی ہے کہ حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی (یعنی احکام) لے کر آیا ہوں اور یہ بھی کہا کہ میں تم کو بتلاؤں گا کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو۔

یہ سب بارہ باتیں ہیں جن کو ہم ایک سلسلے میں جمع کر کے ہر ایک کا ترتیب سے جدا جدا بیان کریں گے۔ اول تکلم فی المہد۔ دوم خلق طیر۔ سوم تائید روح القدس۔ چہارم تعلیم کتاب و حکمت۔ پنجم خدا کی نشانی لانا۔ ششم حواریوں کے دل میں ایمان کا ڈالنا۔ ہفتم اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا۔ ہشتم موتے کو زندہ کرنا۔ نہم اخبار عن الغیب۔ دہم مائدہ یازدہم بنی اسرائیل سے بچانا۔ دوازدہم براءت عن المشرکین۔

### اول۔ تکلم فی المہد

اس امر کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں فرمایا ہے ”و یکلّم الناس فی المہد و کھلا“ اور سورۃ مائدہ میں فرمایا ”تکلم الناس فی المہد و کھلا“ اور سورۃ مریم میں فرمایا ہے فا شارّت الیہ قالوا کیف تکلم من کان فی المہد صبیا قال ان عبد اللہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیا“۔

ان آیتوں میں صرف لفظ مہد کا ہے جس پر بحث ہو سکتی ہے

مگر مہد سے صرف صغر سنی کا زمانہ مراد ہے نہ وہ زمانہ جس میں کوئی بچہ بمقتضائے قانون قدرت کلام نہیں کر سکتا اس مضمون پر ہم اس سے پہلے بحث کر چکے ہیں۔

## دوم۔ خلق طیر

یہ اس حالت کا ذکر ہے جب کہ حضرت عیسیٰؑ مجھے تھے اور بچنے کے زمانہ میں بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے اُس کی نسبت خدا نے سورہ آل عمران میں حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے یوں فرمایا ہے کہ ”انی اخلقکم من الطین کھیئۃ الطیر فیکون طیرا باذن اللہ“ اور سورہ مائدہ میں یوں فرمایا ہے واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذن فتنفخ فیہا فتکون طیرا باذن“۔

سورہ آل عمران میں یہ مضمون حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے متکلم کے صیغوں میں بیان ہوا ہے اور سورہ مائدہ میں خدا کی طرف سے مخاطب کے صیغوں میں۔ مگر سورہ آل عمران میں اس آیت سے پہلے یہ آیت ہے کہ ”انی قد جئتکم بایۃ من ربکم اور اس کی نسبت ہم نے ثابت کیا ہے کہ وہ سوال کے جواب میں ہے اُسی سیاق پر یہ آیت ہے اور سوال کے جواب میں واقع ہوئی ہے تقدیر کلام کی یہ ہے کہ کسی شخص نے حضرت عیسیٰؑ کو مٹی سے جانوروں کی مورتیں بناتے دیکھ کر پوچھا کہ ’ما تفعل‘؟ ’قال بحیبالہ یانی اخلقکم من الطین کھیئۃ الطیر الخ‘۔ تاریخ سے بھی پایا جاتا ہے کہ جانوروں کی مورتیں بنانے کی نسبت لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ سے سوال بھی کیا تھا جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔

اب اس پر بحث یہ ہے کہ کیا در حقیقت یہ کوئی معجزہ تھا اور کیا در حقیقت قرآن مجید سے اُن مٹی کے جانوروں کا جاندار

ہو جانا اور اڑنے لگنا ثابت ہوتا ہے۔ تمام مفسرین اور علمائے اسلام کا جواب یہ ہے کہ ہاں۔ مگر ہمارا جواب ہے کہ نہیں۔ بشرطیکہ دل و دماغ کو ان خیالات سے جو قرآن مجید پر غور کرنے اور قرآن مجید کا مطلب سمجھنے سے پہلے عیسائیوں کی صیح و غلط روایات کی تقلید سے بیٹھا لیے ہیں خالی کر کے نفس قرآن مجید پر بنظر تحقیق غور کیا جاوے۔

سورہ آل عمر آن میں جو یہ الفاظ ہیں کہ انی اخلق لکم من الطین کھیثۃ الطیرا فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مٹی سے پرندوں کی مورتیں بناتا ہوں پھر ان میں پھونکوں گا تاکہ وہ اللہ کے حکم سے پرند ہو جاویں۔ یہ بات حضرت عیسیٰ نے سوال کے جواب میں کہی تھی مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پھونکنے کے بعد در حقیقت وہ پرندوں کی مورتیں جو مٹی سے بناتے تھے جاندار ہو جاتی تھیں اور اڑنے بھی لگتی تھیں۔

”فیکون“ پر جو (ف) ہے وہ عاطفہ تو ہو نہیں سکتی کیوں کہ اگر وہ عاطفہ ہو تو ”یکون طیرا ان کی خبر ہوگی اور اس کا عطف“ ”اخلق“ پر ہوگا اور ”یکون طیرا“ میں یکون صیغہ متکلم کا نہیں ہے اور نہ اس کلام میں کوئی ضمیر اس طرح پر واقع ہوئی ہے کہ اسم ان کی طرف راجع ہو سکے اس لیے ”یکون طیرا“ نحو کے قاعدہ کے مطابق یا یوں کہو کہ بموجب محاورہ زبان عرب کے کسی طرح ان کی خبر نہیں ہو سکتا ”فیکون“ کی ف، عاطفہ قرار نہیں پا سکتی، اب ضرور ہے کہ وہ ’ف‘ تفریع کی ہو اور پھونکنے میں اور ان مورتوں کے پرند ہو جانے میں گو کہ در حقیقت کوئی سبب حقیقی یا مجازی یا ذہنی یا خارجی نہ ہو مگر ممکن ہے کہ متکلم نے ان میں ایسا تعلق سمجھا ہو کہ اس کو متفرع اور متفرع علیہ کی صورت میں یا مسبب اور مسبب کی صورت میں بیان کرے جہاں کلم

مجازات کی بحث نحو کی کتابوں میں لکھی ہے اس میں صاف بیان کیا ہے کہ کلام مجازات سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ درحقیقت وہ ایک امر کو دوسرے امر کا حقیقی سبب کر دیتے ہیں بلکہ مستکلم اس طرح پر خیال کرتا ہے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلا امر دوسرے امر کا حقیقی یا خارجی یا ذہنی سبب ہو - مگر صرف اس طرح کے بیان سے امر متفرع یا مسبب کا وقوع ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کسی اور دلیل سے نہ ثابت ہو کہ وہ امر فی الحقیقت وقوع میں بھی آیا تھا - اور جس قدر الفاظ قرآن مجید کے ہیں ان میں یہ بیان نہیں ہوا ہے کہ وہ پرندوں کی مورتیں درحقیقت جاندار اور پرند ہو بھی جاتی تھیں -

حضرت عیسیٰ کے زمانہ طفولیت کے حالات بہت کم لکھے گئے ہیں چاروں انجیلیں جو اس زمانے میں معتبر گئی جاتی ہیں ان میں زمانہ طفولیت کے کچھ بھی حالات نہیں ہیں یہ بات تو ممکن نہیں ہے کہ ان کے زمانہ طفولیت کے کچھ حالات ہوں ہی نہیں مگر کسی کو ان کے لکھنے پر رغبت ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی -

حضرت عیسیٰ کے انتقال کے بہت زمانہ بعد بعض قدیم عیسائی مؤرخوں نے ان کے حالات زمانہ طفولیت کے لکھنے پر کوشش کی ہے اور اس وقت ہم کو دو کتابیں انجیل طفولیت کے نام سے دستیاب ہوئی ہیں جن کو حال کے عیسائیوں نے نا معتمد کتابوں میں داخل کیا ہے بہر حال ان کتابوں کی روایتوں کو بھی بہت لوگ تسلیم کرتے تھے اور لوگوں میں مشہور تھیں ان دونوں کتابوں میں خلق طیر کا قصہ ان معمولی مبالغہ آمیز باتوں اور کرامتوں کے ساتھ جو ایسے بزرگوں کی تاریخ لکھنے میں خواہ مخواہ ملا دی جاتی ہیں لکھا ہوا ہے - یہ دونوں کتابیں انجیل اول طفولیت اور انجیل دوم طفولیت کے نام سے مشہور ہیں -



انجیل اول طفولیت دوسری صدی عیسوی میں ناسنکس کے ہاں عیسائیوں کا ایک فرقہ ہے مروج اور مسلم تھی اور از منہ مابعد میں جو بھی اس کے اکثر بیانات پر اکثر مشہور عیسائی عالم یومیسس واتھا نامیس وایبی فینیس و کرائی ساسم وغیرہ اعتقاد رکھتے تھے۔ کوئیس ڈی کیسٹرڈ ایک انجیل طامسن کا ذکر کرتا ہے کہ ایشیا و افریقہ کے اکثر گرجاؤں میں پڑھی جاتی تھی اور اسی پر لوگوں کے اعتقاد کا دار و مدار تھا فیبریشیس کے نزدیک وہ یہی انجیل ہے۔

انجیل دوم طفولیت اصل یونانی قلمی نسخہ سے ترجمہ کی گئی ہے جو کتب خانہ شاہ فرانس میں دستیاب ہوا تھا۔ یہ طامسن کی طرف منسوب ہے اور ابتداءً انجیل مریم کے شامل خیال کی گئی ہے۔ انجیل اول میں یہ قصہ اس طرح پر لکھا ہے اور جب کہ حضرت عیسیٰ کی عمر سات برس کی تھی وہ ایک روز اپنے ہم عمر رفیقوں کے ساتھ کھیل رہے تھے اور مٹی کی مختلف صورتیں یعنی گدھے بیل، چڑیاں اور اور مورتیں بنا رہے تھے۔

ہر شخص اپنی کاریگری کی تعریف کرتا تھا اور اوروں پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔

تب حضرت عیسیٰ نے لوگوں سے کہا کہ میں ان مورتوں کو جو میں نے بنائی ہیں چلنے کا حکم دوں گا اور وہ فی الفور حرکت کرنے لگیں اور جب انہوں نے ان کو واپس آنے کا حکم دیا تو وہ واپس آئیں۔

انہوں نے پرندوں اور چڑیوں کی مورتیں بنائی تھیں اور جب ان کو اڑنے کا حکم دیا تو وہ اڑنے لگیں اور جب انہوں نے ان کو ٹھہر جانے کا حکم دیا تو وہ ٹھہر گئیں اور اگر وہ ان کو کھانا اور پانی دیتے تھے تو کھاتی پیتی تھیں۔

جب آخر کار لڑکے چلے گئے اور ان باتوں کو اپنے والدین سے

بیان کیا تو ان کے والدین نے کہا کہ بچوں آئندہ اس کی صحبت سے احتراز کرو کیوں کہ وہ جادوگر ہے اس سے بچو اور پرہیز کرو اور اب اس کے ساتھ کبھی نہ کھیلو۔

اور انجیل دوم میں اس طرح پر ہے۔ جب حضرت عیسیٰ کی عمر پانچ برس کی تھی اور مینہ برس کر کھل گیا تھا حضرت عیسیٰ عبرانی لڑکوں کے ساتھ ایک ندی کے کنارے کھیل رہے تھے اور پانی کنارہ کے اوپر بہہ کر چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں ٹھہر رہا تھا۔ مگر اسی وقت پانی صاف اور استعمال کے لائق ہو گیا اور حضرت عیسیٰ نے اپنے حکم سے جھیلوں کو صاف کر دیا اور انہوں نے ان کا کہنا مانا۔ تب انہوں نے ندی کے کنارہ پر سے کچھ نرم مٹی لی اور اس کی بارہ چڑیاں بنائیں اور ان کے ساتھ اور لڑکے بھی کھیل رہے تھے۔

مگر ایک یہودی نے ان کاموں کو دیکھ کر یعنی ان کا سبت کے دن چڑیوں کی مورتیں بنانا دیکھ کر بلا توقف ان کے باپ یوسف سے جا کر اطلاع کی اور کہا کہ دیکھ تیرا لڑکا ندی کے کنارے کھیل رہا ہے اور مٹی لے کر اس کی بارہ چڑیاں بنائی ہیں اور سبت کے دن گناہ کر رہا ہے۔

تب یوسف اس جگہ جہاں حضرت عیسیٰ تھے آیا اور ان کو دیکھا تب بلا کر کہا کیوں تم ایسی بات کرتے ہو جو سبت کے دن کرنا جائز نہیں ہے۔

تب حضرت عیسیٰ نے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیاں بجا کر چڑیوں کو بلایا اور کہا کہ جاؤ اڑ جاؤ اور جب تک تم زندہ رہو مجھے یاد رکھو پس چڑیاں غل بچاتی ہوئی اڑ گئیں۔

یہودی اس کو دیکھ کر متعجب ہوئے اور چلے گئے اور اپنے ہاں کے بڑے بڑے آدمیوں سے جا کر وہ عجیب و غریب

معجزہ بیان کیا جو حضرت عیسیٰ سے اُن کے سامنے ظہور میں آیا تھا۔

مگر جب تاریخانہ تحقیق کی نظر سے اس پر غور کی جاتی ہے تو اصل بات صرف اس قدر تحقیق ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ بچپن میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے میں مٹی کے جانور بناتے تھے اور جیسے کبھی کبھی اب بھی ایسے موقعوں پر بچے کھیلنے میں کہتے ہیں کہ خدا ان میں جان ڈال دے گا وہ بھی کہتے ہوں گے۔ مگر ان دونوں کتابوں کے لکھنے والوں نے اُس کو کراماتی طور پر بیان کیا کہ فی الحقیقت اُن میں جان پڑ جاتی تھی۔ قرآن مجید نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی امر وقوعی نہ تھا بلکہ صرف حضرت مسیح کا خیال زمانہ طفولیت میں بچوں کے ساتھ کھیلنے میں تھا۔ علمائے اسلام ہمیشہ قرآن مجید کے معنی یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کے مطابق اخذ کرنے کے مشتاق تھے اور بلا تحقیق ان روایتوں کی تقلید کرتے تھے انہوں نے ان الفاظ کی اسی طرح تفسیر کی جس طرح غلط سلط عیسائیوں کی روایتوں میں مشہور تھی اور اس پر خیال نہیں کیا کہ خود قرآن مجید اُن روایتوں کی غلطی کی تصحیح کرتا ہے۔

سورہ مائدہ میں بھی یہی مضمون خدا تعالیٰ نے مخاطب کے صیغوں سے دوبارہ بیان فرمایا ہے۔ مگر اس مقام پر ایسی عمدگی سے سیاق کلام واقع ہوا ہے کہ باوجود اس کے کہ اس قصہ کو بعض اوقات متحقق الوقوع کے ساتھ بیان کیا ہے اس پر بھی اس خاص قصہ کا وقوع کہ وہ مٹی کی مورتیں پرند ہو جاتی تھیں ثابت نہیں ہوتا۔ اس سورہ میں خدا تعالیٰ نے تمام واقعات متحقق الوقوع کو ماضی کے صیغوں سے بیان فرمایا ہے جیسے کہ ”اذ اید تک بروح القدس“۔ ”اذ علمتک الکتاب والحکمة“۔ ”اذ کففت بنی اسرائیل عنک

اذ او حیت الی الحوارلین۔“ مگر مٹی کی مورتوں کے پرند ہو جانے کے قصہ کو مستقبل کے صیغہ سے بیان فرمایا ہے جیسے کہ ”اذ تخلق۔“ ”تتفخ۔“ ”تکون۔“ اس سیاق کے بدلنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس مضارع کے صیغہ پر ’اذ‘ کا اثر پہنچے گا وہ تو امر متحقق الوقوع ہو جاوے گا۔ اور جس صیغہ تک اس کا اثر نہ پہنچے گا وہ امر غیر متحقق الوقوع رہے گا۔ اس کلام میں اذ کا اثر ”تخلق، اور ”تتفخ“ تک پہنچتا ہے اور ”تکون“ تک نہیں پہنچتا جیسا کہ ہم بیان کریں گے۔ پس آن مٹی کی مورتوں کا جان دار ہو جانا غیر متحقق الوقوع باقی رہتا ہے یعنی قرآن مجید سے ثابت نہیں ہوتا کہ در حقیقت وہ مٹی کی مورتیں جاندار اور پرند ہو بھی جاتی تھیں۔ اس آیت میں بھی ”فتکون“ پر کی (ف) عاطفہ نہیں ہو سکتی کیوں کہ اگر وہ عاطفہ ہو تو اس کا عطف ”تخلق“ پر ہوگا اور معطوف حکم معطوف علیہ ہوتا ہے اور معطوف علیہ کی جگہ قائم ہو سکتا ہے اور یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ اگر معطوف علیہ کو حذف کر دیا جاوے اور معطوف کو اس کی جگہ رکھ دیا جاوے تو کوئی خرابی اور نقص کلام میں نہ ہونے پاوے اور اس مقام پر ایسا نہیں ہے کیوں کہ اگر معطوف علیہ کو حذف کر کے ”فیکون طیرا“ اس کی جگہ رکھ دیں تو کلام اس طرح پر ہوتا ہے کہ ”اذ کبر نعمتی علیک اذ تکون طیرا“ اور یہ کلام محض مہمل اور غیر مقصود ہے۔ اب ضرور ہے کہ یہ (ف) بھی اسی طرح تفریع کی ہو جس طرح سورہ آل عمران میں (ف) تفریع کی تھی اور اس (ف) کے ذریعہ سے ”تتفخ“ متفرع علیہ اور تکون متفرع دونوں مل کر تخلق پر معطوف ہوں گے اور تقدیر کلام یوں ہوگی ”اذ کبر نعمتی علیک اذ تتفخ فیہا فتکون طیرا“ مگر اس صورت میں ”فتکون طیراً“

صرف ”تسلفخ“ پر تفریع ہوگی اور ”اذ“ کا اثر جو مضارع پر آنے سے تحقیق زمانہ ماضی کا ہے یا اس امر کو متحقق الوقوع کر دینے کا ہے ”تکون“ تک نہیں پہنچتا کیوں کہ وہ اثر اس وقت پہنچتا جب کہ ”تکون“ کی (ف) عاطفہ ہوتی اور اس کا عطف ”تخلق“ پر جائز ہوتا۔ اس صورت میں ”تکون“ کو محض تفریعی تعلق اپنے متفرع علیہ سے ہے اور محض تفریعی حالت اسی طرح باقی رہتی ہے جیسی کہ سورہ آل عمران میں تھی اور اس لیے اس تفریع سے اس امر کا متفرع کا وقوع ثابت نہیں ہوتا۔

اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید سے یہ بات تو ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بچنے کی حالت میں مٹی سے جالوروں کی مورتیں بناتے تھے اور پوچھنے والے سے کہتے تھے کہ میرے پھونکنے سے وہ پرند ہو جاویں گے مگر یہ بات کہ درحقیقت وہ پرند ہو بھی جاتی تھیں نہ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے نہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ پس حضرت عیسیٰؑ کا یہ کہنا ایسا بھی تھا جیسا کہ بچے اپنے کھیلنے میں بمقتضائے عمر اس قسم کی باتیں کیا کرتے ہیں۔

### سوم۔ تائید روح القدس

اس امر کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں فرمایا ہے ”وایدنہا بروح القدس“ اور سورہ مائدہ میں فرمایا ہے ”اذ ایدتک بروح القدس“ یہ آیتیں کچھ زیادہ تفسیر کی محتاج نہیں ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام مؤید بتائید روح القدس ہیں۔ اگر بحث ہو سکتی ہے تو حقیقت روح القدس میں ہو سکتی ہے۔ تمام علمائے اسلام اس کو ایک مخلوق جداگانہ خارج از خلقت انبیاء قرار دے کر اس کو بطور ایلچی

کے خدا و نبی میں واسطہ قرار دیتے ہیں اور جبرئیل اس کا نام بتاتے ہیں۔ ہم بھی جبرئیل اور روح القدس کو شے واحد یقین کرتے ہیں مگر اس کو خارج از خلقت انبیاء مخلوق جداگانہ تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس بات کے قائل ہیں کہ خود انبیاء علیہم السلام کی ملکہ خلقت میں جو نبوت ہے اور جو ذریعہ مبداء فیاض سے ان امور کے اقتباس کا ہے جو نبوت یعنی رسالت سے علاقہ رکھتے ہیں وہی روح القدس ہے اور وہی جبرئیل۔

### چہارم۔ تعلیم کتاب و حکمت

اس امر کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورہ آل عمران میں فرمایا ہے ”ويعلمه الكتاب والحكمة والتوراة والانجيل ورسولا الى بنى اسرائيل“ اور سورہ مائدہ میں فرمایا ہے ”واذ علمتكم الكتاب والحكمة والتوراة والانجيل“ یہ دونوں مضمون واحد ہیں اور ان میں کچھ مشکلات نہیں ہیں کیوں کہ بلاشبہ تمام انبیاء کو خدائے تعالیٰ احکام و حکمت تلقین کرتا ہے اور کتاب پڑھاتا ہے اور ان کے دل میں علم کا وہ خزانہ جمع کرتا ہے جس کو وہ تمام لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

### پنجم۔ خدا کی نشانی لانا

اس امر کی نسبت سورہ آل عمران میں خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی زبان سے یوں فرمایا ہے ”انی قد جئتکم بایة من ربکم“۔ ہم اس بات کی تحقیق سورہ بقرہ میں لکھ چکے ہیں کہ آیت اور آیات اور آیات بینات سے

خدا تعالیٰ کے احکام مراد ہوتے ہیں جو انبیا کو وحی کیے جاتے ہیں۔ پس اس مقام پر بھی ہم آیت کے لفظ کے یہی معنی قرار دیتے ہیں اور آیت سے جنس مراد لیتے ہیں نہ فرد۔ صاحب تفسیر کبیر نے بھی اس سے جنس ہی مراد لی ہے اور کہا ہے کہ ”المراد بالایۃ الجنس لا الفرد“۔

مگر اس مقام کی تفسیر کرنے سے پیش تر ہم کو اس امر کا بیان کرنا چاہیے جو سورہ آل عمران کی آیتوں کے ربط کی نسبت ہے۔ یہ آیت اور اس کے بعد کی آیتیں سورہ آل عمران میں آن آیتوں کے بعد واقع ہوئی ہیں جس میں حضرت عیسیٰ کے ہونے کی بشارت ہے۔ وہ آیتیں رسولا ”الہی بنی اسرائیل“ تک برابر مسلسل چلی آتی ہیں مگر اس کے بعد جو آیت ہے ”انی قد جئتکم بایۃ من ربکم“ اس کا اور نیز اس کے بعد کی آیتوں کا بشارت کی آیات سے جوڑ نہیں ملتا۔ علمائے مفسرین نے اس آیت کو اور نیز اس کے بعد کی آیتوں کو شامل آیات بشارت کے کیا ہے اور جوڑ ملانے کو لفظ ”قائلًا“ محذوف مانا ہے یعنی ”رسولا الہی بنی اسرائیل قائلًا انی قد جئتکم بایۃ“۔ مگر قال کے بعد ”آن“ مفتوحہ آنا کسی قدر اعتراض کے لائق تھا اس لیے زجاج نے اس جگہ اوپر کی آیتوں سے جوڑ لگانے کو ”و یکلّم الناس رسولاً“ مقدر مانا ہے اور یہ معنی قرار دیے ہیں ”و یکلّمہم رسولاً بانی قد جئتکم“۔

مگر ہم کو مفسرین کے ان اقوال سے اختلاف ہے خود سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس قدر آیتیں بشارت سے متعلق تھیں وہ اس مقام پر ختم ہو گئیں جہاں فرمایا ”و رسولاً الہی بنی اسرائیل“ اور وہ کلام منقطع ہو گیا اور ”انی قد جئتکم بایۃ“ سے دوسرا کلام شروع ہوتا ہے اس لیے بشارت کی آیتوں میں تمام صیغے مستقبل

کے آئے ہیں جیسے ”یکام الناس - ویعلمہ الكتاب“ اور ان سب آیتوں میں حالات قبل ولادت حضرت عیسیٰ کے بیان ہوئے ہیں اور اس کے بعد صیغے متکلم کے ہیں جیسے کہ ”انی جئتکم - انی اخلق لکم - و ابری الاکمہ و انبئکم“ اور ان میں وہ تمام حالات مذکور ہیں جو بعد ولادت حضرت عیسیٰ واقع ہوئے ہیں۔ پس ان پچھلی آیتوں کو آیات بشارات کے ساتھ شامل کر دینا بالکل سیاق کلام کے برخلاف ہے۔

صاحب تفسیر ابن عباس نے بھی ان آیتوں کو بشارت کی آیتوں سے منقطع کیا ہے اور تقدیر کلام کی یوں کی ہے۔ ”فلما جاء ہم قال انی قد جئتکم بایة“۔ مگر اس تقدیر میں وہی نقص باقی رہتا ہے کہ ’قال‘ کے بعد ان ’مفتوحہ‘ واقع ہوتا ہے۔ مگر ہم تقدیر کلام کی اس طرح پر کرتے ہیں کہ فلما جاء ہم قال بحیبالہم بانی قد جئتکم بایة“۔۔۔۔۔ یعنی جب حضرت عیسیٰ لوگوں میں وعظ و نصیحت کرنے لگے اور خدا کے احکام سنانے لگے تو ان کی قوم نے کہا کہ تم یہ کیوں کرتے ہو۔ اس کے جواب میں حضرت عیسیٰ نے فرمایا۔ ”انی قد جئتکم بایة من ربکم“۔ یہ تقریر ہم نے اس لئے کی ہے کہ یہ مضمون ”انی قد جئتکم بایة من ربکم“ اور وہ مضمون جو سورہ مریم میں ہے ”قال انی عبد اللہ اتانی الكتاب وجعلنی نبیا“ بالکل متحد ہے اور یہ پچھلا مضمون جواب میں قوم کے سوال کے واقع ہوا ہے اور یہ قرینہ ہے کہ وہ پہلا مضمون بھی قوم کے جواب میں ہے۔

متی کی انجیل میں لکھا ہے کہ جب حضرت مسیح معبد میں وعظ کر رہے تھے نو سردار امام مشائخ ان کے پاس آئے اور پوچھا کہ تو کس حکم سے یہ کام کرتا ہے اور کس نے تجھے یہ حکم



دیا ہے۔ حاصل جواب مسیح یہ ہے کہ جس کے حکم سے یحییٰ غوطہ دینے والا کرتا تھا (متی باب ۲۱ ورس ۴۳، ۴۷)۔  
اب کسی اور تفسیر کی اس مقام پر ضرورت نہیں رہی کیوں کہ جس قدر انبیاء علیہ السلام قوم کی طرف مبعوث ہوتے ہیں وہ خدا کی طرف سے ان کے پاس احکام لاتے ہیں اسی طرح حضرت عیسیٰ بھی بنی اسرائیل کی قوم پر مبعوث ہوئے تھے اور خدا کی طرف سے ان کے لیے احکام لائے تھے۔

### ششم۔ حواریوں کے دل میں ایمان کا ڈالنا

اس کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورۃ مائدہ میں فرمایا ہے۔  
”وَ اِذَا وَحِیْتُ اِلَی الْحَوَارِیِّیْنَ اَنْ اٰمَنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ قَالُوْا اٰمَنَّا وَ اَشْهَدُ بِاٰنٰنَا مُسْلِمُوْنَ“۔ تمام انبیاء پر خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت اس کے حواریوں اور اصحابوں کا پیدا کر دینا ہے۔ وہ اس کام میں مددگار ہوتے ہیں۔ رنج و تکلیف کی حالت میں اُن سے تسلی ہوتی ہے اسی سبب سے خدا نے حضرت عیسیٰ کو حواریوں کا جو بدل و جاں اُن پر فدا تھے ایمان لانا یاد دلایا اور اپنی رحمت اور احسان کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کے لیے کہا کہ ہم نے حواریوں کو کہا کہ میرے رسول پر ایمان لے آؤ یعنی میں نے ہدایت کی اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ ایمان لانا خدا ہی کی ہدایت پر منحصر ہے۔

### ہفتم۔ اندھوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا

اس مضمون کو خدا تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے اس طرح فرمایا ہے کہ ”وَ اِبْرِیْ الْاَكْمَهٗ وَ الْاَبْرَصَ وَ اَحْیِ الْمَوْتِیَّ بِاِذْنِ اللّٰهِ“ اور سورۃ مائدہ میں یوں فرمایا ہے ”وَ تَبْرِیْ الْاَكْمَهٗ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ وَ اِذْ تَخْرِجُ الْمَوْتِیَّ بِاِذْنِیْ“۔

علمائے اسلام کی عادت ہے کہ قرآن مجید کے معنی یہودیوں اور عیسائیوں کی روایتوں کے مطابق بیان کرتے ہیں اس لیے انہوں نے ان آیتوں کے یہی معنی بیان کیے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اندھوں کو آنکھوں والا اور کوڑھیوں کو چنگا کرتے تھے اور مردوں کو جلا دیتے تھے اور صرف تازہ مردوں ہی کو نہیں جلاتے تھے۔ بلکہ ہزاروں برس کے پرانے مردوں کو بھی جلا دیتے تھے چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے سام ابن نوح کو اُن کی قبر میں سے بلایا اور وہ زندہ ہو کر قبر میں سے نکل آئے اور اسی قسم کی اور بہت سی یہودہ روایتیں لکھی ہیں۔

انجیلوں میں بھی اس قسم کے بہت سے معجزے حضرت مسیح کی نسبت بیان ہوئے ہیں مگر نہایت تعجب ہے کہ خود انجیلوں سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ نے جب اُن سے فروسیوں اور صدوقیوں نے آسمانی معجزہ طلب کیا تو انہوں نے معجزے کے ہونے سے انکار کیا (دیکھو انجیل متی باب ۱۲ ورس ۳۸ باب ۱۶ ورس ۴۱ انجیل مارک باب ۸ ورس ۱۲ - انجیل لوقا باب ۱۱ ورس ۲۹) پھر کیوں کر اس قدر معجزے حضرت مسیح کی انجیلوں میں مذکور ہیں اور وہ معجزے بھی اس قسم کے ہیں کہ ان کو من کر تعجب آتا ہے۔ کہیں دیوانے آدمیوں میں سے دیو نکلتے ہیں اور سوروں کے گلہ میں گھس کر اُن کو دریا میں ڈبوئے ہیں۔ کہیں گونگے آدمیوں سے گونگا دیو نکلتا ہے کہیں کپڑا چھونے سے بیمار اچھے ہوتے ہیں اور کہیں صرف یہ کہہ دینا کہ جا تیری مراد پوری ہوئی سخت سے سخت بیماریوں کو اچھا کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

اگر موجودہ انجیلوں پر تاریخانہ تحقیق سے نظر ڈالی جاوے تو اس سے زیادہ سچ اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ یہودی ہمیشہ

جھاڑا پھونکی کی عادت رکھتے تھے۔ بیماروں کے لیے دعائیں پڑھ کر ان کی صحت کے لیے ان پر دم ڈالتے تھے۔ لوگوں کو برکت دیتے تھے لوگ کاہنوں اور اماموں اور مقدس لوگوں کے ہاتھ چومتے، پاؤں کو ہاتھ لگانے، کپڑے کو چھونے یا بوسہ دینے سے برکت لیتے تھے جیسے کہ اب بھی رومن کیتھولک فرقہ میں رواج ہے۔ انہی کی تقلید سے مسلمانوں میں بھی اس قسم کی بہت سی باتیں رائج ہو گئی ہیں۔ اسی دستور کے موافق حضرت عیسیٰ بھی بیماروں کو دعا دیتے تھے۔ ان پر دم ڈالتے تھے برکت دیتے تھے۔ لوگ ان کے ہاتھوں کو برکت لینے کے لئے چومتے تھے۔ قدموں کو ہاتھ لگاتے، کپڑے کو چھوتے تھے یا چومتے تھے۔ پس یہ ایک معمولی بات تھی۔ اس بیان کے ساتھ اس بات کو اضافہ کرنا کہ جو اس طرح کرتا تھا فی الفور چنگا ہو جاتا تھا۔ اندھے آنکھوں والے ہو جاتے تھے اور کوڑھی اچھے ہوتے تھے اسی قسم کی مبالغہ آمیز تحریریں ہیں جیسے کہ ایسے بزرگوں کے حالات لکھنے والے لکھا کرتے ہیں۔ جب کہ ہم یقین کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے معجزہ دکھانے سے انکار کیا تو کہتے ہیں کہ ”صدق کلمۃ اللہ و روح اللہ“ اور جب ان مبالغہ آمیز بندشوں کو پڑھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ”ہذا بہتان عظیم و روح اللہ و کلمۃ اللہ بری عن ذالک“۔

انجیلوں میں صرف دو جگہ مردوں کے زندہ ہونے کا ذکر ہے۔ حاکم کی بیٹی کے زندہ کرنے کے قصہ میں تو خود حضرت مسیح نے فرمایا تھا کہ وہ مری نہیں (متی باب ۹ ورس ۲۴) متی کی انجیل جو اور انجیلوں کی نسبت زیادہ معتبر تصور ہو سکتی ہے۔ اس میں سوائے اس واقع کے اور کسی مرد کے جلانے کا مذکور نہیں ہے۔

اور انجیل لوک میں ایک بیوہ کے بیٹے کے زندہ کرنے کا ذکر ہے جس کا جنازہ لیے جاتے تھے (ورس ۱۱) مگر اس کا کچھ ثبوت نہیں کہ درحقیقت وہ مر گیا تھا۔ بہت سے واقع ایسے گذرے ہیں کہ لوگوں نے ایک شخص کو مردہ سمجھ کر اس کی تجہیز و تکفین کی ہے اور بعد کو معلوم ہوا ہے کہ وہ شخص درحقیقت مر نہیں گیا تھا تعجب ہے کہ تمام انجیلوں میں ان واقعوں کے سوا جو نہایت مشتبہ ہیں اور کوئی واقعہ مردوں کے زندہ کرنے کا بیان نہیں ہوا۔

مسلمانوں کے حال پر اس سے بھی زیادہ افسوس ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیائے سابقین سے افضل سمجھتے ہیں۔ انبیائے سابقین کے معجزے تو قرآن میں بتلاتے ہیں مگر افضل الانبیاء کے ایک معجزہ کا بھی ذکر قرآن مجید میں نہیں دکھاتے بلکہ برخلاف اس کے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے خدا نے فرمایا ہے کہ ”انما انا بشر مثلكم یوحیٰ الی انما السہکم الہ واحد“ اور معجزے ہونے سے بالکل انکار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ”قالوا لولا انزل علیہ آیت من ربہ قل انما الایات عند اللہ وانما انا نذیر مبین اور ایک جگہ فرمایا ”لا املک نفسی نفعا ولاضرا الا ماشاء اللہ ولو كنت لعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء ان انا نذیر و بشیر لقوم یؤمنون اور اسی طرح کی بہت سی آیتیں ہیں۔ پس خود ہمارے سردار نے معجزوں کی نفی کی ہے۔ پھر کس طرح ہم معجزوں کو مان سکتے ہیں۔

ہاں اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ خدا نے انسان میں ایک ایسی قوت رکھی ہے جو دوسرے انسان میں اور دوسرے

انسان کے خیال میں اثر کرتی ہے اور اس سے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں جو نہایت عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں اور جن میں سے بعض کی علت ہم جانتے ہیں اور بہت سوں کی علت نہیں جانتے بلکہ اس کے عامل بھی اس کی علت نہیں جانتے ہیں۔ اسی قوت پر اس زمانہ میں ان علوم کی بنیاد قائم ہوئی ہے جو سسٹمز اور اسپیریٹو ایلزم کے نام سے مشہور اور سابقین بھی اس کے عامل تھے مگر اس علم سے ناواقف تھے یا اس کو مخفی رکھتے تھے مگر جب کہ وہ ایک قوت ہے قوائے انسانی میں سے اور ہر ایک انسان میں بالقوہ موجود ہے جیسے قوت کتابت تو اس کا کسی انسان سے ظاہر ہونا معجزہ میں داخل نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ فطرت انسانی میں سے انسان کی ایک فطرت ہے فافہم و تدبر۔

قرآن مجید میں لفظ ابری اور تبری کا ہے جس کے معنی اچھا کرنے کے بھی ہیں اور بری کرنے کے بھی ہیں۔ یہودی شریعت میں برص دو قسم کی قرار پائی تھی ایک وہ قسم تھی جو اس مرض میں بیمار ہوتا تھا یہودی اس کو ناپاک سمجھتے تھے (سفر لیویان باب ۱۳ ورس ۳، ۸، ۱۲، ۱۵، ۱۶، ۲۰، ۲۵، ۲۷، ۳۱، ۳۶، ۴۴، ۵۲) اور ایک قسم وہ تھی جس کے مریض کو ناپاک نہیں ٹھہراتے تھے (سفر لیویان باب ۱۳ ورس ۶، ۱۴، ۱۷، ۲۳، ۲۸، ۳۵، ۳۷، ۳۹) اور جو لوگ برص سے ناپاک قرار پاتے تھے مطلقاً اور وہ لوگ جو اس مرض سے بری کیے جاتے تھے قربانی ہائے معینہ ادا کرنے کے بغیر معبد میں عبادت کے لیے داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

متی کی انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ سے ایک کوڑھی نے کہا کہ اگر تو چاہے تو مجھے پاک کر سکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ نے اس کو چھوا اس کا کوڑھ جاتا رہا اور

حضرت عیسیٰ نے اُس کو کہا کہ اپنے تئیں امام کو دکھا اور جو نظر موسیٰ نے مقرر کی ہے اُسے دے (باب ۸ ورس ۲۲ م) پاک کرنے کے لفظ سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ اس کو بتا دیں کہ اُن دونوں قسموں کی کوڑھ میں سے کون سی قسم کی کوڑھ اس کو ہے۔

اندھے ، لنگڑے اور چوڑی ناک والے کو یا اس شخص کو جس میں کوئی عضو زائد ہو اور ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے اور کبڑے اور ٹھنکنے اور آنکھ میں پھلی والے کو معبد میں جانے اور معمولی طور پر قربانیاں کرنے کی اجازت نہ تھی (سفر لیویان باب ۲۱ ورس ۱۶ لغایت ۲۴) یہ سب ناپاک اور گنہگار سمجھے جاتے تھے اور عبادت کے لائق یا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کے لائق متصور نہ ہوتے تھے۔

حضرت عیسیٰ نے یہ تمام قیدیں توڑ دی تھیں اور تمام لوگوں کو کوڑھی ہوں یا اندھے ہوں یا لنگڑے چوڑی ناک والے ہوں یا پتلی ناک کے کبڑے ہوں یا سیدھے۔ ٹھنکنے ہوں یا لمبی پھلی والے ہوں یا جالے والے سب کو خدا کی بادشاہت میں داخل ہونے کی منادی کی تھی۔ کسی کو خدا کی رحمت سے محروم نہیں کیا۔ اور کسی کو عبادت کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ سے نہیں روکا۔ پس یہی ان کا کوڑھیوں اور اندھوں کو اچھا کرنا تھا یا ان کو ناپاکی سے بری کرنا۔ جہاں جہاں انجیلوں میں پیاروں کے اچھا کرنے کا ذکر ہے۔ اُس سے یہی مراد ہے اور قرآن مجید میں جو یہ آیتیں ہیں ان کے یہی معنی ہیں۔

انسان کی روحانی موت اس کا کافر ہونا ہے۔ حضرت عیسیٰ خدا کی وحدانیت قائم کرنے اور خدا کے احکام بتانے سے لوگوں کو اُس موت سے زندہ کرتے تھے اور کفر کی موت کے پنبے سے

نکالتے تھے جس کی نسبت خدا نے فرمایا ”و اذ تخرج الموقی یا ذنی“۔

مگر ہم نے جو اس مقام پر موت سے کفر اور حیات سے ایمان مراد لیا ہے اس پر ہم کو کسی قدر بحث کرنی اور یہ ثابت کرنا کہ یہ مراد صحیح ہے ضرور ہے۔

سورۃ نمل میں خدا تعالیٰ نے کافروں پر موت کا اطلاق کیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ ”انک لا تسمع الموقی ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولو مدبرین وما انت بهادی العمی عن ضلالتهم ان تسمع الا من یومن با یا تنافهم مسلمون“ (سورہ نمل)۔

یعنی تو ہرگز سنا نہیں سکتا موتے کو اور نہیں سنا سکتا بحروں کو جب وہ پیٹھ پھیر کر پھریں اور تو اندھوں کو آن کی گمراہی سے راہ پر لانے والا نہیں ہے تو نہیں سنا سکتا مگر اس کو جو ہزری نشانیوں پر ایمان لایا ہے پھر وہ مسلمان ہیں۔“

موتے کے مقابلے میں ’الامن یومن‘ کا لفظ واقع ہوا ہے جو صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ موتے کا لفظ کافروں پر اطلاق کیا گیا ہے۔ مفسرین بھی اس مقام پر کافروں ہی سے مراد لیتے ہیں اور ’موقی‘ اور ’صم‘ اور ’اعمی‘ کے معنی ’کالموتے‘، ’کالصم‘، ’کالعمی‘ بیان کرتے ہیں۔

سورۃ فاطر میں اس سے بھی صاف طرح پر احياء و اموات کا لفظ مومن و کافر پر اطلاق ہوا ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ : ”وما یستوی الا حیاء ولا الا اموات ان الله یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور“ (سورۃ فاطر)۔

یعنی برابر نہیں ہوتے احياء یعنی زندے اور اموات یعنی مردے اللہ تعالیٰ سنا دیتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے اور تو نہیں سنانے والا ہے آن کو جو قبروں میں ہیں۔“

تمام مفسرین اس مقام پر بھی احیاء سے مومن اور اموات سے کافر مراد لیتے ہیں۔ نفسیر کبیر میں لکھا ہے۔ ”ثم قال وما يستوی الاحیاء ولا الاموات مثلاً آخر فی حق المومن و الکافر کانہ قال تعالیٰ حال المومن و الکافر فوق حال الاعمی والبصیر الخ“۔ پس آیت کے صاف معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانوں میں حضرت عیسیٰ کے اُس وقت کو یاد دلایا جب کہ وہ خدا کے حکم سے کافروں کو ایمان والا کرتے تھے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کے لیے نبی ہوئے تھے مگر وہ اور لوگوں کو بھی جو بنی اسرائیل نہ تھے ہدایت کرتے تھے اور ایمان میں لاتے تھے۔ اُسی حال کی نسبت خدا نے فرمایا۔ و اذ تخرج الموتی باذنی“ یعنی ”و اذ تخرج الکافر من کفرہ باذنی“

### نہم اخبار عن الغیب

اس کی نسبت خدا تعالیٰ نے سورہ آل عمران میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے فرمایا ہے کہ ”وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم ان فی ذالک لایۃ لکم ان کنتم مومنین“۔ علمائے مفسرین نے جو اپنی تفسیر میں عجیب و لا یعنی باتوں کا لکھنا اپنا فخر سمجھتے ہیں اس آیت کی بھی تفسیر عجیب و غریب کی ہے وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ چھپنے ہی سے مخفی باتوں کی خبر دے دیا کرتے تھے لڑکوں کو جن کے ساتھ کھیلتے تھے بتا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا ہے اور تمہارے ماں باپ نے فلاں چیز (مثلاً مٹھائی) تم سے چھپا کر رکھ چھوڑی ہے وہ لڑکے گھر میں آکر ماں باپ سے ضد کرتے آخر کو وہ چیز نکلتی تھی اور وہ لے لیتے تھے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ جب مائدہ نازل ہوا تو اُس میں کے کھانے کو جمع کرنے کا حکم نہ تھا مگر لوگ جن پر مائدہ آترا تھا اُس کو جمع کر رکھتے تھے اور



حضرت عیسیٰ بتا دیتے تھے کہ تم نے کیا کھایا ہے اور کیا جمع کیا ہے۔

تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے علما جو نہایت اعلیٰ درجہ کا علم و فضل رکھتے تھے کیوں کر ایسی بیہودہ باتیں لکھ گئے ہیں آیت نہایت صاف ہے اور اس کا مطلب نہایت روشن ہے یہود اور علمائے یہود طرح بہ طرح کے حیلوں اور فریبوں سے ناجائز طور پر لوگوں کا مال مارتے تھے، لوگوں کا مال کھاتے تھے اپنے گھروں میں مال مار مار کر رویہ دولت جمع کرتے تھے جو بالکل حرام و ناواجب تھا خود خدا تعالیٰ نے سورۃ نساء میں یہودیوں کی نسبت فرمایا ہے۔ ”وَ اخذھم الربوا وقد نہو عنہ و اکاھم اموال الناس بالباطل و اعتدنا للکافرین عذاباً الیم“ (۱۵۹) اور سورۃ توبہ میں فرمایا ہے کہ ”یا ایہا الذین آمنوا ان کثیراً من الاحبار والرهبان لیساکلون اموال الناس بالباطل و یصدون عن سبیل اللہ والذین یشکون الذھب والفضۃ ولا ینفقونها فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم“ (۳۴) پس اسی حرام خوری اور حرام کا مال جمع کرنے کی نسبت حضرت عیسیٰ نے فرمایا ہے کہ میں تم کو بتاؤں گا کہ تم کیا کھاتے ہو۔ اور کیا اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو یعنی بتا دوں گا کہ حرام کا مال مارتے ہو اور حرام کی دولت اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو نہ کہ یہ بتا دوں گا کہ تم نے کیا کھایا ہے اور کیا گھر میں رکھا ہے۔ یہ ایسی صاف و صریح آیت ہے جس کی تفسیر خود قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں موجود ہے مگر افسوس ہے کہ علمائے اسلام نے اس کو بھی ایک افسانہ اور خیالی معجزہ کر کے بیان کیا ہے مگر جس کو خدا نے بصیرت دی ہے وہ صاف سمجھتا ہے کہ نہایت صاف و صریح یہ آیت ہے اور اس کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے۔

## دہم - نزول مائدہ

سورہ مائدہ میں ذکر ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ خدا سے دعا کریں کہ آسمان پر سے ان کے لیے کھانا اترے۔ حضرت عیسیٰ نے دعا مانگی۔ خدا نے کہا کہ میں تم پر کھانا اتاروں گا لیکن اگر اس کے بعد کسی نے کفر کیا تو میں اس کو ایسا عذاب دوں گا کہ کسی کو نہ دیا ہوگا۔

ہمارے مفسروں نے ان آیتوں کی تفسیر میں نزول مائدہ کی نسبت بہت سے بے سرو پا قصے اور کہانیاں لکھی ہیں جن میں ایک بھی اعتبار کے لائق نہیں ہے اور نہ قرآن مجید کے لفظوں سے ان قصوں کی تائید ہوتی ہے اور نہ ان کی نسبت کوئی اشارہ پایا جاتا ہے۔

تفسیر کبیر اور تفسیر کشاف اور اسی طرح اور تفسیروں میں بھی یہ روایت لکھی ہے کہ جب حواریوں نے سنا کہ اگر مائدہ اترنے کے بعد کوئی کفر کرے گا تو اس کو سخت عذاب ہوگا تو انہوں نے کہا کہ ہم مائدہ کا اترنا نہیں چاہتے۔ پس کوئی مائدہ نہیں اترا۔ کشاف میں لکھا ہے کہ حضرت حسن بصری نے کہا کہ ”واللہ ما نزلت“ قرآن مجید میں بھی نہیں بیان کیا گیا ہے کہ بعد اس گفتگو کے مائدہ اترا تھا بلکہ اترنے کا ذکر نہ ہونا جس کے ذکر ہونے کا موقع تھا۔ کافی دلیل اس بات پر یقین کرنے کی ہے کہ نزول مائدہ ہرگز وقوع میں نہیں آیا۔

حضرت عیسیٰ کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ بنی اسرائیل میں یہودیت شدت سے پھیلی ہوئی تھی۔ یہودیوں کی عادت تھی کہ انبیا سے اس قسم کی خواہشیں کیا کرتے تھے۔ اٹھترویں زبور سے پایا جاتا ہے کہ جب بنی اسرائیل جنگل میں تھے تو یہ لفظ آنہوں نے بھی کہے تھے کہ ”آیا می شود کہ خدا در بیابان سفر را آمادہ

گرداند“ (زبور ۸۷ ورس ۱۹) اس کے بعد خدا نے اُن پر من و سلویٰ نازل کیا تھا۔ اسی طرح حواریوں نے بھی حضرت عیسیٰ سے کہا ”هل يستطيع ربك ان ينزل علينا مائدة من السماء“ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مائدہ سے ان کی مراد پکا پکایا کھانے سے نہ تھی بلکہ کھانے کی چیزوں کے موجودہ ہونے سے تھی۔

یہ سوال ایک ایسی طبیعت سے نکلا تھا جو یہودیوں کے خیالات سے بھری ہوئی تھی اس کا جواب بلحاظ ان کی طبیعت کے اس سے زیادہ عمدہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا کہ خدا کہتا کہ میں تمہارا سوال پورا کروں گا۔ مگر اس کے بعد جو کوئی گناہ کرے گا تو اس کو سخت عذاب دوں گا۔ یہودی ان مصیبتوں سے واقف تھے جو بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنے اور جنگلوں میں پھرنے کے وقت پڑی تھیں حواریین نے ضرور اس جواب سے خوف کیا ہوگا اور سوال سے باز آئے ہوں گے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا روایت سے پایا جاتا ہے۔ مروجہ انجیلوں میں یہ قصہ مذکور نہیں ہے مگر کوئی شک کرنے کی جگہ نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ کے تمام حالات اور واقعات ان انجیلوں میں مذکور نہیں ہیں۔

### یاز دہم - بنی اسرائیل سے بچانا

اس کا بیان خدا تعالیٰ نے سورہ مائدہ میں اس طرح پر کیا ہے۔ واذ كففت بنی اسرائیل عنك اذا جئتهم بالبینات فقال الذین كفروا منهم ان هذا الا سحر مبین۔

ہمارے مفسرین جو کففت سے یہ معنی نکالتے ہیں کہ خدا نے حضرت عیسیٰ کو یہودیوں کے ہاتھ سے بچایا اور اُن کو زندہ آسمان پر اُٹھا لیا۔ خود اسی آیت سے غلط ثابت ہوتے ہیں کیوں کہ کافر آسمان پر زندہ چلے جانے کو اُسی وقت کھلا ہوا جادو کہتے جب وہ یقین کرتے کہ وہ زندہ آسمان پر چلے گئے حالانکہ وہ لوگ

اس بات کا یقین نہیں رکھتے بلکہ ان کو یقین ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو صلیب پر قتل کیا اور اس تفسیر پر کافروں کا یہ قول ”ان ہذا الا سحر مسبین صحیح نہیں ہو سکتا اور اگر کافروں کے اس قول کو تبلیغ احکام سے منسوب کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ حضرت مسیح کے پر اثر بیان کی نسبت کافروں نے یہ کہا تھا تو پھر ”کسفت“ سے حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھا لینے سے مراد لینے کی جیسے کہ مفسرین نے لی ہے کوئی وجہ نہیں ہے۔

آیت کا صرف مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ خدا کے احکام لے کر بنی اسرائیل کو سمجھانے کو گئے تو انہوں نے حضرت عیسیٰ کو مارنے یا تکلیف دینے کا ارادہ کیا خدا نے اُس سے اُن کو روکا اور حضرت عیسیٰ محفوظ رہے جس کو یا ان کے وعظ کو کافروں نے کہا کہ ”ان ہذا الا سحر مسبین“۔

متی کی انجیل میں بھی اس واقعہ کا نشان پایا جاتا ہے جب کہ حضرت عیسیٰ گدھے پر سوار ہو کر بیت المقدس خدا کے احکام سننے کو گئے اور بہت سے بدعت کے کاموں سے منع کیا اور وہاں کے عالموں کو لاجواب کیا اور متعدد تمثیلیں بیان کیں اور اخیر کو فرمایا کہ ”میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے چھن جائے گی اور ایک قوم کو جو اس کے میوؤں کو لادے دی جاوے گی (بے شک بنی اسماعیل کو) اور جو کوئی اس پتھر پر گرے گا کچل جائے گا اور جس پر یہ گرے گا اُسے پس ڈالے گا۔ جب سردار اماموں اور فروسیوں نے اس کی تمثیلیں سنیں انہوں نے معلوم کیا کہ وہ انہی کے حق میں کہتا ہے تب انہوں نے چاہا کہ اُسے پکڑ لیں پر وہ لوگوں سے ڈرے کیوں کہ وہ اُسے بنی جانتے تھے (باب ۲۱) پس یہی واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور اس آیت کو حضرت عیسیٰ کے زندہ آسمان پر چلے جانے سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔

## دواز دھم - برأت عن المشرکین

اس مضمون کی آیتیں سورہ مائدہ کے آخر میں آئی ہیں اور نہایت عمدہ اور دلچسپ اور دل پر اثر کرنے والی ہیں ان میں حضرت مسیح کے خدا نہ ہونے اور حضرت مسیح کا اپنے تئیں خدا نہ کہنے کا اور جو ان کو خدا کہتے ہیں ان سے بیزار ہونے کا بیان ہے مگر وہ مطلب نہایت فصاحت و بلاغت سے خود حضرت مسیح کی زبان سے ادا کیا گیا ہے اس کے ہر ہر لفظ سے اندرونی تہذیب اور اخلاق شائستگی اور خدائے واحد ذوالجلال کا ادب اور اس کی اعلیٰ قدری اور اس کے سامنے اپنا عجز و انکسار پایا جاتا ہے۔ یہ طرز کلام ایسا عمدہ ہے کہ پڑھنے والوں اور سننے والوں کے دلوں پر نہایت درجہ کا اثر کرتا ہے اور اس کی سچائی لفظوں کے ساتھ دل میں بیٹھتی جاتی ہے۔

اس مقام پر اشارہ ہے کہ عیسائی حضرت عیسیٰ اور ان کی ماں حضرت مریم دونوں کو خدا مانتے تھے یہ عقیدہ رومن کیتھولک چرچ کے پیٹرنوں کا تھا انہوں نے ورجن میری حضرت مریم کو خدا کا درجہ دیا تھا اور خدا کی سی تعظیم و ادب کے قابل ٹھہرایا تھا اور حضرت مسیح سے برتر ان کا رتبہ سمجھتے تھے اور دسویں صدی عیسوی میں حضرت مریم کی خاص پرستش شروع ہو گئی تھی اور روز و شبہ حضرت مریم کی پرستش کا دن قرار پایا تھا اور اسی کی نسبت خدا نے فرمایا ہے کہ ”یا عیسیٰ ابن مریم ءانت قلت للناس اتخذونی و امی الہین من دون اللہ“۔

پس اس سے یہ مطالب نہیں ہے کہ کل عیسائیوں کا حضرت مریم کی نسبت یہ عقیدہ ہے بلکہ حضرت مریم کی نسبت صرف انہی عیسائیوں کے عقیدہ کی طرف اشارہ ہے جن کا وہ عقیدہ تھا۔

# غزوۂ بدر کا واقعہ

## قرآن حکیم میں

جنگ بدر کے واقعہ پر مخالفین اسلام نے بہت کچھ الزام لگائے ہیں جن کی نسبت بالتفصیل ہم بحث کریں گے لیکن اول مختصراً اُس واقعہ کو بلا کسی قابل بحث اشارہ کے لکھتے ہیں اور اس کے بعد اس کی بحث طلب جزئیات کو بیان کریں گے۔

بدر کا محل وقوع : بدر ایک چشمہ کا نام ہے جو وادیٔ صفراء کے اخیر ینبوع کے قریب بحر احمر کے کنارے کے پاس مدینہ سے تین منزل پر واقع ہے۔ اُس چشمہ کے سبب سے وہ مقام مشہور ہو گیا ہے<sup>۱</sup>۔ عرب میں پانی کی نہایت قات ہے اور جہاں کہیں چشمہ ہوتا ہے وہ جگہ مشہور اور نہایت عزیز ہو جاتی ہے۔ آنحضرت کی جس لڑائی کا سورہ انفال میں ذکر ہے وہ اُسی مقام پر ہوئی تھی اور اسی لیے جنگ بدر کے نام سے مشہور ہے۔

قافلہ قریش : شام کے ملک سے قریش کا ایک قافلہ جس میں تیس چالیس آدمی تھے ابی سفیان کے ساتھ بہت سا مال و اسباب لیے ہوئے مکہ کو آتا تھا۔ انہی دنوں مکہ کے قریش نے بہت سے آدمی لڑائی کے لیے جمع کیے اور مکہ سے کوچ کیا۔ انہی دنوں میں

---

۱۔ بدر بالفتح ثم السكون ماء مشہور بین مکة والمدینة اسفل وادی الصفراء بینہ و بین الجار و هو ساحل البحر لیلۃ بہ الواقعہ المشہورۃ بین النبی صلعم و اهل مکة۔ (مرا صد الاطلاع)۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو لڑنے والے لوگوں کے ساتھ مدینہ سے کوچ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقام بدر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ کے قریش سے لڑائی ہوئی۔ یہ واقعہ ۲ ہجری میں واقع ہوا۔

قریش کی پیش قدمی کا سبب : اب چند امور اس میں بحث طلب ہیں۔ اول یہ کہ۔ مکہ کے قریش نے کیوں لڑائی کے لیے لوگ جمع کیے تھے اور کیوں لڑنے کے ارادہ سے نکلے تھے۔ تمام مسلمان مورخ لکھتے ہیں کہ قریش مکہ کو یہ خبر پہنچی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ ابی سفیان والے قافلے کو لوٹنے کا ہے اس لیے انہوں نے اس قافلہ کے بچانے کو لوگ جمع کیے اور لڑائی کے ارادہ سے نکلے۔

اگر یہ روایتیں صحیح مان لی جاویں تو بھی یہ بات لازم نہیں آتی کہ جو خبر ان کو پہنچی تھی وہ صحیح تھی اور درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ اس قافلے کو لوٹنے کا تھا۔ علاوہ اس کے جب کہ قریش مکہ نے بہت سے لڑنے والے آدمی جمع کر کے لڑائی کے ارادہ پر کوچ کیا تھا تو اس بات کا کسی طرح سے یقین نہیں ہو سکتا کہ ان کا ارادہ صرف اسی قافلہ ہی کی حفاظت کا تھا اور خاص مدینہ پر چڑھائی کرنے کا نہ تھا۔ بلکہ دو دلیلیں ایسی صاف ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ ان کا ارادہ اس سے زیادہ تھا۔ اس لیے کہ انہوں نے اس قدر آدمی جمع کیے تھے اور لڑائی کا سامان اور نفیر عام اس طرح پر کی تھی جو قافلہ کی حفاظت کی ضرورت سے بہت زیادہ تھی اور جب کہ وہ قافلہ خدشہ کے مقام سے بچ کر نکل گیا اس وقت بھی انہوں نے کوچ کو اور لڑائی کے ارادہ کو موقوف نہیں کیا اور اگر فرض کیا جاوے کہ ان کا ارادہ اس قافلہ ہی کے بچانے کا تھا تب بھی اہل مدینہ کو کسی طرح

اس بات پر طمانیت نہیں ہو سکتی تھی کہ ان کا ارادہ مدینہ پر حملہ کرنے کا نہیں ہے بلکہ جو عداوت اہل مکہ کو مہاجرین اور مدینہ کے انصار سے تھی اور جس پر حملہ کرنے اور غارت کرنے کی وہ ہمیشہ دھمکی دیتے تھے اور اس کے خواہش مند بھی تھے وہ ایک قومی دلیل اس خیال بلکہ یقین کرنے کی تھی کہ وہ ضرور مدینہ پر بھی حملہ کریں گے۔

دوسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں مدینہ سے بقصد جنگ، کوچ کیا تھا۔ تمام مسلمان مورخوں کا جن کی عادت میں داخل ہے کہ بلا سند روایتوں اور غلط و صحیح افواہوں کو بلا تصحیح و تنقید اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں اور انہی پر بناء وافعات قائم کرتے ہیں یہ قول ہے کہ آنحضرت اور ان کے صحابہ نے یہ بات خیال کر کے کہ ابی سفیان کے ساتھ کے قافلہ میں لوگ بہت تھوڑے ہیں اور مال بہت زیادہ ہے لوٹ لینے کا ارادہ کیا تھا اور اسی وجہ سے کوچ کیا تھا اس کی خبر جب قریش مکہ کو پہنچی تو انہوں نے نفیر عام کی اور قافلہ کے بچانے کو نکلے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قریش کے ساتھ لڑنے اور ان کے قافلہ کو لوٹنے کا قصد اول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور اس کے دفع کرنے کو قریش بقصد لڑائی نکلے۔

کیا مسلمان قافلہ قریش کو لوٹنا چاہتے تھے : ان مسلمان مورخوں کی نادانی اور غلطی سے مخالفین مذہب اسلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی نسبت قافلوں کے لوٹنے کا جو پیغمبر کی شان کے شایاں نہیں ہے اور بلا سبب لڑائی کی ابتداء کرنے کے الزام لگانے کا موقع ہاتھ آیا ہے اور بہت زور شور سے ان الزاموں کو قائم کیا ہے لیکن اس زمانہ کی حالت پر اور جو طریقہ دشمنوں کے ساتھ پیش آنے کا اس زمانہ میں بلا اعتراض کے



مروج تھا اگر اُس پر لحاظ کیا جاوے تو ایسا کرنے میں بھی اگر کیا گیا ہو کوئی مقام اعتراض کا نہیں ہو سکتا اور اگر ہم اس طریقہ تعجب انگیز کا جو حضرت موسیٰ نے اپنے دشمنوں کے ساتھ اختیار کیا تھا اس کے ساتھ مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اگر ایسا کیا گیا بھی ہو تو حضرت موسیٰ کے برتاؤ سے بہت ہی خفیف درجہ رکھتا ہے۔

مگر درحقیقت یہ الزام محض غلط اور بے بنیاد ہیں اور وہ حدیثیں اور روایتیں جن کی بناء پر وہ الزام قائم کیے ہیں ازسرتا پا غلط اور غیر مستند ہیں۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ نہایت صفائی سے مندرج ہے اور اُس میں صاف بیان ہوا ہے کہ کس گروہ کے مقابلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقابلہ کے قصد سے کوچ فرمایا تھا آیا قافلہ لوٹنے کے ارادہ سے یا اُس گروہ کے مقابلہ کے لیے جس کو قریش مکہ نے لڑنے کے ارادے سے جمع کر کے کوچ کیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوچ فرمانا قریش مکہ کے کوچ کرنے کے بعد ہوا تھا یا اُس کے قبل ہوا تھا۔

یہ الزام محض غلط ہے۔ ہم قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کریں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال بھی اُس قافلہ کے لوٹنے کا نہ تھا اور قریش مکہ کے بقصد جنگ فوج کشی کے ساتھ کوچ کرنے کے بعد جس سے ہر طرح مدینہ پر آن کا ارادہ حملہ کرنے کا پایا جاتا تھا اور ادنیٰ درجہ یہ کہ بوجہ قوی احتمال ہوتا تھا مدینہ کی حفاظت کی غرض سے کوچ کیا تھا اور جب کہ قرآن مجید کی آیتوں سے یہ امر ثابت ہوتا ہے تو کوئی روایت یا کوئی حدیث جو اس کے برخلاف ہو اور کسی کتاب میں مندرج ہو اور کسی نے روایت کی ہو عقلاً و نقلاً مردود ہے۔ عقلاً میں نے اس لیے کہا کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں اگر صرف

تاریخانہ اصول پر نظر رکھیں تو بھی وہ اس بات کو تسلیم کریں گے یہ زبانی روایتیں جو ایک زمانہ بعد تحریر میں آئیں قرآن مجید کے مقابلہ میں جب کہ ان دونوں میں اختلاف ہو قابل قبول اور لائق وثوق نہیں ہو سکتیں ۔

سورہ انفال کی پانچویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر یعنی مدینہ ہی میں تھے اور وہاں سے کوچ بھی نہیں کیا تھا کہ آپس میں صحابہ کے اختلاف تھا ۔ بعض تو لڑنے کے لیے نکلنا پسند کرتے تھے اور بعضے ناپسند کرتے تھے جو لوگ لڑنے کے لیے نکلنا ناپسند کرتے تھے اس کی وجہ چھٹی آیت میں بیان ہوئی ہے کہ ”گویا وہ موت کی طرف ہانکے جاتے ہیں اور وہ اپنے مارے جانے کو دیکھتے ہیں“۔

ادنیٰ تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ ابی سفیان کا قافلہ جو شام سے آتا تھا اس میں نہایت قلیل آدمی تھے ان سے لڑنے کے لیے کوچ کرنے میں اور اس کے لوٹنے میں ایسی کوئی خوف کی بات نہ تھی ، بلکہ یہ خوف قریش مکہ کی اس فوج سے تھا جو انہوں نے نفیر عام کے بعد جمع کی تھی اس سے لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قبل اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے کوچ فرماویں قریش مکہ لڑنے کو نکل چکے تھے یا آمادہ جنگ ہو چکے تھے ۔

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ اس آمادگی جنگ کے بعد اور مدینہ سے کوچ کرنے سے قبل بعض صحابہ کی یہ رائے ہوئی کہ شام کے قافلہ کو لوٹ لیا جاوے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مؤرخوں اور راویوں نے اس رائے کو جو بعض صحابہ نے دی تھی غلطی سے اس طرح پر بیان کیا ہے کہ گویا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ قافلہ کو لوٹنے ہی کا تھا اور جو آمادگی جنگ

مدینہ میں ہوئی تھی وہ قافلہ کے لوٹنے کے لیے ہوئی تھی۔  
 زمانہ دراز کے بعد کسی واقعہ کے بیان میں جو افواہی چلا  
 آتا ہو اس قسم کی غلطی کا واقعہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں  
 ہے مگر قرآن مجید سے صاف ظاہر ہے کہ وہ زبانی روایتیں غلط ہیں  
 بلکہ جو آمادگی جنگ کی مدینہ میں ہوئی تھی وہ بمقابلہ قریش مکہ  
 کے ہوئی تھی نہ واسطے لوٹنے قافلہ کے۔

اسی سورہ کی چھٹی آیت میں جو جملہ ”بعد ما تبیین“  
 آیا ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف کر دیا تھا کہ اس لڑائی میں  
 مسلمانوں کو فتح ہوگی۔ اس کے بعد ساتویں آیت میں دو گروہوں  
 کا ذکر ہے۔ ایک وہ گروہ جس کے ساتھ کچھ شان و شوکت  
 یعنی لڑائی کا سامان نہ تھا، اس گروہ سے وہ قافلہ مراد ہے جو  
 شام سے آتا تھا اور جس کے ساتھ صرف تیس چالیس آدمی تھے اور  
 دوسرا گروہ قریش مکہ کا تھا جس کے ساتھ بہت سا لشکر اور بہت  
 کچھ شان و شوکت تھی۔ خدا نے کہا کہ ان دونوں گروہوں  
 میں سے ایک گروہ تمہارے لیے ہے تم اس بے شان و شوکت گروہ  
 کو لینا چاہتے ہو مگر خدا چاہتا ہے کہ جو حق بات ہے یعنی  
 دین اسلام وہ ثابت ہو جاوے اور کافروں کی جڑ کٹ جاوے پس  
 اس آیت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ لڑنے کا حکم قریش مکہ  
 کے مقابلہ کے لیے تھا نہ اس قافلہ کے لوٹنے کے لیے۔

ساتویں آیت سے چھٹی آیت کے مضمون کی بھی زیادہ تشریح  
 ہوتی ہے کہ بعض صحابہ جو لڑائی کے لیے نکلنے کو ناپسند کرتے  
 تھے اور سمجھتے تھے کہ گویا ان کو موت کی طرف ہانکا جاتا  
 ہے اور وہ اپنے مارے جانے کو دیکھ رہے ہیں اس خوف کا  
 سبب یہی تھا کہ ان کو قریش مکہ کے مقابلہ میں نکلنے کا حکم

ہوا تھا جو لشکر کثیر کے ساتھ لڑائی کو نکلا تھا اور جس سے یقین یا احتمال قوی مدینہ پر اور مہاجرین اور انصار پر حملہ کرنے کا تھا نہ اس قافلہ پر حملہ کرنے کا جس کے ساتھ کچھ شان و شوکت یعنی سامان جنگ نہ تھا -

بیان مذکورہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود قرآن مجید سے مندرجہ ذیل امر ثابت ہوتے ہیں -

اول یہ کہ مدینہ ہی میں اور مدینہ سے کوچ کرنے سے پہلے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ قریش مکہ لشکر کثیر کے ساتھ جنگ کے ارادہ سے نکلے ہیں -

دوسرے یہ کہ مدینہ ہی میں خدا نے حکم دے دیا تھا کہ قریش مکہ کے مقابلہ میں لڑنے کو جاؤ اور جن صحابہ نے اس درمیان میں قافلہ لوٹنے کی رائے دی تھی خود خدا تعالیٰ نے مدینہ ہی میں اس کو نامنظور کیا تھا -

اب ہم اگر ان روایتوں پر جو قرآن مجید کے برخلاف نہیں اعتبار کریں تو معلوم ہوتا ہے اور جو واقعات پیش آئے ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ سے جو لوگ لڑنے کو نکلے وہ قریش مکہ کے مقابلہ ان کے حملہ کے دفع کرنے کے لیے نکلے تھے نہ قافلہ لوٹنے کے لیے -

سیرت ہشامی میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے مکہ کی طرف کوچ فرمایا اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کوچ قریش مکہ کے مقابلہ میں تھا نہ شام کے قافلہ پر کیوں کہ وہ قافلہ شام سے آتا تھا جو مدینہ سے جانب شمال واقع ہے اور مکہ جانب جنوب اور شام سے قافلہ کے مکہ میں آنے کا رستہ مدینہ سے جانب غرب پڑتا ہے - پس اگر قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے کوچ کیا جاتا تو مدینہ سے غرب کی جانب کا راستہ اختیار

کیا جاتا نہ جنوب کا۔ ”قال ابن اسحاق فسلک طریقة من المدينة الی مکة“۔ (صفحہ ۳۳۳)

سیرت ہشامی میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے نکل کر نقب المدینہ میں تشریف لائے پھر وہاں سے عقیق میں، وہاں سے ذوالحلیفہ میں، وہاں سے اولات الجیش میں یا ذات الجیش میں وہاں سے تربان میں وہاں سے ملل میں وہاں سے غمیس الحام میں، وہاں سے ضحیرات الیام میں، وہاں سے سیالہ میں، وہاں سے فج الرجاء میں وہاں سے شتوکہ میں اور جب عرق الظبہ میں پہنچے تو وہاں ایک عرب ملا (غالباً مکہ سے آنے والا تھا) اُس سے لوگوں کا حال پوچھا مگر اُس نے کچھ نہیں بتلایا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے چل کر سجسج میں ٹھہرے پھر وہاں سے چلے اور جب منصور میں پہنچے تو بائیں طرف مکہ کا راستہ چھوڑ دیا اور دائیں طرف پھرے اور نازیہ ہو کر بدر جانے کا ارادہ کیا اور رحقان اور وہاں سے مضیق الصفرا میں پہنچے اور بسبس بن عمرالجہنی اور عدی بن الرغباء الجہنی کو ابو سفیان کی اور اور لوگوں کی (یعنی قریش مکہ کی) خبر دریافت کرنے کو روانہ کیا اور مضیق الصفرا کو بائیں طرف چھوڑ کر دائیں طرف چلے اور وادی ذفران میں پہنچے وہاں قریش کے آنے کی خبر ملی۔

ذفران کے مقام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لوگوں سے جن میں انصار بھی شامل تھے قریش کے بڑھے چلے آنے کی خبر کی اور سب کو لڑنے مرنے پر مستعد پایاتب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے ثنایا یعنی اصفار پر گئے اور وہاں سے دبہ میں اترے اور وہاں سے قریب بدر پہنچ کر مقام کیا اور تحقیق خبر ملی کہ قریش مکہ کا لشکر یہاں سے بہت قریب پڑا ہوا ہے انجام کار دونوں لشکروں میں لڑائی ہوئی۔

تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے پہلے شام کا قافلہ جس کے ساتھ ابی سفیان ابن حرب تھا سمندر کے کنارے کنارے ہو کر نکل گیا تھا اور بدر میں نہیں آیا تھا۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ :

فخرج ابوجہل بجمیع اہل مکة و ہم النفیر فی المثل السائر لا فی العیر ولا فی النفر فقیل لہ العیر اخذت طریق الساحل و تحت فارجع الی مکة بالناس فقال لا والله لایکون ذالک ابدا - (تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۳۶۴) -

یعنی جب ابوجہل مکہ سے لوگوں کو لے کر نکلا تو اس سے کہا گیا کہ قافلہ نے سمندر کے کنارہ کا رستہ لیا اور بسلامت چلا گیا۔ اب مکہ کو پھر چلو آس نے کہا کہ خدا کی قسم ایسا نہ ہوگا۔

پس یہ تمام واقعات ثابت کرتے ہیں کہ مدینہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لڑائی کے لیے نکلنا صرف قریش مکہ کے مقابلہ میں اور ان کے حملہ کے دفع کرنے کی غرض سے اور مدینہ کو جہاں مہاجرین نے پناہ لی تھی اور مہاجرین اور انصار کو قریش کے حملہ سے بچانے کے لیے تھا۔ ہر ایک لائق شخص جس کو خدا نے معاملات جنگ کے سمجھنے کی لیاقت دی ہو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اگر حملہ آور قریش مدینہ کی دیواروں تک پہنچ جاتے تو ان کا روکنا اور ان کے حملہ کو دفع کرنا ناممکن تھا۔ مہاجرین کو وہاں گئے ہوئے پورے دو برس بھی نہیں ہوئے تھے مدینہ میں جن لوگوں نے ان کو پناہ دی تھی اور دل و جان سے مہاجرین کے مددگار تھے اور جو انصار کہلاتے تھے ان کی تعداد بھی بمقابلہ آبادی مدینہ اور اس کے گرد و نواح کے کچھ زیادہ نہ تھی پس

جب کہ اہل مدینہ یہ حالت دیکھتے کہ ان لوگوں کے سبب سے مدینہ پر کیا آفت آئی ہے اور غنیم نے ان کو گھیر لیا ہے تو ان سب کی حالت بالکل بدل جاتی اور حملہ آوروں کا حملہ دفع کرنا غیر ممکن ہو جاتا اور اس لیے ضرور تھا کہ مدینہ سے آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کیا جاوے اور جو کچھ خدا کو کرنا منظور ہو وہ مدینہ سے باہر ہو جاوے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے مقابلہ کے لیے مدینہ سے باہر نکلنا اور آگے بڑھ کر ان کو روکنا ضرور سمجھا تھا اب کون شخص ہے جو ان واقعات کو انصاف کی نظر سے دیکھ کر ان کو کسی الزام کی بنیاد قرار دے سکتا ہے۔

بدر کی لڑائی میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی اور دشمنوں کا مال و اسباب ان کے ہاتھ آیا زمانہ جاہلیت میں غنیمت کے مال کا یہ دستور تھا کہ تقسیم ہونے سے پہلے سردار لشکر جو چاہتا تھا پسند کرتا تھا اور ہر وقت تقسیم چوتھ یعنی چہارم حصہ سردار لشکر کو دیا جاتا تھا اور باقی لڑنے والوں اور فتح کرنے والوں میں تقسیم ہوتا تھا اور خاص کسی شخص کے ہاتھ جو مال آتا تھا وہ اس کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ غالباً فتح کرنے والوں میں نسبت کسی مال غنیمت کے اس قسم کا جھگڑا پیدا ہوا کہ کوئی اس کو اپنی خاص ملکیت قرار دیتا تھا اور کوئی اپنی ملکیت اور کوئی مشترک ہونے کا دعویٰ کرتا تھا اور اس وقت تک مسلمانوں کے غنیمت کے مال کی نسبت کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا اس لیے لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے غنیمت کے مال کی نسبت پوچھا۔ اس پر یہ حکم ملا کہ مال غنیمت کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ خدا اور خدا کے رسول کی ملکیت ہے۔ رسول کا نام لینے سے یہ مدعا نہیں ہے کہ رسول کی ذاتی ملکیت ہے بلکہ اس

طرح کے کلام سے صرف خدا ہی کی ملکیت ہونا مزاد ہے خدا کی ملکیت قرار دینے سے یہ مراد ہے کہ کوئی خاص شخص اس پر دعویٰ نہیں کر سکتا بلکہ خدا جس طرح پر حکم دے گا اس طرح پر کیا جاوے گا۔

سورہ انفال کی بیالیسویں آیت میں یہ حکم آیا کہ مال غنیمت میں سے خمس خدا و خدا کے رسول کے لیے ہے یعنی خدا کے لیے ہے جو قرابت مندوں اور غریبوں اور یتیموں اور مسافروں کے فائدے کے لیے رہے گا اور چار خمس ان لوگوں میں جو لڑتے تھے یا لڑائی کے متعلق کاموں میں مصروف تھے تقسیم کیا جاوے گا۔ جو رسم کہ زمانہ جاہلیت میں تھی اس سے یہ حکم تین باتوں میں مختلف تھا۔

اول۔ سردار کی چوتھ موقوف کرنے اور خدا کے لیے خمس نکالنے میں۔

دوم۔ عام طور پر کسی خاص مال پر کسی کا حق نہ ہونے میں۔ سوم۔ جو لوگ عین لڑائی میں موجود تھے اور جو لوگ لڑائی کے متعلق کسی کام پر متعین تھے ان کو بھی مال غنیمت میں سے حصہ ملنے میں۔ یہ تمام احکام اور خصوصاً خمس کا نکالنا ایسے عمدہ احکام ہیں کہ ان سے بہتر اور مفید ترکوئی حکم بھی مال غنیمت کی نسبت نہیں ہو سکتا۔

جنگ بدر میں فرشتوں کی آمد کی حقیقت : لڑائی میں فرشتوں سے مدد کرنے کا مضمون سورہ انفال میں اور آل عمران میں ور سورہ توبہ میں آیا ہے<sup>۱</sup> ان تینوں مقام کے طرز بیان میں کسی

---

۱۔ اذ تقول للمؤمنین ان یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلاثة الاف من الملائكة منزلین - (سورہ آل عمران ۱۲۵)  
 بللی ان تصبرو او تتقوا یا توکم من فورهم هذا یمدکم ربکم بخمسة الاف من الملائكة مسومین - (آیت ۱۲۶ سورہ آل عمران)  
 اذ استغیثون ربکم فاستجاب لکم انی یمدکم بالف من الملائكة مردفین - (آیت ۹ سورہ انفال)۔



قدر تفاوت ہے۔ سورہ آل عمران میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول استفہاماً ہے کہ کیا فرشتوں سے خدا کا مدد کرنا تم کو کافی نہیں ہے۔ اور سورہ انفال میں خدا نے کہا ہے کہ میں فرشتوں سے مدد کروں گا۔ یہ دونوں آیتیں تو بدر کی لڑائی سے علاقہ رکھتی ہیں اور سورہ توبہ میں جو آیت ہے وہ حنین کی لڑائی سے متعلق ہے اس میں فرشتوں کا لفظ نہیں ہے بلکہ ایک ایسے لشکر کے بھیجنے کا ذکر ہے جو دکھائی نہیں دیتا تھا اب اس باب میں چند امور تحقیق طلب ہیں۔

اول یہ کہ در حقیقت لڑنے کے لیے فرشتے آئے تھے یا نہیں۔ فرشتوں کے لڑائی کے لیے آنے سے ابو بکر اصم نے انکار کیا ہے اور جو بحث کہ انہوں نے اس پر کی ہے وہ ہم نے سورہ آل عمران کی تفسیر میں لکھی ہے اب اس جگہ اس امر کی تحقیق کرنی چاہتے ہیں جس کا وعدہ سورہ آل عمران کی تفسیر میں کیا تھا۔

ہمارے نزدیک نہ ان لڑائیوں میں ایسے فرشتے جن کو لوگ ایک مخلوق جداگانہ اور متحیز بالذات مانتے ہیں آئے تھے اور نہ خدا نے ایسے فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا اور نہ قرآن مجید سے ایسے فرشتوں کا آنا یا خدا تعالیٰ کا ایسے فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کرنا پایا جاتا ہے۔ اگر ہم حقیقت ملائکہ کی بحث کو الگ رکھیں اور فرشتوں کو ویسا ہی فرض کر لیں جیسا کہ لوگ مانتے ہیں تو بھی قرآن مجید سے ان کا فی الواقع آنا یا لڑائی میں شریک ہونا ثابت نہیں ہے۔ سورہ آل عمران کی پہلی آیت میں تو صرف استفہام ہے کہ اگر خدا تین ہزار فرشتوں سے مدد کرے تو کیا تم کو کافی نہ ہوگا۔ اور دوسری آیت میں ہے کہ اگر تم لڑائی میں صبر کرو گے تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا مگر ان دونوں آیتوں سے اس کا وقوع یعنی فرشتوں کا آنا کسی

طرح ظاہر نہیں ہوتا۔ سورہ انفال کی آیت میں خدا نے کہا کہ میں تمہاری ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا مگر اس سے بھی فرشتوں کا فی الواقع آنا نہیں پایا جاتا۔ اس پر یہ خیال کرنا کہ اگر مدد موعودہ وقوع میں نہ آئی ہو تو خدا کی نسبت خلف وعدہ کا الزام آنا ہے صحیح نہیں ہے کیوں کہ مدد کی حاجت باقی نہ رہنے سے مدد کا وقوع میں نہ آنا خلف وعدہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کی خدا کی عنایت سے فتح ہو گئی تھی اور فرشتوں کو تکلیف دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ یہ کہنا کہ وہ فتح فرشتوں کے آنے کے سبب سے ہوئی تھی اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اس کے لیے اول قرآن مجید سے فرشتوں کا آنا ثابت کرنا چاہئے اس کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ فرشتوں کے آنے سے فتح ہوئی تھی۔ روایتوں کو فرشتوں کے آنے پر سند لانا کافی نہیں ہے اول تو وہ روایتیں ہی معتبر و قابل اسناد نہیں ہیں۔ دوسرے خود ان کے مضمون ایسے بے سرو پا خیالی ہیں جن سے کسی امر کا ثبوت حاصل نہیں ہو سکتا خصوصاً اس وجہ سے کہ خود راوی فرشتوں کو دیکھتے نہیں تھے۔

بر خلاف اس کے قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ایک فرشتہ بھی نہیں آیا تھا دونوں صورتوں میں اس آیت کے بعد جس میں فرشتوں کے بھیجنے کو کہا ہے یہ آیت ہے ”وَمَا جَعَلَ اللَّهُ إِلَّا بَشَرًا لِّكُم لِّتَطْمِئِنُّ قُلُوبُكُم مَّا النَّصْرَ إِلَّا مِّنْ عِندِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ“ یعنی اور نہیں کیا اس کو اللہ نے مگر خوشبری تمہارے لیے تاکہ مطمئن ہو جاویں اس سے تمہارے دل اور فتح نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا۔ یہ بات غور کے لائق گے کہ ”مَا جَعَلَهُ“ میں جو ضمیر ہے وہ کس کی طرف راجع ہے۔ امام رازی صاحب فرماتے ہیں کہ ضمیر راجع ہے طرف مصدر کے جو کہ گو صریحاً مذکور

تہیں ہے مگر لفظ ”یمد کم“ میں ضمناً داخل ہے یعنی ما جعلہ  
 اللہ المدد والامداد الا بشری اور زجاج کا قول ہے کہ ما  
 جعلہ اللہ ای ذکر المدد الا بشری - مگر امام رازی صاحب نے  
 جو فرمایا ہے وہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا اس لیے کہ خدا نے کہا  
 تھا کہ میں تمہاری فرشتوں سے مدد کروں گا پھر فرمایا کہ وہ یعنی  
 یہ کہنا کہ میں تمہاری فرشتوں سے مدد کروں گا صرف خوشخبری  
 تھی پس اعلانیہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے کہ ”ما جعلہ“  
 کی ضمیر قول امداد یا ذکر امداد کی طرف راجع ہے جیسا کہ زجاج کا  
 قول ہے نہ بطرف مصدر کے جو مذکور بھی نہیں ہے - البتہ اس  
 صریح و صاف مرجع ضمیر کو چھوڑ کر مصدر کی طرف اس صورت میں  
 ضمیر راجع ہو سکتی ہے کہ اول وقوع اس مدد کا یعنی فرشتوں کا آنا  
 ثابت ہو جاوے اور وہ ابھی تک ثابت نہیں ہوا اور اس لیے مصدر  
 کی طرف ضمیر کا راجع کرنا ٹھیک نہیں ہے -

”ما جعلہ“ پر ”مانا فیہ“ ہے جو عام طور پر نفی کرتا ہے  
 اور اس لیے سورہ آل عمران کی آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ  
 نہیں کیا خدا نے پیغمبر کے اس قول کو کہ کیا تمہارے لئے کافی  
 نہیں کہ تمہارا پروردگار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے - کوئی چیز  
 مگر بشارت یعنی صرف بشارت تا کہ تمہارے دل مطمئن ہو جاویں  
 اور سورہ انفال کی آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تم نے خدا  
 سے فریاد کی اور اس نے تمہاری فریاد کو قبول کیا کہ میں  
 فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا تو نہیں کیا خدا نے اس قبول  
 کرنے کو جس کے ساتھ فرشتوں سے مدد دینے کو کہا تھا کوئی  
 چیز مگر بشارت تا کہ تمہارے دل مطمئن ہو جاویں اور یہ طرز کلام  
 قطعاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی ایسا فرشتہ جیسا کہ لوگ  
 خیال کرتے ہیں لڑائی کے میدان میں نہیں آیا تھا -

یہ تمام تقریر اس صورت میں تھی جب کہ ملائکہ کو ایک ایسا وجود خارجی متحیز بالذات تسلیم کیا جاوے جیسے کہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے اور جو مشکلیں ان آیتوں کے معنوں کے حل کرنے میں پیش آتی ہیں اور موضوع روایتوں اور جھوٹے اور بے معنی قصوں سے استدلال کرنے کی احتیاج پڑتی ہے وہ اسی صورت میں ہے پڑتی اگر ٹھیک طور پر قرآن مجید کو سمجھا جاوے اور جو اس کا طرز کلام ہے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جاوے تو کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور خدا اور اس کے کلام کی عظمت و شان اور خدا کی قدرت کاملہ کا سچا اثر انسان کے دل پر پڑتا ہے ۔

فتح کے اتفاق اسباب سے جو بعض اوقات آفات ارضی و سماوی کے دفعۃً ظہور میں آنے سے ہوتے ہیں قطع نظر کر کے دیکھا جاوے کہ ان لوگوں پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے جو فتح پاتے ہیں ان کے قوائے اندرونی جوش میں آتے ہیں ۔ جرأت ، ہمت ، صبر ، شجاعت ، استقلال ، بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور یہی قوی خدا کے فرشتے ہیں جن سے خدا فتح مندوں کو فتح دیتا ہے اور اس کے برخلاف حالت یعنی بزدلی اور رعب ان لوگوں پر طاری ہوتا ہے جن کی شکست ہوتی ہے ۔ پس ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ میں فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا مگر وہ بجز خوشخبری فتح کے اور کچھ نہیں ہے جس کے سبب تم میں ایسے قوی برانگیختہ ہوں گے جو فتح کے باعث ہوں گے ۔ تمہارے دل قوی ہو جاویں گے لڑائی میں تم ثابت قدم رہو گے ۔ جرأت ، ہمت شجاعت کا جوش تم میں پیدا ہوگا اور دشمنوں پر فتح پاؤ گے ۔

یہ معنی ان آیتوں کے ہم نے پیدا نہیں کیے ہیں بلکہ خود خدا نے یہی تفسیر اپنے کلام کی کی ہے جہاں اسی سورہ میں اور اسی واقعہ کی نسبت فرمایا ہے کہ ”اذ یوحی ربک الی الملائکہ

انی معکم فثبتوا الذین امنوا سالتی فی قلوب الذین کفروا العرب ” یعنی جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی بھیجتا تھا (یہ وہی فرشتے ہیں جن کے بھیجنے کا مدد کے لیے وعدہ کیا تھا) کہ میں تمہارے (یعنی مسلمانوں کے) ساتھ ہوں (تو ان فرشتوں سے یہ کام لینے چاہے تھے) کہ ثابت قدم رکھو ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں میں بہت جلد ان لوگوں کے دلوں میں جو کافر ہیں رعب ڈالوں گا۔

لڑائی میں ثابت قدم رکھنے والی کون چیز تھی وہی ان کی جرأت و ہمت تھی کوئی اور شخص ان کے پاس کھڑے ہوئے ان کو شاباش شاباش نہیں کہہ رہے تھے پس صاف ظاہر ہے کہ فرشتوں سے مراد وہی قوائے انسانی تھے جن کے پاس وحی بھیجی تھی اور جو لڑنے والوں میں بھی موجود تھے اور فرشتوں سے ان کی مدد کرنے سے ان کو لڑائی میں ثابت قدم رکھنا شجاعت، جرأت، ہمت، استقلال کو قائم رکھنا مراد تھا۔ نہ خیالی فرشتوں کو سپاہی بنا کر اور ڈھال تلوار، تیر کمان دے کر اور سفید سفید گھوڑوں پر سوار کر کے بھیجنا۔

قرآن مجید کا سیاق کلام ہی یہ ہے کہ اس میں ایسے مواقع میں جو خوف و خطر کے ہوتے ہیں انسانوں کے دلوں میں طمانیت اور قوت بخشنے کو فرشتوں سے مدد کرنے اور اپنے غیبی لشکروں سے امداد کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس سے مقصود صرف دل میں طمانیت و سکینہ کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور پہاڑ کے ایک غار میں جا کر چھپے جہاں نہ لشکر تھا نہ لڑائی۔ خدا نے فرمایا ”الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ اذا خرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذا ہما فی الغار اذا یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنما فانزل اللہ

السکينة عليه دایده بجنود الم تروها وجعل كلمة الذين  
كفروا السفلى و كلمة الله هي العليا و الله عزيز  
حكيم۔“

وہاں غار میں گوٹوں سی فوج تھی اور کون سی لڑائی تھی،  
جو خدا نے اپنا غیبی لشکر بھیجا تھا بلکہ لشکر سے صرف سکینہ  
مراد تھی۔ اس آیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور یہ کہنا کہ پہلا  
حملہ تو واقعہ غار سے متعلق ہے اور دوسرا ٹکڑا جہاں لشکر کے  
آنے کا ذکر ہے جنگ احد یا جنگ بدر یا جنگ احزاب سے متعلق ہے  
جیسا کہ بعض مفسروں نے کہا ہے ایک ایسا لغو کلام ہے جو  
التفات کے قابل نہیں ہے اور خدا کے کلام کے ساتھ ایک قسم کی  
بے ادبی ہے کہ اپنی مرضی کے موافق جہاں سے چاہا توڑا اور جہاں  
چاہا جا جوڑا۔

اسی طرح خدا تعالیٰ نے سورۃ توبہ میں فرمایا ”ثم انزل الله  
سکینته علی رسولہ و علی المومنین و انزل جنود الم تروها  
و عذب الذین کفروا ذالک جزاء الکافرین“۔ سکینہ کی  
تفصیل ”جنود الم تروها“ واقع ہوئی ہے اور آن دونوں سے  
مراد صرف سکینہ ہے نہ اور کچھ۔

اسی مضمون کی آیت سورۃ احزاب میں ہے جہاں خدا نے  
فرمایا ہے۔ یا ایہا الذین امنوا ذکرُوا نعمة الله علیکم  
اذ جاء تکم جنودا فارسنا علیهم ریحاً و جنود الم  
تروها و کان الله بما تعملون بصیراً۔“

اس سے بھی عمدہ طریقہ پر اس مضمون کو سورۃ فتح میں  
بیان کیا ہے جہاں فرمایا ہے ”هو الذی انزل السکينة فی قلوب  
المومنین لیزدادوا ایمانا مع ایمانهم و الله جنود السموات  
والارض و کان الله عزیزاً حکیماً“۔ اسی انزال سکینہ کو خدا نے

اپنے لشکروں سے تعبیر کیا ہے۔ پس بدر کی لڑائی میں بھی نہ جنگ جو مجسم و متحیز بالذات فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا نہ ایسے فرشتے بھیجے تھے بلکہ صرف مسلمانوں کے دلوں کو اور ان کے قوائے جنگ کو صرف خوش خبری فتح سے تقویت دینے کا وعدہ تھا جس کو خدا نے پورا کیا اور قلیل جماعت کو کثیر جماعت پر فتح دی۔

اہل عرب زمانہ جاہلیت میں بہت سے قوائے غیر مرئیہ کو مربی انسان اور دنیا میں کارکن سمجھتے تھے ملائکہ کو بھی وہ ایک قوت غیر مرئیہ جانتے تھے اور گو وہ اس بات کے قائل تھے کہ ان میں مجسم و مرئی ہو جانے کی بھی طاقت ہے مگر یہ نہیں تھا کہ ملائکہ کا مفہوم بغیر اس کے کہ وہ ان کو مجسم و مرئی سمجھیں ان کے ذہن میں نہیں آتا تھا۔ انہی آیتوں میں جہاں خدا تعالیٰ نے لفظ ”جنود السم تروہا“ کا استعمال کیا ہے اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ اُس زمانہ کے قوائے عرب غیر مرئیہ کو کارکن سمجھتے تھے پس یہ کہنا کہ جو معنی آیت کے ہم نے بیان کیے ہیں (اگرچہ ایسا کہنا ہم پر تہمت ہے کیوں کہ ہم نے نہیں بیان کیے بلکہ خود خدا نے بیان کیے ہیں) وہ معنی نہ اُس زمانہ کے عرب جاہلیت سمجھتے تھے نہ صحابہ کرام محض غلط ہے اُس زمانہ کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بغیر کسی فرضی شکل و صورت کے ان کے ذہن میں فرشتوں کا خیال ہی نہیں آ سکتا۔ مگر عرب جاہلیت کا ایسا خیال نہ تھا بے شک فرشتوں میں وہ مجسم ہونے و مختلف صورتوں میں ظاہر ہونے کی طاقت سمجھتے تھے مگر بلا خیال شکل و صورت و تحیز کے بھی ان کے ذہن میں فرشتوں کا خیال تھا جس کو ہم نے بلفظ قوی تعبیر کیا ہے۔ گو اس زمانہ کے مسلمان آیت کے معنی سمجھنے کے قابل نہ ہوں مگر اس زمانہ کے عرب بلا شبہ اس قابل تھے۔

جذنگ بدر میں کتنے فرشتے آترے تھے : اب باقی رہی بحث نسبت عدد ملائکہ کے ۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ایسے مقامات میں عدد کے ذکر کرنے سے خاص عدد معین مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس امر کا مکمل ہونا جس کی نسبت عدد کا بیان ہوا ہے مقصود ہوتا ہے علاوہ اس کے عددوں کا بیان مختلف مواقع پر ہوا ہے جس کے سبب کچھ اختلاف آیتوں میں نہیں ہے ۔ اسی سورہ کی چوتھی آیت کی تفسیر میں ہم نے بیان کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے اور قریش مکہ کے مقابلہ میں نکلنے کا ارادہ تھا تو ایک گروہ مسلمانوں کا بسبب کثرت مخالفین کے خائف تھا اور وہ ان کے مقابلے میں لڑنے کو جانا ناپسند کرتا تھا ۔ اُس وقت مسلمانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ”لن یفیککم ان یمدکم ربکم بثلاثة الالف من الملائكة منزلین بلی ان تصبروا و تتقوا و یاتوکم من فورهم ہذا یمدد ربکم بخمسة الالف من الملائكة مسومین“ (سورہ اعراف آیت ، ۱۲۰ و ۱۲۱) یعنی کیا تم کو قریش مکہ کے مقابلہ کے لیے یہ بھی کافی نہ ہوگا کہ خدا تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا ۔ بلکہ اگر تم لڑائی میں صبر کرو اور خدا سے ڈرو اور وہ ابھی تم پر آن پڑیں تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا پس رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا صرف اُن لوگوں کی طمانیت اور جرأت بڑھانے کے لیے تھا اور اُس سے کسی عدد خاص کا تعین مقصود نہ تھا ۔

مگر جب مسلمان بمقابلہ قریش مکہ بدر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش مکہ کے لشکر میں ہزار آدمی لڑنے والے ہیں جن کے مقابلہ کے لیے ہزار فرشتوں سے مدد دینے کی بشارت دینا کافی تھا اس لیے پروردگار نے فرمایا ”انی یمدکم بالالف من الملائكة مرد



فین“ اور اسی کے ساتھ بتلا دیا کہ یہ کہنا یا وعدہ کرنا صرف فتح کی خوش خبری ہے تاکہ تمہارے دل مطمئن ہو جاویں نہ یہ کہ ہزار فرشتے سپاہی بن کر تمہارے ساتھ لڑنے کو آویں گے۔ نتیجہ اس سب کا یہ نکلا کہ میں تمہارے دلوں کو ہزار آدمی کے لشکر کے برابر تقویت اور جرأت دے دوں گا جس کے سبب تم ان کا مقابلہ کر سکو گے۔

(اذا يغشاكم النعاس امنة منه) ہم نے سورہ آل عمران کی تفسیر میں نسبت ”نعاس“ کی کافی بحث کی ہے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مقام پر باقی آیت کی نسبت ہم کو تفسیر لکھنی ہے۔

جنگ بدر میں نزولِ ماء اور تطہیر کی بحث: خدا نے فرمایا ہے ”وینزل علیکم من السماء ماء لیطہرکم بہ و یذهب عنکم رجز الشیطان“ ہمارے مفسروں نے ان سیدھے و صاف لفظوں کی ایسی ناپاک تفسیر کی ہے جس سے تعجب ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام لشکر سو گیا تھا اور شیطان سب کے پاس آیا اور سب کو احتلام ہو گیا۔ اس لیے خدا نے سینہ برسایا تاکہ نہا دھو کر جنابت سے پاک ہو جاویں۔

مگر یہ تمام باتیں محض لغو و خرافات ہیں اور قرآن مجید میں ایسا ناپاک مضمون نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً مدینہ سے مکہ کی طرف کوچ کیا اور اثنائے راہ میں سے جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں مکہ کے رستہ کو چھوڑ کر بدر کی جانب پھرے۔ اس میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا کہ اس قدر منزلیں طے کرنے میں تمام لوگ گرد آلودہ تھے ان کے کپڑے میلے کچیلے ہو گئے تھے اور رستہ میں پانی کی بے انتہا تکلیف اٹھائی تھی۔ بدر میں ان کو کافی پانی کے ملنے کی توقع

تھی مگر جب وہ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ پانی کے چشمہ پر قریش مکہ نے قبضہ کر لیا ہے ایسی حالت میں جس قدر پریشانی اور ناامیدی مسلمانوں کو ہوئی ہوگی اس کا اندازہ ہر شخص جو کسی قدر سمجھ رکھتا ہے کر سکتا ہے۔ بلاشبہ وہ نہایت مضطر ہوئے ہوں گے جیسے کہ ”اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم“ سے ظاہر ہوتا ہے اور اگرچہ ان کو مدینہ سے کوچ کرتے وقت فتح کی بشارت مل چکی تھی مگر ان کے دل میں شیطانی وسوسہ آیا کہ ایسی حالت میں کہ پانی پینے کو بھی میسر نہیں اور دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے فتح ہونا ناممکن ہے۔ ایسی تنگ حالت میں خدا نے سینہ برسایا تاکہ وہ نہا دھو کر میل کچیل سے پاک ہو جائیں اور جو وسوسہ فتح نہ ہونے کا پانی نہ ملنے کے سبب سے شیطان نے ان کے دلوں میں ڈالا تھا وہ دور ہو جاوے۔ ”پانی پی کر تروتازہ ہوں ان کے دل مضبوط ہو جاویں اور لڑائی میں ثابت قدم رہیں۔ ایسی میدھی و صاف آیت کو جو بالکل واقعات کے مطابق ہے ہمارے مفسرین نے ایسے ناپاک طریقہ پر اسے محمول کیا ہے کہ بجز اس کے کہ خدا ان کو معاف کرے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا وہ بزرگ یہ بھی نہیں سمجھے کہ اگر طہارت سے طہارت شرعی مراد تھی تو اس کے لیے پانی ہی کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے لیے تو تیمم ہی کافی تھا اور یہ کہنا کہ گو تیمم شرعی طہارت ہے مگر بغیر نہائے انسان کے دل میں نجاست کا خیال رہتا ہے ان لوگوں کا کام ہے جن کو احکام شرعی پر پورا ایمان نہیں ہے نہ صحابہ کا۔

مگر کہ بدر میں ما رمیت اذ رمیت کی حقیقت : بدر کی لڑائی میں جب مسلمانوں کی باوجود جماعت قلیل ہونے کے فتح ہوئی اور دشمن مارے گئے تو اللہ تعالیٰ نے تمام مجاہدین کو

مخاطب کر کے فرمایا کہ تم نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے ان کو قتل کیا - پھر خاص پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تو نے دشمنوں کو تیر نہیں مارے بلکہ خدا نے مارے جس طرح خدا تعالیٰ ہر ایک فعل کو جو کسی ظاہری سبب سے ہو یہ سبب علۃ العلل ہونے کے اپنی طرف منسوب کرتا ہے اسی طرح اس مقام پر بھی مجاہدین کے افعال اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے - جیسے کہ اس سے پہلے فرمایا تھا ”وما النصر الا من عند اللہ“۔

اس آیت میں تمام مفسرین نے ”رمی“ سے باوجودیکہ سیاق کلام اور مقتضائے مقام سے علانیہ تیر مارنا سمجھا جاتا ہے تیر مارنا مراد نہیں لیا ہے بلکہ ایک روایت کی بنیاد پر جس کو خود ”قیل“ کر کے بیان کیا ہے جو خود دلیل اس کے غیر معتبر یا ضعیف و غیر ثابت ہونے کی ہے یہ لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی خاک کی دشمنوں کے لشکر کی طرف پھینکی اور خدا کی قدرت سے اس کو اس قدر وسعت ہوئی کہ دشمنوں کے لشکر کے ہر ایک شخص کی آنکھ تک جا پہنچی وہ تو آنکھیں ملنے لگے اور مسلمانوں نے ان کو مار کر قیمہ کر دیا اور مسلمانوں کو فتح ہو گئی - یہ طریقہ تفسیر کا اسی عجائب پسندی پر مبنی ہے جو ہمارے مفسرین نے بہ تقلید یہود مذہب اسلام میں جو نہایت سیدھا اور صاف ہے اختیار کیا ہے ہر ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ لڑائی کے موقع کا بیان ہے اس زمانہ کے عرب تلوار و تیر کمان اور برچھی سے لڑتے تھے یہی ان کے ہتھیار تھے پھر ”رمی“ سے تیر اندازی کے معنی چھوڑ کر مٹھی بھر خاک پھینکنے کے معنی لینے کس طرح پر درست ہو سکتے ہیں - بعض مفسرین نے ”رمی“ سے مٹھی بھر خاک پھینکنا مراد نہیں لیا بلکہ تیر کا ہی مارنا مراد لیا ہے مگر

کہتے ہیں کہ یہ آیت بدر کی لڑائی سے متعلق نہیں ہے بلکہ خیبر کی لڑائی سے متعلق ہے ' اس لڑائی میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کمان میں تیر جوڑ کر مارا تھا جو ابن ابی حقیق کو جا لگا اور وہ مر گیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ”ما رمیت و اذ رمیت ولكن الله رمى“ مگر ان حضرات سے پوچھنا چاہیے کہ جو آیت خاص بدر کی لڑائی کے قصہ میں نازل ہوئی ہے اس کو توڑ کر خیبر کی لڑائی کے قصہ میں لے جانے کی کیا ضرورت ہے اور بدر کی لڑائی میں ”رمی“ سے ”رمی السهم“ مراد لینے کی کیا قباحت ہے ۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو بدر ہی کی لڑائی سے متعلق رکھا ہے اور ”رمی“ سے مٹھی بھر خاک پھینکنا مراد نہیں لیا بلکہ ہتھیار چلانا مراد لیا ہے اور ابن ابن خلف کے قتل سے متعلق کیا ہے اور کہا ہے کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آیا تو ”رماہ بحرہ فکسر ضلعاعہ من اضلاعہ فحمل فمات ببعض الطريق فی ذالک نزلت الایۃ“ (تفسیر کبیر) ۔

غرض کہ مٹھی بھر خاک کی روایت غیر صحیح و موضوع ہے اور بعض مفسرین بھی اس کو صحیح نہیں سمجھتے ۔ صاف صاف معنی آیت کے یہی ہیں کہ اس لڑائی میں مسلمان کافروں سے لڑ رہے تھے اور ان کو قتل کیا تھا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی بذات خاص لڑائی میں شریک تھے اور تیر و کمان سے کافروں کا مقابلہ فرماتے تھے جس سے سبب خدا نے فتح دی اور مسلمانوں سے فرمایا ”فلم تقتلوهم ولكن الله قتلهم“ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ”وما رمیت اذ رمیت ولكن الله رمى“ ۔

---

۱۔ قال بعضهم انه انزلت يوم خیبر روى انه عليه السلام اخذ قوسا وهو على باب خیبر فرمى سهمًا فاقتبل السهم حتى قتل ابن ابی الحقیق وهو على فیرسه فنزلت ”وما رمیت اذ رمیت و لكن الله رمى“ ۔ (تفسیر کبیر جلد ۳ ص ۳۷۱)

جنگ بدر میں پتھروں کی بارش کا مطلب جنگ : بدن کے سلسے میں خدا نے جو یہ فرمایا ”فما مطر علينا حجارة من السماء“ ان سے بالتخصص آسمان سے پتھر برسانا مراد نہیں ہے بلکہ عموماً عذاب آسمانی یا آفت و مصیبت مراد ہے ”امطر“ کا استعمال عذاب کے معنوں میں ہوتا ہے قال صاحب الکشاف ”وقد کثر الامطار فی معنی العذاب“ اور ”امطار الحجارة اور رمی بالحجارة“ دونوں کا ایک مقصد ہے اور اس سے واہیہ عظیمہ کا واقع ہونا مراد ہوتا ہے بس قریش مکہ کا جو قول اس آیت میں منقول ہے اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اے خدا اگر قرآن سچ ہے اور تیرے پاس سے آیا ہے تو ہم پر کوئی آسمانی عذاب نازل کر یا کوئی اور سخت عذاب بھیج اور ان الفاظ سے ان کا مطلب قرآن کے حق ہونے سے انکار کرنے کا تھا ۔

ما کان اللہ لیعذبہم کی تفسیر : جنگ بدر کے سلسلے میں سورہ انفال میں جو یہ الفاظ ہیں کہ ”وما کان اللہ لیعذبہم و انت فیہم“ اس میں عذاب کو کسی خاص قسم کے عذاب سے مقید اور مخصوص نہیں کیا اس لیے اس بات پر غور کرنی ضرور ہے کہ اس عذاب سے کس قسم کا عذاب مراد ہے اگلی اور پچھلی تمام آیتوں پر غور کرنے سے اور خصوصاً آتیسویں آیت پر لحاظ کرنے سے جس میں ایک فیصلہ کرنے والی فتح کی بشارت دی گئی ہے اور چالیسویں آیت پر لحاظ کرنے سے جس میں قریش مکہ سے لڑنے اور ان کے قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور چونتیسویں آیت پر غور کرنے سے جس میں قریش مکہ کو عذاب دینے کی وجہ بیان کی ہے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں عذاب سے لڑائی میں شکست ہانے اور مارے جانے کا عذاب مراد ہے اور اس مطلب کو الفاظ ”و انت فیہم“ زیادہ تر روشن کر دیتے ہیں کیوں کہ

جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تشریف رکھتے تھے تو قریش سے جو مکہ کے حاکم تھے لڑنا اور اُن کو قتل کرنا ناواجب تھا مگر جب وہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور مسلمانوں نے ہجرت کر لی تو اب اُن سے لڑنا اور اُن کو قتل کرنا ناواجب نہیں رہا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے اس آیت کے بعد کی آیت میں فرمایا کہ ”وَاللّٰهُمَّ اِلٰہِیْہِمْ یُعَذِّبُہُمْ اللّٰہُ وَہُمْ یَصْدُرُوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ“ یعنی اب اُن کے لیے کیا ہے کہ اللہ اُن کو عذاب دے اور وہ روکتے رہیں۔ (مسلمانوں کو) مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ میں آنے سے۔

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ قریش مکہ کا مسجد حرام میں آنے سے روکنا اُن کے عذاب کا سبب تھا۔ پس وہ عذاب بجز اُس کے کہ لڑائی میں شکست پانے کا عذاب ہو اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

علاوہ اس کے قرآن مجید میں لڑائی میں قتل ہونے کو علانیہ اور بالتصریح عذاب سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ سورۃ توبہ میں فرمایا ہے : قَاتِلُوْہُمْ یُعَذِّبُہُمْ اللّٰہُ بَاِیْدِیْکُمْ وَ یَخْزِیْہُمْ وَ یَنْصُرْکُمْ عَلَیْہِمْ وَ یُشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ (سورۃ توبہ آیت ۱۴)۔ یعنی مارو اُن کو عذاب دے گا اُن کو اللہ تمہارے ہاتھوں سے اور خوار کرے گا ان کو اور مدد کرے گا تمہاری اور چین دے گا دلوں کو ایمان والوں کی ایک قوم کے۔

مفسرین نے بھی اس عذاب سے لڑائی میں شکست پانے اور قید و قتل ہونے کا عذاب مراد لیا ہے چنانچہ تفسیر کبیر میں

۱۔ ثم بین تعالیٰ ما لا جلہ یُعَذِّبُہُمْ فقال وہم یصدون عن المسجد الحرام - (تفسیر کبیر)

لکھا ہے<sup>۱</sup> کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے کہ اُن کو عذاب نہ دے گا جب تک کہ خدا کا رسول اُن میں ہے اس آیت میں فرمایا کہ اُن کو عذاب دے گا کہ اب خدا کا رسول اُن میں سے نکل آیا ہے پھر علماء نے اس عذاب میں اختلاف کیا ہے بعضوں نے کہا کہ بدر کی لڑائی میں وہ عذاب اُن کو ملا اور بعضوں نے کہا کہ مکہ کی فتح کے دن - غرض کہ اُن علماء نے عذاب سے لڑائی میں شکست پانے کا عذاب مراد لیا ہے -

اب اس آیت کے ان لفظوں پر ”وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ“ غور باقی رہ گئی ہے - تفسیر کشاف میں لکھا ہے<sup>۲</sup> ”وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ“ سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ استغفار کرتے ہیں بلکہ اس سے نفی استغفار مراد ہے - پس ان لفظوں کے معنی یہ ہیں - در حالیکہ وہ استغفار کرتے تو خدا اُن کو عذاب نہ کرتا مگر وہ استغفار نہیں کرتے اس لیے اُن کو خدا عذاب دے گا - ہم سمجھتے ہیں کہ تمام علماء صاحب کشاف کو علم ادب کا بہت بڑا عالم سمجھتے اور جو معنی اُنہوں نے بیان کیے ہیں اُس کو سب تسلیم کریں گے -

۱- قال ابن عباس - وما لهم ان لا يعذبهم الله و اعلم انه تعالى بين في الآية الاولى ان لا يعذبهم مادام رسول الله فيهم ذكر في هذه الآية انه لا يعذبهم اذ اخرج الرسول من بينهم - ثم اختلفوا في هذا العذاب فقال بعضهم الحقهم عذاب المتوعد به يوم بدر وقيل بل يوم فتح مكة - (تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۳۸۰)

۲- هم يستغفرون في المواضع المحال ومعناه نفى الاستغفار عنهم اى لو كانوا ممن يؤمن ويستغفر من الكفر كما عذبهم لقوله وما كان ربك ليهلك القرى بظلمها واصلاحون ولكنهم لا يؤمنون ولا يستغفرون ولا يتوقع ذالك منهم - (تفسیر کشاف صفحہ ۵۱۲)

جنگ بدر کا موقع : جنگ بدر کے سلسلے میں خدا نے جو یہ فرمایا ہے کہ ” اذ انتم بالعدوة الدنيا وهم بالعدوة القصوى والركب أسفل منكم ولو تواعدتم لاختلفتم في الميعاد ولكن ليقضي الله امراً كان مفعولاً“۔

یعنی جس وقت کہ تم تھے ورلے کنارہ پر اور وہ تھے پرلے کنارہ پر اور قافلہ تھا تم سے نیچے (یعنی سمندر کے کنارہ پر) اور اگر تم (اس مقام پر لڑنے کا) وعدہ کر لیتے تو البتہ تم وعدہ خلافی کرتے و لیکن (یہ اس لیے ہوا) تاکہ پورا کر دے اللہ اس کام کو جو کرتے کو تھا ۔

اس آیت میں نہایت صفائی سے خدا تعالیٰ نے ان مقامات کا بیان کیا ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش مکہ کا لشکر موجود تھا اور جس راہ سے ابو سفیان والا قافلہ نکل گیا تھا ۔ اس آیت سے ہشامی کی روایت جو ابھی ہم لکھ آئے ہیں بخوبی تصدیق ہوتی ہے کہ ابو سفیان کا قافلہ سمندر کے کنارہ ہو کر نکل گیا تھا ۔

مگر یہ الفاظ جو اس آیت میں ہیں کہ ”ولو تواعدتم لاختلفتم في الميعاد“ اس کی تفسیر میں مفسرین نے غلطی کی ہے ۔ اس غلطی کا سبب یہ ہے کہ ابتدا ہی سے ان کو یہ غلط خیال ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ قافلہ کے لوٹنے کا تھا اور ہم نے خود قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کر دیا ہے کہ یہ خیال محض غلط ہے پس اسی غلط خیال کے سبب سے وہ سمجھے جیسے کہ تفسیر کبیر میں بھی لکھا ہے کہ قریش مکہ سے تفاقہ اور نادانستہ لڑائی ہو گئی اور اگر ان سے لڑائی کا وعدہ کیا جاتا تو وعدہ خلافی کرتے اس لیے کہ مسلمان بہت تھوڑے تھے اور قریش بہت زیادہ ۔



مگر یہ رائے بالکل غلط ہے خود قرآن مجید سے ثابت ہے جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم خاص قریش مکہ کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے بلکہ خدا کا حکم تھا کہ قریش مکہ ہی سے لڑو۔ پس مذکورہ بالا تفسیر کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی اس آیت میں خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کا اور قریش مکہ کے لشکر کا مقام بیان کیا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں جیسا کہ تمام مفسرین اور مورخین قبول کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر پانی سے دور اور خراب جگہ پر تھا اور قریش مکہ کا لشکر بہت اچھے مقام پر تھا اور پانی اُن کے قبضہ میں تھا۔ ایسے خراب مقام پر دفعۃً لڑائی ہو گئی۔ پس خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر پہلے سے اس مقام پر لڑنے کا وعدہ کیا جاتا تو تم وعدہ خلافی کرتے اور اس مقام کی خرابی دیکھ کر اُس مقام پر لڑنا منظور نہ کرتے لیکن اسی جگہ لڑائی ہو گئی اور جو خدا کو کرنا منظور تھا وہ خدا نے کر دیا۔

(اذ یریکہم اللہ) اس آیت میں مفسرین کو یہ مشکل پیش آئی ہے کہ اگر خدا تعالیٰ نے خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے لوگوں کو تھوڑا سا دکھلایا تو پیغمبر کا خواب خلاف واقع اور غلط ہوا حالانکہ پیغمبر کا خواب خلاف واقع اور غلط نہیں ہوتا، مگر یہ شبہ آیت کے معنی اور طرز بیان پر غور نہ کرنے کے سبب سے واقع ہوا ہے حالانکہ آیت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر کوئی شبہ ہو سکے۔

تمام سیاق قرآن مجید کا اس طرح پر واقع ہے کہ خدا تعالیٰ بندوں کے افعال کو بہ سبب علل العلل ہونے کے اپنی طرف نسبت کرتا ہے اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب دیکھنے کو اپنی طرف نسبت کیا ہے کہ خدا نے اُن

کو خواب میں دکھلایا تھوڑا۔ اس طرح پرکھنا قرآن مجید کے سیاق کے مطابق ان معنوں میں ہے کہ جب تو نے اُن کو خواب میں دیکھا تھوڑے سے اور اگر تو اُن کو دیکھتا بہت سے تو بے شک بزدلی کرتے اور کام میں جھگڑا کرتے۔

اس آیت کے بعد کی آیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی تصدیق ہوتی ہے جس میں بیان ہوا ہے کہ جب قریش مکہ سے مقابلہ ہوا تو مسلمانوں کی آنکھوں میں وہ تھوڑے سے معلوم ہوئے ”قلیلًا“ کا لفظ دونوں روایتوں میں واقع ہوا ہے اگر پہلی آیت میں ”قلیلًا“ کے لفظ سے شوکت اور عظمت اور جرأت میں قلیل لیے جاویں تو دوسری آیت میں بھی جب کہ مقابلہ ہوا ”قلیلًا“ کے یہی معنی لیے جاویں گے اور اگر پہلی آیت میں ”قلیلًا“ کے لفظ سے قلیل فی العدد مراد لی جاوے تو دوسری آیت میں بھی قلیل فی العدد مراد لی جاوے گی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقابلہ کے وقت کل لشکر قریش کے مقابلہ میں نہیں آیا تھا بلکہ اُن میں سے تھوڑے سے آدمیوں سے مقابلہ ہوا تھا جس کا سبب خود اس دوسری آیت میں بیان ہوا ہے کیوں کہ قریش مکہ نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھوڑے سے آدمی ہیں اس لیے انہوں نے بھی تھوڑے سے آدمیوں سے مقابلہ کیا اور جو امر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا تھا وہ سچا ہوا۔

اذ زین لہم الشیطان اعمالہم سے کیا مراد ہے :  
 اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ - ”و اذ زین لہم الشیطن اعمالہم و قال لا غالب لکم الیوم من الناس و انی جار لکم فلما تراءت الفئتن نکص علی عقبیہ و قال انی بری منکم انی اراما لاترون انی اخاف اللہ واللہ شدید العقاب۔“

یعنی اور جب اچھا کر دکھایا آن کے لیے شیطان نے ان کے عملوں کو اور کُما نہیں ہے کوئی غالب تم پر لوگوں میں سے آج کے دن اور بے شک میں تمہارا حمایتی ہوں پھر جب آمنے سامنے ہوئے دونوں گروہ تو الٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور کُما کہ بے شک میں الگ ہوں تم سے۔ بے شک میں دیکھتا ہوں وہ جو تم نہیں دیکھتے۔ بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت عذاب کرنے والا ہے۔

ہمارے مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں عجیب و غریب باتیں لکھی ہیں<sup>۱</sup> وہ کہتے ہیں کہ جنگ بدر میں شیطان سراقہ بن مالک بن جعشم کی صورت بن کر جو بکر بن کنانہ کے سرداروں میں سے تھا مع اپنے ساتھ کے لوگوں کے قریش مکہ کے پاس آیا اور کہا کہ ہم تمہارے مددگار ہیں اور کہا کہ اب کوئی تم پر غالب نہیں ہونے کا اور آس وقت حرث بن ہشام کے ہاتھ میں ہاتھ دئے ہوئے کھڑا تھا مگر جب آس نے مسلمانوں کے لشکر میں حضرت جبریل کو اور فرشتوں کو دیکھا تو ہاتھ چھڑا کر بھاگا اور کہا کہ جو میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے۔ شیطان کا سراقہ بن مالک کی صورت بن کر آنے کی یہ دلیل لکھی ہے کہ جب کفار قریش مکہ کو پھر کر گئے تو لوگوں نے کہا کہ سراقہ کے آدمی بھاگ گئے۔ جب یہ خبر سراقہ کو پہنچی تو آس نے کہا کہ خدا کی قسم مجھ کو تمہارا جانا معلوم بھی نہیں ہوا ابھی تمہاری شکست کی خبر مجھ کو پہنچی ہے۔ آس وقت لوگوں نے کہا کہ وہ شخص جو سراقہ کی صورت میں آدمی لیے ہوئے ملا تھا سراقہ نہ تھا بلکہ شیطان تھا۔

---

۱۔ و ذالک لان کفار قریش لما رجعوا الی مکہ قالوا ہزم اناس السراقۃ فیبلع ذالک سراقۃ فقال واللہ ما شعرت بمسیر حتی بلغنی ہزیمتکم فعند ذالک تبیین للقوم ان ذالک الشخص ما کان سراقۃ بل کان شیطانا۔ (تفسیر کبیر جلد ۳ صفحہ ۳۸۸)۔

نہایت افسوس ہے کہ ہمارے مفسروں نے کیسی لغو اور بیہودہ اور بے سمجھ اور بے ٹھکانہ باتوں کو قرآن کی تفسیر میں داخل کیا ہے اور ان کو تفسیر کی بنیاد قرار دیا ہے خدا ان پر رحم کرے۔ مگر حسن اور اصم دو مفسروں کا قول ہے کہ شیطان کسی آدمی کی صورت نہیں بنا تھا بلکہ ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تھا۔ پہلا قول تو محض لغو ہے اور حسن اور اصم کا قول ایسا ہے جو تسلیم ہونے قابل ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ قریش مکہ کی حالت کو ان کی زبان حال سے بیان فرماتا ہے۔ پہلی آیت میں غرور اور تکبر سے وہ لڑائی کے لیے نکلے تھے اس کا اشارہ کیا اور دوسری آیت میں فرمایا کہ ”زین لہم الشیطان اعمالہم“ یعنی ان کے نفس شریر نے ان کے اعمال کو اچھا کر دکھایا اور ان کے شریر نفس نے کہا کہ میں تمہارا ہمایتی ہوں مگر جب دونوں لشکر مقابل ہوئے تو ان کی جرأت اور ہمت جو کچھ تھی وہ پست ہو گئی اور آثار فتح و نصرت لشکر اسلام کے ظاہر ہوئے اور ان کا نفس شریر پسپا ہوا جس کو خدا تعالیٰ نے نہایت فصیح طور پر بیان فرمایا۔ ”فلما ترآت الفئتن نکص علی عقبیہ و قال انی بریٰ منکم انی اری ما لاترون“ اور جب انسان کی نخوت اور غرور کے برخلاف امر واقع ہوتا ہے تو اس کے نفس امارہ کو قدرتی طور پر خوف لاحق ہوتا ہے خصوصاً مواقع جنگ میں جہاں ہر طرح پر فتح کی امید ہو اور شکست ہو جاوے پس خدا تعالیٰ نے مشرکین کے نفس شریر کی اس حالت کو ان لفظوں سے بیان کیا کہ ”انی اخاف اللہ و اللہ شدید العقاب“۔

اور کیا بلحاظ سامان لڑائی کے اور کیا بلحاظ آسائش و خوراک و قوت جسمانی کے نہایت ضعیف تھے۔ اس لیے خدا نے فرمایا کہ اس

قدر تفاوت میں تخفیف کی جاوے تب بھی اگر تم ثابت قدم رہو گے تو دو گنیوں پر غالب آؤ گے پس ان آیتوں میں سے کسی آیت میں تعین عدد خاص مراد نہیں بلکہ صرف تحریض علی القتال و ثبات فی القتال مراد ہے ۔

قیدیان بدر کا مسئلہ : بدر کے قیدیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”ما کان لنبی ان یکون له ، اسری حتی یسخر فی الارض تریدون عرض الدنیا و اللہ یرید الآخرة واللہ عزیزٌ حکیم“ ۔

یعنی ۔ نہیں ہے نبی کے لیے کہ ہوں اس کے لیے قیدی یہاں تک کہ گھمسان کر دے زمین میں یعنی ملک میں ۔ تم چاہتے ہو مال دنیا کا اور اللہ چاہتا ہے آخرت کو اور اللہ غالب ہے حکمت والا ۔

واقعہ یہ ہے کہ بدر کی لڑائی میں قریش مکہ کے تمام لشکر سے جو ان کے ساتھ آیا تھا لڑائی نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک گروہ سے جو لڑنے کو نکلا تھا لڑائی ہوئی تھی جیسا کہ اسی صورت کے مندرجہ حاشیہ آیت سے ثابت ہوتا ہے ' ۔ اس گروہ کو جو مقابلہ میں آیا تھا شکست ہوئی تھی اور تمام لشکر قریش مکہ کا ایسا پریشان ہو گیا تھا کہ کسی کو پھر مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی اور مسلمانوں نے ان کا تعاقب بھی نہیں کیا ۔ جیسے کہ خدا نے اسی صورت میں فرمایا ”ان تستفتحو فقد جاءکم الفتح و ان تستنہوا فہو خیر لکم“ مگر قریش مکہ کے لشکر میں ستر آدمی بطور قیدی کے گرفتار ہو گئے تھے ۔ ان قیدیوں کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جاوے حضرت عمر اور سعد بن معاذ نے رائے دی کہ سب کو قتل

۱۔ واذ یریکموہم اذا التفتیتم فی اعینکم قلیلا و یقللکم فی اعینہم لیقضی اللہ امرا کان مفعولا و الی اللہ ترجع الامور ۔ ۴۶ ۔

کرنا چاہے۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جاوے چنانچہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا۔ فدیہ لینے پر خدا نے اپنی ناراضی ظاہر کی کیوں کہ وہ لوگ بغیر لڑنے کے پکڑے گئے تھے اور اس لیے لڑائی کے قیدی جن سے فدیہ لیا جا سکتا نہیں تھے۔ اسی پر خدا کی ناراضی ہوئی اور خدا نے فرمایا ”ما کان لنسبی ان یکن لہ اسری حتیٰ یشخن فی الارض“ جن لوگوں کی یہ رائے ہے کہ ان کے قتل نہ کرنے پر خدا کی ناراضی ہوئی تھی کسی طرح پر صحیح نہیں ہو سکتی اس لیے خدا تعالیٰ نے جب ان کا قیدی جنگ ہونا ہی نہیں قرار دیا تو ان کے نہ قتل کرنے پر کیوں کر ناراضی ہو سکتی تھی۔

---

## غزوۂ بدر اور نزول ملائکہ

تمام مسلمان اس پر یقین رکھتے ہیں اور تمام احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں یہ لکھا ہوا ہے اور تمام مفسرین کا دعویٰ ہے کہ سورہ آل عمران میں لکھا ہوا ہے کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کی مدد کے لیے فرشتے آسمان سے نازل ہوئے تھے۔ مگر میں اس بات کا بالکل منکر ہوں مجھے یقین ہے کہ کوئی فرشتہ لڑنے کو سپاہی بن کر یا گھوڑے پر چڑھ کر نہیں آیا۔ مجھ کو یہ بھی یقین ہے کہ قرآن مجید سے بھی ان جنگ جو فرشتوں کا آترنا ثابت نہیں ہے۔ مگر تمام مسلمانوں کا اعتقاد اس کے برخلاف ہے وہ یقین کرتے ہیں کہ درحقیقت فرشتوں کا رسالہ لڑنے کو آترا تھا وہ نادانی سے یہ بھی کہتے ہیں کہ فرشتوں کا لڑائی کے لیے آترنا منصوص ہے اور اس سے انکار کرنا قرآن کا انکار کرنا ہے مگر ان کا یہ خیال محض غلط ہے۔

مجھ کو فکر تھی کہ اور کسی مسلمان نے بھی اس سے انکار کیا ہے یا نہیں۔ تو مجھ کو ایک مسلمان ملا جس نے اس سے انکار کیا ہے۔ تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ابوبکر آصم اس سے سخت منکر تھے انہوں نے اپنے انکار کی چار دلیلیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ ایک فرشتہ بھی تمام دنیا کے غارت کر دینے کو کافی تھا پھر فرشتوں کی فوج بھیجنے سے کیا فائدہ تھا۔ دوسرے یہ کہ جو کفار کہ لڑے ان کو سب لوگ جانتے تھے اور جو صحابہ ان کے مقابل ہوئے ان کو بھی لوگ جانتے تھے پھر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کفار کو فرشتوں نے مارا تھا۔ تیسرے یہ کہ اگر فرشتے لڑے تھے تو

وہ لوگوں کو دکھائی دیتے تھے یا نہیں اور اگر دکھائی دیتے تھے تو آدمیوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے یا اور کسی صورت میں۔ اگر آدمیوں کی صورت میں دکھائی دیتے تھے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر میں شمار ہوتے تھے اور اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر تین ہزار یا اس سے زیادہ ہو گیا ہوگا اور اتنا لشکر کسی نے بیان نہیں کیا اور قرآن کے بھی برخلاف ہے۔ کیونکہ دشمنوں کی آنکھوں میں تھوڑا لشکر دکھائی دیتا تھا اور اگر اور کسی صورت پر دکھائی دیتے تو تمام لوگوں کے دل پر دہشت پڑ جاتی اور اگر وہ لوگوں کو دکھائی نہ دیتے تو کفار کو لوگ بغیر قتل کرنے والے کے قتل ہوتا ہوا دیکھتے اور یہ واقعہ اعظم معجزات میں سے ہوتا۔ مگر اس طرح پر کفاروں کا مارا جانا وقوع میں نہیں آیا۔ چوتھے یہ کہ جو فرشتے آئے تھے ان کے اجسام کثیف تھے یا لطیف۔ اگر کثیف تھے تو ان کو سب لوگ دیکھتے۔ حالاں کہ ان کو کسی نے نہیں دیکھا اور اگر ان کے اجسام ہوا کی طرح لطیف تھے تو گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں آسکتے تھے۔

امام فخر الدین رازی نے ان شبہوں میں سے کسی کا جواب نہیں دیا اور ملانوں کی طرح یہ بات کہی کہ ایسے شبہے کرنا اس شخص کے لائق ہیں جو قرآن اور نبوت کا منکر ہو۔ مگر جو شخص کہ قرآن اور نبوت کو مانتا ہے اس کو ایسے شبہے کرنے لائق نہیں۔ پس ابوبکر آصم کو لائق نہ تھا کہ ان باتوں کا انکار کرتا باوجود اس کے کہ نص قرآن سے ان کا ہونا پایا جاتا ہے اور ایسی حدیثوں میں جو تواتر کے قریب ہیں ان کا بیان ہے۔

امام صاحب نے اخیر بات تو یقینی غلط کہی ہے کیونکہ تواتر تو درکنار کسی صحیح اور قوی حدیث سے بھی ان باتوں کا ثبوت نہیں ہے۔ تمام ضعیف اور موضوع حدیثیں ہیں جن میں ایسی



باتیں مذکور ہیں علمائے محققین ایسی حدیثوں پر اعتقاد نہیں کرتے اور اصول حدیث سے بھی ان کی تقویت نہیں ہوتی۔ پہلی بات بھی امام صاحب کی صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ قرآن مجید سے فی الواقع سپاہی بن کر فرشتوں کا آئینا پایا نہیں جاتا۔ بلکہ صرف وہ ایک بشارت تھی مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرنے اور لڑائی میں ثابت قدم رہنے کی۔ جیسے کہ خود خدا نے اس جگہ اور سورۃ انفال میں فرمایا ہے ”وما جعلہ اللہ الا بشریٰ لکم ولتطمئن قلوبکم بہ“ مگر اس سورہ میں جنگ بدر کے واقعہ کا جس سے یہ آیت متعلق ہے بہت ہی تھوڑا بیان ہے اور سورۃ انفال میں وہ واقعہ بالاستیعاب بیان ہوا ہے اور اس میں ہزار فرشتوں کی مدد کا ذکر ہے۔

ہمارے نزدیک نہ ان لڑائیوں میں ایسے فرشتے جن کو لوگ ایک مخلوق جداگانہ متحیز بالذات مانتے ہیں، آئے تھے اور نہ خدا نے ایسے فرشتے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا اور نہ قرآن مجید سے ایسے فرشتوں کا آنا یا خدا تعالیٰ کا ایسے فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کرنا پایا جاتا ہے۔ اگر ہم حقیقت ملائکہ کی بحث کو الگ رکھیں اور فرشتوں کو ویسا ہی فرض کر لیں جیسا کہ لوگ مانتے ہیں تو بھی قرآن مجید سے ان کا فی الواقع آنا یا لڑائی میں شریک ہونا ثابت نہیں ہے۔ سورۃ آل عمران کی پہلی آیت میں تو صرف استفہام ہے کہ اگر خدا تین ہزار فرشتوں سے مدد کرے تو کیا تم کو کافی نہ ہوگا؟ اور دوسری آیت میں ہے کہ اگر تم لڑائی میں صبر کرو گے تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ مگر ان دونوں آیتوں سے اس کا وقوع یعنی فرشتوں کا آنا کس طرح ظاہر نہیں ہوتا۔ سورۃ نفال کی آیت میں خدا نے کہا کہ ”میں تمہاری ہزار فرشتوں سے مدد کروں گا۔ مگر اس سے بھی فرشتوں کا

فی الواقع آنا نہیں پایا جاتا۔ اس پر یہ خیال کرنا کہ اگر مدد موعودہ وقوع میں نہ آئی ہو تو خدا کی نسبت خلف وعدہ کا الزام آتا ہے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مدد کی حاجت باقی نہ رہنے سے مدد کا وقوع میں نہ آنا خلف وعدہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کو خدا کی عنایت سے فتح ہو گئی تھی۔ اور فرشتوں کو تکلیف دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ باقی یہ کہنا کہ وہ فتح فرشتوں کے آنے کے سبب سے ہوئی تھی اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس کے لیے اول قرآن مجید سے فرشتوں کا آنا ثابت کرنا چاہئیے۔ اس کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ فرشتوں کے آنے سے فتح ہوئی تھی

۱۔ بقول مولانا حالی یہ سر سید کی ”نہایت رکیک تاویلیں“ ہیں۔ کیونکہ جب خدا تعالیٰ نے صاف طور پر وعدہ فرمایا کہ ”ہم ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریں گے تو یقیناً یقیناً خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا (ان الله لا یخلف المیعاد) فرشتے آئے اور انہوں نے مسلمانوں کی مدد کی اور اسی امداد کے باعث ان کو فتح حاصل ہوئی۔ ورنہ فتح کی کوئی بھی صورت نہ تھی۔ علاوہ ازیں سر سید کے پاس کیا ثبوت اس بات کا ہے کہ فرشتے نہیں آتے تھے اور مسلمانوں کو خود ہی اپنے زور بازو سے فتح حاصل ہو گئی تھی؟ خدا کا وعدہ فرمانا اور اس کے بعد مسلمانوں کی فتح اس بات کی بین دلیل ہے کہ یہ فتح فرشتوں کے آنے ہی کی وجہ سے ہوئی تھی نہ کہ مسلمانوں کی اپنی قوت سے۔ کیونکہ قوت تو کوئی تھی ہی نہیں۔ کہاں ایک ہزار مضبوط اور تنومند مسلح سوار اور کہاں تین سو فاقہ زدہ نحیف و کمزور اور قریباً نہتے پیدل مسلمان، زمین آسمان کا فرق تھا۔ اگر خدا خاص طور پر آسمان سے مدد نہ کرتا تو مسلمانوں کا ایک آدمی بھی کافروں سے بچ کر نہ جا سکتا تھا۔ باقی سر سید کا یہ کہنا کہ ”اول قرآن مجید سے فرشتوں کا آنا ثابت کرنا چاہئیے اس کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ فرشتوں کے آنے سے فتح ہوئی تھی“ تو عرض ہے کہ جہاں خدا نے صاف طور پر فرمایا کہ ہم نے جنگ بدر میں فرشتے نازل کر کے تمہاری مدد کی (ولقد نصرکم اللہ ببدر) تو وہیں کونسا سرسید نے مان لیا جو یہاں مان لیتے۔ (محمد اسماعیل پانی پتی)

روایتوں کو فرشتوں کے آنے پر سند لانا کافی نہیں ہے اول تو وہ روایتیں ہی معتبر اور قابل استناد نہیں۔ دوسرے خود ان کے مضمون ایسے بے سروپا اور خیالی ہیں جن سے کسی امر کا ثبوت حاصل نہیں ہو سکتا خصوصاً اس وجہ سے کہ خود راوی فرشتوں کو دیکھتے نہیں تھے۔ بر خلاف اس کے قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ایک فرشتہ بھی نہیں آیا تھا۔ دونوں سورتوں میں اس آیت کے بعد جس میں فرشتوں کے بھیجنے کو کہا ہے۔ وما جعلہ اللہ الا بشریٰ لکم و لتطمئنن قلوبکم بہ وما النصر الا من عند اللہ العزیز الحکیم یعنی۔ ”اور نہیں کیا اس کو اللہ نے مگر خوش خبری تمہارے لیے تا کہ مطمئن ہو جاؤ اس سے تمہارے دل اور فتح نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا۔“

یہ بات غور کے لائق ہے کہ ”ما جعلہ“ میں جو ضمیر ہے وہ کس کی طرف راجع ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ ”ضمیر راجع ہے طرف مصدر کے جو کہ گو صریحاً مذکور نہیں ہے مگر لفظ ”یمدکم“ میں ضمناً داخل ہے یعنی ما جعلہ اللہ الممدد و الا ممداد الا بشریٰ اور زجاج کا قول ہے کہ ما جعلہ اللہ ای ذکر الممدد الا بشریٰ۔ مگر امام رازی صاحب نے جو فرمایا وہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ خدا نے کہا تھا کہ میں تمہاری فرشتوں سے مدد کروں گا۔ پھر فرمایا کہ وہ یعنی یہ کہنا کہ میں تمہاری فرشتوں سے مدد کروں گا صرف خوش خبری تھی۔“

---

۱۔ سر سید کا مطلب یہ ہوا کہ فرشتوں سے مدد کرنے کا وعدہ خدا کا محض فرضی تھا اور بالکل دل بہلاوے کے لیے تھا تا کہ مسلمان الہی وعدہ پا کر خوش ہو جائیں اور ان کے دل بڑھ جائیں۔ نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے متعلق جو اصدق الصادقین ہے اس قسم کی بات کہنی کہ وہ لوگوں کا دل بہلانے کے لیے ان سے جھوٹے وعدے کیا کرتا ہے، پرلے سرے کی جسارت انگیز بات ہے۔ بریں عقل و دانش بیاید گریست (محمد اسماعیل پانی پت)

پس علانیہ سیاق عبارت سے ظاہر ہے کہ ”ما جملہ“ کی ضمیر قول امداد یا ذکر امداد کی طرف راجع ہے جیسا کہ زجاج کا قول ہے۔ نہ بطرف مصدر کے جو مذکورہ بھی نہیں ہے البتہ اس صریح مرجع ضمیر کو چھوڑ کر مصدر کی طرف اس صورت میں ضمیر راجع ہو سکتی ہے کہ اول وقوع اس مدد کا یعنی فرشتوں کا آنا ثابت ہو جاوے اور وہ ابھی تک ثابت نہیں ہوا اور اس لیے مصدر کی طرف ضمیر کا راجع کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

”ما جعلہ“ پر ما نافیہ ہے جو عام طور پر نفی کرتا ہے اور اس لیے سورہ آل عمران کی آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ ”نہیں کیا خدا نے پیغمبر کے اس قول کو کہ کیا تمہارے لیے کافی نہیں ہے کہ تمہارا پروردگار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے۔ کوئی چیز۔ مگر بشارت۔ یعنی صرف بشارت تا کہ تمہارے دل مطمئن ہو جاویں“ اور سورہ انفال کی آیت کے صاف معنی یہ ہیں کہ ”جب تم نے خدا سے فریاد کی اور اس نے تمہاری فریاد کو قبول کیا کہ میں فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا تو نہیں کیا خدا نے اس قبول کرنے کو جس کے ساتھ فرشتوں سے مدد دینے کو کہا تھا کوئی چیز مگر بشارت تا کہ تمہارے دل مطمئن ہو جائیں“ اور طرز کلام قطعاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی ایسا فرشتہ جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں لڑائی کے میدان میں نہیں آیا تھا۔

یہ تمام تقریر اس صورت میں تھی جبکہ ملائکہ کو ایک ایسا وجود خارجی متحییٰ بالذات تسلیم کیا جاوے جیسے کہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے اور جو مشکلیں ان آیتوں کے حل کرنے میں پیش آتی ہیں اور موضوع روایتوں اور جھوٹے اور بے معنی قصوں سے استدلال کرنے کی احتیاج پڑتی ہے۔ وہ اسی صورت میں پڑتی ہے۔

لیکن اگر ٹھیک طور پر قرآن مجید کو سمجھا جاوے اور جو اس کا طرز کلام ہے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے تو کوئی مشکل پیش نہیں آتی اور خدا اور اس کے کلام کی عظمت و شان اور خدا کی قدرت کاملہ کا سچا اثر انسان کے دل پر پڑتا ہے ۔

فتح کے اتفاقی اسباب سے جو بعض اوقات آفات ارضی و سماوی کے دفعاً ظہور میں آنے سے ہوتے ہیں ۔ قطع نظر کر کے دیکھا جاوے کہ ان لوگوں پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہے جو فتح پاتے ہیں ۔ ان کے قوائے اندرونی جوش میں آتے ہیں جرأت ، ہمت ، صبر ، شجاعت ، استقلال ، بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور یہی قوی خدا کے فرشتے ہیں جن سے خدا فتح مندوں کو فتح دیتا ہے اور اس کے برخلاف حالت یعنی بزدلی اور رعب ان لوگوں پر طاری ہوتا ہے جن کی شکست ہوتی ہے ۔

پس ان آیتوں میں خدا تعالیٰ نے وعدہ کیا کہ ”میں فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا ۔ مگر وہ بجز خوش خبری فتح کے اور کچھ نہیں ہے جس کے سبب تم میں ایسے قویٰ برانگیختہ ہوں گے جو فتح کا باعث ہوں گے تمہارے دل قوی ہو جائیں گے ۔ لڑاؤ میں تم ثابت قدم رہو گے ۔ جرأت ، ہمت ، شجاعت کا جوش تم میں پیدا ہوگا اور دشمنوں پر فتح پاؤ گے ۔“

یہ معنی ان آیتوں کے ہم نے پیدا نہیں کیے ہیں بلکہ خود خدا نے یہی تفسیر اپنے کلام کی کی ہے ۔ جہاں اسی سورہ میں اور اسی واقعہ کی نسبت فرمایا ہے کہ ”اذ یوحی ربک الی الملائکۃ انی معکم فثبتوا الذین آمنوا سالتی فی قلوب الذین کفروا الرعب“۔ یعنی جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی بھیجتا تھا (یہ وہی فرشتے ہیں جن کے بھیجنے کا مدد کے لیے وعدہ کیا تھا) کہ میں تمہارے (یعنی مسلمانوں کے) ساتھ ہوں (تو ان فرشتوں سے

یہ کام لینے چاہے تھے) کہ ثابت قدم رکھو ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں۔ میں بہت جلد ان لوگوں کے دلوں میں جو کافر ہیں رعب ڈالوں گا۔“

لڑائی میں ثابت قدم رکھنے والی کون چیز تھی؟ وہی ان کی جرأت و ہمت تھی۔ کوئی اور اشخاص ان کے پاس کھڑے ہوئے ان کو شاباش شاباش نہیں کہہ رہے تھے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ فرشتوں سے مراد وہی قوائے انسانی تھی جن کے پاس وحی بھیجی تھی اور جو لڑنے والوں میں موجود تھی اور فرشتوں سے ان کی مدد کرنے سے ان کو لڑائی میں ثابت قدم رکھنا اور شجاعت، جرأت، ہمت، استقلال کو قائم رکھنا مراد تھا، نہ خیالی فرشتوں کو سپاہی بنا کر اور ڈھال تلوار، تیر کمان دے کر اور سفید سفید گھوڑوں پر سوار کر کے بھیجنا۔

قرآن مجید کا سیاق کلام ہی یہ ہے کہ اس میں ایسے مواقع ہیں جو خوف و خطر کے ہوتے ہیں۔ انسانوں کے دلوں میں طمانیت اور قوت بخشنے کو فرشتوں سے مدد کرنے اور اپنے غیبی لشکروں سے امداد کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس سے مقصود صرف دل میں طمانیت و سکینہ کا پیدا کرنا ہوتا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت فرمائی اور پہاڑ کے ایک غار میں جا کر چھپے۔ جہاں نہ لشکر تھا نہ لڑائی تو خدا نے فرمایا۔ ”اَلَا تَنْصَرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثٰنِيْ اٰثْنَيْنِ اِذْ هَمَّ فِى الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدُوْهُ بِمَنْ تَوَكَّلٰهُ وَاَجْعَلْ لِّمَنِ كَفَرُوْا السُّفْلٰى وَاَجْعَلْ لِّمَنِ كَفَرُوْا السُّفْلٰى وَاَجْعَلْ لِّمَنِ كَفَرُوْا السُّفْلٰى“ (سورہ توبہ، آیت ۴۰، پارہ ۱۰)۔

وہاں غار میں کون سی فوج تھی اور کون سی لڑائی تھی۔

جو خدا نے اپنا غیبی لشکر بھیجا تھا ، بلکہ لشکر سے صرف سکینہ مراد تھی ۔ اس آیت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور یہ کہنا کہ پہلا جملہ تو واقعہ غار سے متعلق ہے اور دوسرا ٹکڑا جہاں لشکر کے آنے کا ذکر ہے جنگ احد یا جنگ بدر یا جنگ احزاب سے متعلق ہے ۔ جیسا کہ بعض مفسروں نے کہا ہے ۔ یہ ایک ایسا لغو کلام ہے جو التفات کے قابل نہیں ہے اور خدا کے کلام کے ساتھ ایک قسم کی بے ادبی ہے کہ اپنی مرضی کے موافق جہاں سے چاہا توڑا اور جہاں چاہا جا جوڑا ۔

اسی طرح خدا نے سورہ توبہ میں فرمایا ”ثم انزل الله سکینتہ علی رسولہ و علی المؤمنین و انزل جنوداً لم تروہا و عذب الذین کفروا و ذالک جزاؤ الکافرین ۔“

سکینہ کی تفصیل ”جنوداً لم تروہا“ واقع ہوئی ہے اور ان دونوں سے مراد صرف سکینہ ہے نہ کچھ اور ۔

اسی مضمون کی آیت سورہ احزاب میں ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے ”یا ایہا الذین آمنوا اذکروا نعمت اللہ علیکم اذ جاء تکم جنوداً فارسلنا علیہم ریحاً و جنوداً لم تروہا و کان اللہ بما تعملون بصیراً ۔“

اس سے بھی عمدہ طریقہ پر اس مضمون کو سورہ فتح میں بیان کیا ہے ۔ جہاں فرمایا ہے ”هو الذی انزل السکینۃ فی قلوب المؤمنین لیزدادوا ایماناً مع ایمانہم واللہ جنود السموات و الارض و کان اللہ عزیزاً حکیماً ۔“

اسی انزال سکینہ کو خدا نے اپنے لشکروں سے تعبیر کیا ہے ۔ پس بدر کی لڑائی میں بھی نہ جنگجو مجسم متحیز بالذات فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا ۔ نہ ایسے فرشتے بھیجے تھے ۔ بلکہ مسلمانوں کے دلوں کو اور ان کے قوائے جنگ کو صرف

خوش خبری فتح سے تقویت دینے کا وعدہ تھا جس کو خدا نے پورا کیا اور قلیل جہت کو کثیر جہت پر فتح دی ۔

اہل عرب زمانہ جاہلیت میں بہت سے قوائے غیر مرئیہ کو مرئی انسان اور دنیا میں کارکن سمجھتے تھے ۔ ملائکہ کو بھی وہ ایک قوت غیر مرئیہ جانتے تھے اور گو وہ اس بات کے قائل تھے کہ ان میں مجسم و مرئی ہونے کی بھی طاقت ہے ۔ مگر یہ نہیں تھا کہ ملائکہ کا مفہوم بغیر اس کے کہ وہ ان کو مجسم و مرئی سمجھیں ۔ ان کے ذہن میں نہیں آتا تھا ۔ ان ہی آیتوں میں جہاں خدا تعالیٰ نے لفظ ”جنوداً لم تروہا“ کا استعمال کیا ہے اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ اُس زمانہ کے عرب قوائے غیر مرئیہ کو کارکن سمجھتے تھے پس یہ کہنا کہ جو معنی آیت کے ہم نے بیان کیے ہیں (اگرچہ ایسا کہنا ہم پر تہمت ہے کیوں کہ ہم نے نہیں بیان کیے ۔ بلکہ خود خدا نے بیان کیے ہیں) وہ معنی نہ اُس زمانہ جاہلیت کے عرب سمجھتے تھے نہ صحابہ کرام ۔ محض غلط ہے اس زمانہ کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ بغیر کسی فرضی شکل و صورت کے ان کے ذہن میں فرشتوں کا خیال ہی نہیں آ سکتا ۔ مگر عرب جاہلیت کا ایسا خیال نہ تھا ۔ بے شک فرشتوں میں وہ مجسم ہونے اور مختلف صورتوں میں ظاہر ہونے کی طاقت سمجھتے تھے ۔ مگر بلا خیال شکل و صورت و تحیز کے بھی ان کے ذہن میں فرشتوں کا خیال تھا جس کو ہم نے بلفظ قویٰ تعبیر کیا ہے ۔ گو اس زمانہ کے مسلمان آیت کے معنی سمجھنے کے قابل نہ ہوں مگر اُس زمانہ کے عرب بلا شبہ اس قابل تھے ۔

اب باقی رہی بحث نسبت عدد ملائکہ کے تو یہ بات ظاہر ہے کہ ایسے مقامات میں عدد کے ذکر کرنے سے خاص عدد معین مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس امر کا مکمل ہونا جس کی نسبت عدد کا بیان ہوا



ہے مقصود ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے عددوں کا بیان مختلف واقعہ پر ہوا ہے جس کے سبب کچھ اختلاف آیتوں میں نہیں ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے اور قریش مکہ کے مقابلہ میں نکلنے کا ارادہ تھا تو ایک گروہ مسلمان کا بسبب کثرت مخالفین کے خائف تھا اور وہ ان کے مقابلہ میں لڑنے کو جانا نا پسند کرتا تھا اس وقت مسلمانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ”الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلاثۃ آلاف من الملائکۃ منزلین بلی ان تصبروا و تستقوا و یاتوکم من فورہم هذا یمدکم ربکم بخمسة آلاف من الملائکۃ مسومین (سورۃ آل عمران آیات ۱۲۳ - ۱۲۴) یعنی ”کیا تم کو قریش مکہ کے مقابلہ کے لیے یہ بھی کافی نہ ہوگا کہ خدا تین ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے۔ بلکہ اگر تم لڑائی میں صبر کرو اور خدا سے ڈرو اور وہ ابھی تم پر آن پڑیں تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔“

پس رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا صرف ان لوگوں کی طہانیت اور جرأت بڑھانے کے لئے تھا اور اس سے کسی عدد خاص کا تعین مقصود نہ تھا۔

مگر جب مسلمان بمقابلہ قریش مکہ بدر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش مکہ کے لشکر میں ہزار آدمی لڑنے والے ہیں۔ جن کے مقابلہ کے لیے ہزار فرشتوں سے مدد دینے کی بشارت دینا کافی تھا اس لیے پروردگار نے فرمایا ”انی ممدکم بالف من الملائکۃ مردفین“ اور اسی کے ساتھ بتلا دیا کہ یہ کہنا یا وعدہ کرنا صرف فتح کی خوش خبری ہے تاکہ تمہارے دل مطمئن ہو جائیں

نہ یہ کہ ہزار فرشتے مپاہی بن کر تمہارے ساتھ لڑنے کو آئیں گے  
 نتیجہ اس سب کا یہ نکلا کہ ”میں تمہارے دلوں کو ہزار  
 آدمی کے لشکر کے برابر تقویت اور جرأت دے دوں گا ۔ جس کے  
 سبب تم ان کا مقابلہ کر سکو گے۔“

---